اشاعت اول: اقبال اکادمی پاکستان 2007

© بشریٰ احمد خرم

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن ماہِ تمام اے ساقی!

اقبال

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

قومیں مر جاتی ہیں۔ اُن کی اولاد یعنی خیالات کبھی نہیں مرتے۔

اقبال

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پہلی بات

پانچ کتابوں میں اقبال کی مکمل سوانح کے سلسلے کی یہ دوسری کتاب ہے۔ آخرِ شب سے مراد زندگی کا اختتامی دور نہیں ہے کیونکہ چاند کے حساب سے وقت ناپتے ہوئے شام اور رات شروع میں آتے ہیں۔ چنانچہ آخرِ شب سے اُس تشکیلی دور کا خاتمہ مراد لیا جا سکتا ہے جس کے بعد حقیقت کی جھلک ایک روشن صبح کی صورت میں میسر ہو۔ اقبال نے اپنی شاعری میں عام طور پر رات کا استعارہ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اقبال کی زندگی، اُن کے زمانے اور اُن کی تصانیف و افکار کے بارے میں دستیاب تمام معلومات اِن پانچ کتابوں میں تاریخی ترتیب سے اکٹھی کی جا رہی ہیں۔ اِس لحاظ سے میں نے کلاسیکی دور کے مسلمان مورخین کا اتباع کیا ہے مگر جدید سوانح نگاری میں یہ اسلوب اِس سے پہلے اختیار نہیں کیا گیا اگرچہ اس کے واضح نقوش مارٹن لنگز (شیخ ابوبکر سراج الدین) کی لکھی ہوئی سیرۃ النبی میں دکھائی دیتے ہیں جس سے میں سترہ اٹھارہ برس پہلے اُسی زمانے میں متعارف ہوا تھا جب میں نے اقبال کی سوانح لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جب میرے استاد جناب عباس محمد حسین نے مجھے بنیادی مشورے دیئے تھے۔

اِس سوانحی سلسلے کی ہر کڑی اپنی جگہ مکمل ہے۔ اقبال کی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے اِس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر دور اپنے واقعات کے اُتار چڑھاؤ میں ایک معنی خیز نقطۂ آغاز سے شروع ہو کر کسی نتیجہ خیز انجام تک پہنچے۔ یہ تمام تر حقائق پر مشتمل ہے جنہیں بیان کرنے میں رنگ آمیزی نہیں کی گئی یہاں تک کہ سوانحی ادب میں جس قسم کی لفاظی کی گنجائش پیدا ہو چلی تھی اُس سے بھی اجتناب کیا گیا ہے۔

جس طرح جیمز جوائس نے ناول کے مسلمہ لوازمات سے انحراف میں ایک نیا ناول دریافت کیا تھا اُسی طرح میں نے ایک نئی سوانح دریافت کرنے کی کوشش میں اُن

لوازمات سے اجتناب کیا ہے جنہیں سوانحی ادب میں تسلیم کیا گیا مگر جو کسی حقیقت کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنے سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم جس دَور میں زندہ ہیں اُس میں ادب کی مختلف اصناف ازسرِ نو اپنی شناخت کروا رہی ہیں اور جس قسم کی کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اُس کے بارے میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ محض سوانح ہے یا ناول بھی ہے۔

یہ سلسلہ اقبال کی سوانح کو پانچ اَدوار میں تقسیم کرکے ترتیب دیا گیا ہے:

ابتدائی دَور: 1904 تک

تشکیلی دَور: 1905 سے 1913 تک

وسطی دَور: 1914 سے 1922 تک

دَورِ عروج: 1923 سے 1930 تک

اختتامی دَور: 1931 سے آج تک

پہلی کتاب الحمرا پبلی کیشنز اسلام آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اب دوسری کتاب کے ساتھ وہ بھی اقبال اکیڈمی پاکستان سے دوبارہ شائع ہو رہی ہے۔ یہ محمد سہیل عمر صاحب کے خلوص کا نتیجہ ہے جن کی حوصلہ افزائی اور ذاتی دلچسپی کی وجہ سے مجھے اِس سوانحی سلسلے کا معیار پہلے سے بھی زیادہ بلند کرنے کا موقع مل سکا۔ محترم رفیع الدین ہاشمی، جناب احمد جاوید اور اپنے دیرینہ رفیق حارث خلیق کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اِس کتاب میں خاص دلچسپی لی۔

میری کوشش ہے کہ اقبال کی سوانح دنیا کی کسی بھی ادبی شخصیت کی سوانح سے زیادہ وقیع اور عظیم الشان ہو جائے۔ اِس خواہش میں تعلّی ہے جس کی وجہ اقبال کے ساتھ میری عقیدت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ میرے خیال میں اکیسویں صدی اقبال کی ہے۔ آج ساری دنیا کو اُن کی ضرورت ہے۔

خرم علی شفیق

فہرس

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو

باب ۱ نیا مندر

باب ۲ شمع کے سامنے

باب ۳ سمندر

باب ۴ تثلیث کا مدرسہ

باب ۵ پری جمالوں کا شہر

باب ۶ نامعلوم دنیا

باب ۷ صقلیہ

باب ۸ شیطان کی خدائی

باب ۹ جنت الفردوس

ضمیمہ: اقبال کی بیاضیں

حاشیے

کتابیں

باب ۱

نیا مندر

جنوری سے جولائی ۱۹۰۵ء تک

1

ماں! میں تیرے آگے جھکتا ہوں
رواں بہتی ندیوں والی
باغوں کی روشنی سے چمکتی ہوئی
مسرت کی ٹھنڈی ہواؤں والی
پراسرار کھیت لہلہاتے ہیں، اے ماں شکتی والی
اے ماں آزاد!

یہ بندے ماترم کے پہلے بند کا مطلب تھا۔ حال ہی میں کانگریس نے بندے ماترم کو اپنا ترانہ قرار دیا تھا اور اب انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں یہ وطن پرستوں کا گیت بنتا جا رہا تھا۔

2

''آوازِ نبوت کا اصل زور اور اُس کی حقیقی وقعت، عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار اُس روحانی مشاہدے پر ہے جو نبی کے غیر معمولی قوائ کو حاصل ہوتا ہے اور جس کی بنا پر اُس کی آواز میں وہ ربانی سطوت و جبروت پیدا ہو جاتا ہے جس کے سامنے انسانی شوکت ہیچِ محض ہے،'' اقبال مخزن کے لیے اپنے مضمون 'قومی زندگی' کی دوسری اور آخری قسط میں لکھ رہے تھے۔

پچھلے برس اقتصادیات پر کتاب لکھتے ہوئے اقبال نے جس خواہش کا اظہار کیا تھا یعنی غلامی کی طرح مفلسی بھی ختم ہو سکتی ہے، یہ مضمون اُسی سلسلے کی کڑی تھا۔ انسان سمجھ لے کہ خوشحالی کن قوانین کی پابند ہے تو اپنی قسمت بدل سکتا ہے۔

اُس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ زندگی ارتقأ کے عمل سے گزر کر انسان تک پہنچی تھی مگر انسان سے بھی اگلا مرحلہ قوم تھی۔ جس طرح کسی جسم میں رہنے والے جراثیم کی زندگی اور موت اُس جسم سے وابستہ ہوتی ہے بالکل اُسی طرح افراد کی زندگی اور موت قوم سے وابستہ تھی۔

مگر قوم کی تعریف کیا تھی؟ کیا ایک برادری کے لوگ ایک قوم تھے، جس طرح پنجابی یا کشمیری؟ یا ایک وطن میں رہنے والے ایک قوم تھے، جس طرح ہندوستانی؟ اقبال کے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ایک قوم تھے۔ مضمون کی پچھلی قسط کی طرح اس میں بھی 'قومی زندگی' سے ہندوستان کے تمام شہریوں کی نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کی زندگی مراد تھی۔

ہندوستان ایک ملک تھا اور اس میں کئی قومیں آباد تھیں!۔

میرا وطن

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
گوتم کا جو وطن ہے، جاپان کا حرم ہے
عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے
ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے، ارم ہے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

فارس کے آسمان سے ٹوٹے ہوئے تاروں سے مراد فارسی کے وہ شاعر تھے جنہوں نے ہندوستان میں شہرت پائی مثلاً عرفی شیرازی وغیرہ۔ وحدت کی لے سے مراد شری کرشن کی بانسری تھی۔

3

جنوری کے مخزن میں 'سپاسِ جنابِ امیرؑ' کے نام سے حضرت علیؓ کی تعریف میں اقبال کی وہ فارسی منقبت شائع ہوئی جسے وہ اُن دنوں صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے۔

4

''میں ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا،'' اقبال کے ایک طالب علم

خواجہ فیروزالدین کا بیان ہے۔ ''میں منطق کے متعلق [اقبال سے] کلاس میں سوالات کرتا تھا۔ اِن سوالات کے باعث وہ مجھے ایک حد تک خوشگوار طریق سے متاثر کرتے تھے۔''[۲]

خواجہ فیروزالدین کے والد اقبال کے پرانے شناسا خواجہ رحیم بخش تھے۔ رحیم بخش اور اُن کے دو بھائی للّی لاج کے مالک تھے جو بازارِ حکیماں کے قریب جینوں کے محلے تھڑیاں بھابھڑیاں میں واقع تھا۔ تینوں بھائی بازارِ حکیماں والے مشاعروں کے زمانے سے اقبال کے دوست تھے۔[۳]

5

معلوم نہیں میر انیس کا مطالعہ اقبال نے کس قدر کیا تھا مگر اُن کی بعد کی نظموں میں کئی جگہوں پر میر انیس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

6

عرض کرتے تھے یہ خالق سے شہِ بندہ نواز
یک بیک عالمِ بالا سے یہ آئی آواز
اے مرے شیر کے فرزند! نبی کے دمساز
تجھ سے ہم خوش ہیں پذیرا ہے ترا عجز و نیاز
مرد ہے، عاشقِ کامل ہے، وفادار ہے تُو
جو کہا وہی کیا صادق الاقرار ہے تُو

میر انیس

7

۸ جنوری کو مرزا عبدالرحیم کی صدارت میں انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا

اجلاس ہوا۔ اقبال بھی گئے۔[۴]

8

فروری کے مخزن میں اقبال کی نظم 'میرا وطن' شائع ہوئی۔ اقبال نے تاریخی حوالوں کی وضاحت کے لیے نوٹ بھی لکھے تھے۔

9

ظفر علی خاں جو پہلے علی گڑھ میں شبلی نعمانی کے شاگرد رہ چکے تھے اور اب حیدر آباد دکن میں ان کے ساتھ تھے، دکن ریویو نامی پرچہ نکال رہے تھے۔ یہ انہی مولوی سراج الدین کے صاحبزادے تھے جو کسی زمانے میں لاہور کے بازارِ حکیماں میں نوجوان اقبال کو غزلوں میں رہنمائی فراہم کرتے تھے۔

فروری میں دکن ریویو میں اقبال کی کتاب علم الاقتصاد پر تبصرہ شائع ہوا۔ یہ تبصرہ ظفر علی خاں نے نقاد کے فرضی نام سے کیا تھا۔ ''ہندوستان کو جیسے اس علم کی ضرورت ہے شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے **ملک** کو ہو کچھ تو اس لیے کہ ایک حصہ **ملک** کا پہلے ہی سے زراعت، تجارت اور مزدوری میں مصروف ہے اور کچھ اس لیے کہ موجودہ تمدن روز بروز ان ضرورتوں کو بڑھا رہا ہے اور بغیر اس کے ترقی ناممکن ہے،'' انہوں نے لکھا۔ ''ایسے زمانے میں اس قسم کی کتابیں لکھنا درحقیقت **ملک** پر احسان کرنا ہے۔''

کتاب کا تعارف کروانے کے بعد ظفر نے شکایت کی تھی کہ اس کا طرزِ تحریر اور انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے اور مضامین مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ زبان کی غلطیاں بھی نکالی تھیں اور اقبال کی اس بات سے اختلاف کیا تھا کہ علم کا مقصد صرف واقعات کے سبب معلوم کرنا ہے جبکہ کسی مقصد کے حصول کا طریقہ متعین کرنا فن کے دائرے میں آتا ہے۔ اقبال کا خیال تھا کہ ہندوستان کی اقتصادیات کو باقی دنیا سے الگ کر کے پڑھنے کی کوشش علم اور فن کے اسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے

،مگر ظفر سمجھتے تھے، ''اس کا خیال ملک کے حالات اور واقعات پر غور کرنے سے پیدا ہوا ہے چنانچہ مولف خود اس امر کو تسلیم کرتے ہیں۔''

اس کے بعد ظفر نے کتاب سے دو اقتباس پیش کیے تھے جن میں اقبال نے کہا تھا کہ نئے حالات میں اقتصادیات کے اصول بدل کر زیادہ وسیع بھی ہو سکتے ہیں اور بعض چیزیں مختلف ممالک کے حالات پر منحصر ہیں۔

10

پروفیسر ارنسٹ ہیکل ایک جرمن بیالوجسٹ تھے جنہوں نے اُنتالیس برس پہلے ماحولیات کے لیے لفظ ایکالوجی (ecology) اختراع کیا تھا۔ ان کے خیال میں تہذیب اور معاشرت یہاں تک کہ مذہب بھی ڈارون کے نظریۂ ارتقاٗ کا پابند تھا۔ اُن دنوں ہیکل کے نظریات مقبول ہو رہے تھے مگر یہ بعض اوقات سائنسی مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی بھی کرتے تھے۔

اُس برس ولیم اینڈ نارگیٹ لندن سے اولیور لاج کی کتاب *Life and Matter* شائع ہوئی جس میں ان نظریات پر تنقید کی گئی تھی اور اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اقبال اِس سے کب واقف ہوئے مگر کبھی نہ کبھی یہ اُن کی کتابوں کے مجموعے میں شامل ہوئی۔

اسی برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ تھیں٭:

A. Z. *The Emancipation of Egypt*. London, Chapman

Alsworth Ross, Edward. *Foundations of Sociology*. New York, McMillan

Bagehot, Walter. *Physics and Politics*. London, Kegan Paul

Besant, Annie & C. W. Leadbeater: *Thought Forms*.

London, Theosophical Publishing Society
Clarke. *Towards Democracy*. London, Swan Sonnenachein
George Edward Woodberry. *Swineburn*. London, William Heinemann
Gulson, J. R. *The Philosophy of Proof*. London, George Rutledges
Hiller, H. Croft. *The New Science of Causation*. London, Walter Scott
Innes, Taylor A. *The Trial Of Jesus Christ: A Legal Monograph*. Edinburgh, T.T.Clark
Mercier, Charles. *Criminal Responsibility*. Oxford University Press
Seth, James. *A Study Of Ethical Principles* Edinburgh, W. Blackwood
Tisdall, W. St. Clair. *The Original Sources of the Quran*. London, Society for Promoting Christian Knowledge
Whitney, L. H. *Life And Teachings of Zoroaster, the Great Persian*. Chicago, Loren Harper Whitney

کانگریس کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں ہندوستانی قوم رہتی ہے۔ دشواری یہ تھی کہ

ہندوستان میں ہمیشہ معاشرے کی تقسیم ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر ہوتی تھی اور قوم کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ سرسید مرحوم نے بھی اسی بات کی نشاندہی کی تھی۔ ممکن تھا انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں ہندو اور مسلمان متحد ہو جاتے کیونکہ جنگوں میں مختلف مذاہب کے سپاہی اکٹھے ہوا ہی کرتے تھے مگر یہ سمجھوتہ مالِ غنیمت کی تقسیم سے آگے نہیں چلا کرتا تھا۔ ملک میں تعلیم عام ہونے سے پہلے ہندوستان کو اختیارات ملے تو پرانے تعصبات واپس آئیں گے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔

حقیقت کو تبدیل کرنے کے لیے اُسے نظر انداز کرنے کی نہیں بلکہ اُسے تسلیم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تُو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تُو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دَیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تُو، خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے
آ مل کے غیریت کے پردوں کو پھر ہٹا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دُوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے جی کی بستی
آ، اِک نیا شوالہ اِس دیس میں بنا دیں

دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
پھر اِک انُوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو
اِس ہردوارِ دل میں لا کر جسے بٹھا دیں
سندر ہو اُس کی صورت، چھب موہنی ہو اُس کی
اُس دیوتا سے مانگیں جو دِل کی ہوں مرادیں
زُنّار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں، شانِ حرم دکھا دیں
ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اِس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
اگنی ہے وہ جو نِرگُن، کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اُس آگ میں جلا دیں
ہے رِیت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا، ستم اُٹھانا اور اُن کو پیار کرنا

پوری نظم میں دو بند تھے اور یہ اٹھارہ اشعار پر مشتمل تھی۔

12

پچھلے برس جو میرا دیس 'یعنی سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا لکھا تھا اُس میں تو وطن انسانوں کے دم سے آباد تھا مگر اس برس کی نظموں میں ہندوستان خود ایک وجود بن گیا جس کی زندگی دینے والی قوتوں سے انسان جنم لیتے تھے۔ یہ وطن سوچ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا اور فیصلے کر سکتا تھا۔

اقبال کی یہ نظمیں اُس بنگالی شاعری سے قریب تھیں جس کا مقبول ترین شاہکار

بندے ماترم تھا اور جس کی روایت کو اُن دنوں اُنتالیس سالہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور آگے بڑھا رہا تھا۔

ایک فرق تھا۔ 'میرا دیس' اور 'نیا شوالہ' میں شاعر خواہ مذہبی عقاید کا اظہار کر رہا ہو یا نہ کر رہا ہو مگر سیاسی شناخت میں وہ نہایت واضح طور پر مسلمان ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ مذہب اور قومیت کا فرق موجود نہیں۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس فرق کے باوجود ساتھ چلنا ہے۔

نوعِ انساں کی محبت میں ہے مذہب کا کمال
امتیازِ کاسۂ شیخ و برہمن میں نہیں
خاک اگر ناپاک بھی چھونے سے ہو جائے تو کیا؟
پاک ہے جو چیز وہ آب و گِلِ تن میں نہیں'

13

داغ دہلوی حیدرآباد دکن میں ریاست کے حکمراں نظام نواب محبوب علی خاں کے استاد تھے اور خوب مزے میں رہتے تھے۔ اُن کے گھر رقص و سرود کی محفلوں میں شبلی نعمانی بھی آتے تھے جو اُن دنوں حیدرآباد میں تصنیف و تالیف کے شعبے سے وابستہ تھے۔

۱۶ فروری کو حیدرآباد دکن میں داغ کا انتقال ہو گیا۔

14

مخزن ہندوستان بھر کے تعلیم یافتہ اردو دانوں کے درمیان روابط قائم کر رہا تھا۔ نواب ارکاٹ کے پوتے شاطر مدراسی کی ایک فلسفیانہ نظم 'اعجازِ عشق' پچھلے برس شائع ہوئی تھی جس میں فلسفے کی روشنی میں اسلامی الٰہیات کی تشریح کی گئی تھی۔ اس کا ایک حصہ مخزن میں بھی چھپا۔ حالی نے ایک شعر خاص طور پر پسند کیا:

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار، اے ابلقِ لیل و نہار

شاطر نے اقبال کو خط لکھ کر اپنے قصیدے پر رائے طلب کی۔ اُن کی تعریف بھی کی جو شاید مبالغے کی حدوں کو چھو رہی تھی مگر شاطر فلسفیانہ شاعر تھے اور خوب سمجھ سکتے تھے کہ اقبال کے یہاں فلسفہ بھی جذبات میں ڈوب کر نکلتا تھا۔ یہ بات کم سے کم اُس زمانے کے کسی اور شاعر میں نہیں تھی۔ گویا اگر اقبال اُردو کی بجائے فارسی میں لکھتے تو عرفی کا دوسرا جنم سمجھے جاتے۔

۲۴ فروری کو جواب دیتے ہوئے اُنہوں نے شاطر کو بتایا کہ جالندھر میں اُن کے ایک دوست نے 'اعجازِ عشق' کو اتنی دفعہ پڑھا ہے کہ وہ تمام حصہ جو مخزن میں چھپا ہے اُنہیں زبانی یاد ہے۔

اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا، ''انسان کی رُوح کی اصلی کیفیت غم ہے۔ خوشی ایک عارضی شے ہے... آپ نے فطرتِ انسانی کے اس گہرے راز کو خوب سمجھا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں اس کے سقموں سے آپ کو آگاہ کروں۔ میں آپ کے حسنِ ظن کا ممنون ہوں مگر بخدا مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ آپ کے کلام کو تنقیدی نگاہ سے دیکھوں۔''

15

۲۶ فروری کو اسلامیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالغنی بی اے کی صدارت میں انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ اقبال بھی شریک ہوئے اور ایک سال کے لیے مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے۔

16

مغربی تہذیب سے دوچار ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کو جس قسم کے

مسائل کا سامنا تھا اُس کے حل کے لیے اکثر نوجوان ترکی کی طرف دیکھتے تھے۔ انہی میں شبلی کے پسندیدہ شاگرد سجاد حیدر یلدرم بھی تھے جنہوں نے دو برس پہلے اقبال کو اُردو شاعری کا روشن ستارہ قرار دیا تھا اور علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ترکی زبان جاننے کی وجہ سے پچھلے برس بغداد میں سفارتکار مقرر ہوئے تھے۔ پردے کے مخالف تھے۔

۱۹۰۵ء میں کسی وقت رسالہ تحریر میں ان کی 'صحبتِ ناجنس' شائع ہوئی جس میں انگریزی تعلیم یافتہ سہیلیوں کی خط و کتابت کے ذریعے اُن کی مشکلات دکھائی گئی تھیں۔ چونکہ مسلمان لڑکی کا انگریزی تعلیم حاصل کرنا غیر فطری سا معلوم ہوتا تھا لہٰذا خط و کتابت پر ۱۹۲۵ء کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔

مرکزی خیال ترکی سے ماخوذ تھا اور یہ اُردو میں پہلا مختصر افسانہ تھا۔

17

مارچ کے مخزن میں 'دُنیا شوالہ' شائع ہوئی۔ انہی دنوں اقبال نے داغ کا مرثیہ لکھا:

چل بسا داغ، آہ میّت اُس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے[۸]

18

شاطر مدراسی نے ایک اور خط لکھا جس کا جواب اقبال نے ۱۶ مارچ کو تحریر کیا، ''آپ کی صفائیِ زبان آپ کے ہموطنوں کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے مگر یہ معلوم کر کے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوئی ہے مجھے بھی تعجب ہوا۔''

انہوں نے شاطر کا یہ شعر پسند کیا:

ہم خدائی کرتے ہیں تیری بدولت اے خیال
ایک کُن سے ہوتے ہیں عالم ہزاروں آشکار

''جن صاحب کو آپ کا قصیدہ ازبر ہے اُن کا نام پنڈت چھجو رام وکیل ہے۔ باقی خیریت ہے۔''

اُسی روز انجمن حمایت اسلام کی جنرل کمیٹی کے اجلاس میں انجمن کے قواعدوضوابط مرتب کرنے کے لیے پانچ ارکان کی سب کمیٹی بنائی گئی۔ اقبال اجلاس میں شریک نہیں تھے مگر رکن منتخب ہوئے۔۹

۱۸ مارچ کو انجمن کی جنرل کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ قواعد میں ترمیم اور اضافے کے لیے ایک سب کمیٹی بنی۔ اقبال اس کے پانچ اراکین میں سے ایک تھے۔۱۰

19

اپریل کے مخزن میں اقبال کا لکھا ہوا داغ کا مرثیہ شائع ہوا۔

20

۴ اپریل کو کانگڑہ میں ایسا زلزلہ آیا جس کی تباہ کاری اُس نسل کے لوگوں کو ہمیشہ یاد رہی۔ اِس کے جھٹکے لاہور تک سب نے محسوس کیے مگر اقبال آرام کرسی میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھنے میں مگن رہے اور صرف ایک بار سر اٹھا کر علی بخش کی طرف دیکھا جو بے چینی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ ''جاؤ، سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو جاؤ،'' اُنہوں نے کہا اور دوبارہ کتاب میں گم ہو گئے۔

مطالعے سے فراغت پائی تو جھٹکے ختم ہو چکے تھے مگر اتفاق سے اُن کا گھر سلامت تھا۔ کوٹ پہن کر اور ٹوپی سر پر رکھ کر باہر نکلے تو دیکھا شیخ عبدالقادر کا مکان گر چکا ہے۔ واپس آئے اور کاغذ قلم اٹھا کر عبدالقادر کو خط لکھنے بیٹھ گئے۔

سیالکوٹ میں زلزلے سے ایک گھنٹہ پہلے شیخ نور محمد نے خیال ظاہر کر دیا تھا کہ زلزلہ

آنے والا ہے۔ بعد میں پوچھنے پر کہا کہ انہیں ایک خاص کیفیت محسوس ہوئی تھی جس سے اندازہ یہی تھا۔"

21

لاہور میں ایک مرزا خاندان تھا۔ مغل زمانے میں تاریخی عمارتیں اسی کی تحویل میں ہوا کرتی تھیں۔ انگریزوں نے ان عمارتوں کو سرکاری تحویل میں لیا تو انہوں نے مقبرۂ جہانگیر کی بازیابی کے لیے مقدمہ دائر کیا جو پریوی کورٹ تک چلا مگر آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ مقبرے کی بجائے کچھ اور زمینیں انہیں دے دی جائیں۔ مرزا خاندان کو رومان پرور شہنشاہ سے ایسی عقیدت تھی کہ اپنے خرچ پر ہر سال اُس کا عرس مناتے رہے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔

مرزا جلال الدین اسی خاندان کے ایک نوجوان تھے اور شیخ عبدالقادر کے دوستوں میں سے تھے۔ وہ انہی دنوں لندن سے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے آئے تھے۔ ریلوے روڈ اور چیمبرلین روڈ کے چوک میں دفتر لیا تھا جہاں سے مولوی ممتاز علی کا دارالاشاعت قریب تھا۔

اقبال ایک روز مولوی ممتاز علی کے حوالے سے مرزا جلال سے ملنے گئے۔ چھدری مونچھیں، الجھے ہوئے ابرو اور چہرے پر بشاشت۔ آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن دنوں وہ خوش ہیں۔

عبدلقادر پہلے ہی مرزا جلال سے اُن کا تذکرہ کر چکے تھے اور اُن کی نظمیں بھی پڑھوائی تھیں جن سے یہ متاثر ہوئے تھے چنانچہ اچھی طرح پیش آئے۔ ''میں انگلستان کی زندگی کے متعلق اُس قسم کے افسانے سناتا رہا جو ہمارے نوجوان اُس ملک سے لوٹنے پر اپنی فتوحات کے سلسلے میں سنایا کرتے ہیں،'' مرزا جلال کا بیان ہے۔

رخصت ہوتے ہوئے اقبال نے کہا کہ وہ ایک بار پھر ملیں گے۔

غزل

مجنوں نے شہر چھوڑا تُو صحرا بھی چھوڑ دے
نظّارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ! کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دُنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

منارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم، الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دِل کے ساتھ رہے، پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفَسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

مخزن مئی ۱۹۰۵ء

غزل میں چودہ اشعار تھے۔

کانپور سے محبِ وطن دیا نرائن نگم اخبار زمانہ نکالتے تھے۔ مئی میں اُس میں اقبال کی علم الاقتصاد پر تبصرہ شائع ہوا۔ "اب چونکہ ہندوستان نے بھی گوشۂ تنہائی سے نکل کر کشاکشِ حیات کے میدان میں قدم رکھا ہے جہاں اس کو اپنی قومی زندگی کی حفاظت کے لیے ایسی اقوام سے مقابلہ کرنا ہے جو... تجارتی اور حرفتی اسلحے سے پوری طرح آراستہ ہیں اس لیے ہمارے اہلِ وطن کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ علمِ دولت کے اصولوں سے ماہر ہو کر اپنے کو ان کے مقابلے کے قابل بنائیں۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے بھی اس ضرورت کا ذکر اپنے دیباچے میں کیا ہے۔"

تبصرہ نگار نے لکھا کہ اُن کی معلومات کے مطابق ایک دو ترجموں کو چھوڑ کر یہ اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ یہ بات درست نہ تھی کیونکہ یہ پچھلے ہی برس شائع ہوئی تھی جبکہ اس موضوع پر کم سے کم چھ کتابیں اردو میں اس سے پہلے آ چکی تھیں۔ "مگر جس صراحت کے ساتھ علم سیاستِ مدن کے ہر پہلو پر شیخ محمد اقبال صاحب نے اس کتاب میں بحث کی ہے اور جس عمدگی کے ساتھ انہوں نے مضامین کو ترتیب دیا ہے وہ دوسرے نامکمل نسخوں میں نظر نہیں آتی،" یہ شاید درست ہو۔

ہندوستانی تاجروں کے مفادات کی حفاظت کے لیے اقبال نے جو رائے پیش کی تھی اُس میں وہ تبصرہ نگار کو مرحوم رانا ڈے اور مسٹر جی سلبر مینا آئر کے ہمزبان دکھائی دیے یعنی اگر برطانوی حکومت غیر ملکی اشیاء پر زیادہ ٹیکس لگائے تو مقامی تاجروں کو اپنی چیزیں زیادہ بیچنے کا موقع ملے گا اور ہندوستان محض خام مال کا گودام بننے کی بجائے ایک صنعتی ملک کے طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا۔ تبصرہ نگار کو اس سے اختلاف تھا کیونکہ حکومتِ برطانیہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کبھی ایسا قانون بنائے گی جس میں برطانوی تاجروں کے نقصان کا اندیشہ ہو جیسا کہ مسٹر دت کی تاریخ سے معلوم ہوتا تھا جس میں پچھلے سو برس میں ہندوستانی تجارت کے ساتھ انگریزوں کی ناانصافی کی تفصیل

دی گئی تھی۔ ''ایسی حالت میں کیا ہندوستانیوں کا فرض نہیں ہے کہ جہاں تک ان سے ممکن ہو اپنی حرفت کی محافظت آپ کریں؟'' تبصرہ نگار کا واضح اشارہ سودیشی تحریک کی طرف تھا جس کے تحت خاص طور پر بنگال میں محبِ وطن رضا کار دکانوں پر حملہ کر کے غیر ملکی اشیا خاص طور پر غیر ملکی کپڑے کو آگ لگا دیتے تھے۔ یہ تحریک پچھلے برس تقسیمِ بنگال کے اعلان کے ساتھ شروع ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے غیر ملکی کپڑا بیچنے والے زیادہ تاجر مسلمان تھے جبکہ سودیشی تحریک کے کارکن عام طور پر ہندو ہوتے تھے چنانچہ مسلمانوں میں پریشانی کی ایک ایسی لہر پھیل رہی تھی جس کے نتائج کا اُس وقت صحیح اندازہ نہ لگایا جا سکتا تھا۔

مضمون نگار کو یہ بھی شکایت تھی کہ اقبال نے کرنسی کے ایکسچینج کے لیے سونے کے سکّے کو معیار بنانے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا مگر ایکسچینج کے قانون کا منفی پہلو پیش نہیں کیا تھا۔ تبصرہ نگار کے خیال میں اگر حکومت ایک پونڈ کی قیمت پندرہ روپے مقرر نہ کرتی ''تو شاید اس وقت بڑھتے بڑھتے اس کی قیمت سترہ یا اٹھارہ روپے تک پہنچ گئی ہوتی اور ہندوستانی کاشتکار کو ایک من گیہوں کے عوض پندرہ کے بجائے سترہ یا اٹھارہ روپے ملتے۔''

مضمون نگار کو تعجب تھا کہ اقبال اس مفروضے کے مخالف تھے کہ اگر زرعی ٹیکس مستقل طور پر مقرر ہو جائے اور اس کے بڑھنے کا خوف نہ رہے تو لوگ قحط کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ''ہر بیس یا تیس برس کے بعد اگر اضافہ مالگزاری نہ ہوا کرے تو زمیندار و کاشکار کا وہ افلاس جس میں وہ مالگزاری کی سختی کی وجہ سے آئے دن گرفتار رہتے ہیں کچھ ضرور کم ہو جائے گا،'' تبصرہ نگار کا خیال تھا۔ ''ہندوستان کا قحط غلے کا قحط نہیں ہوتا بلکہ روپے کا قحط ہوتا ہے۔ عوام کے پاس افلاس کی عالمگیر بلا میں ایسے مبتلا ہیں کہ ان کے پاس اتنا اندوختہ بھی نہیں کہ وہ ایک سال کی گرانی اُس کی مدد سے جھیل سکیں... ہندوستان میں غیر قوم کی حکومت کی ہونے کی وجہ سے اقتصادی اصول اپنا اثر آزادی

کے ساتھ نہیں پیدا کر سکتے۔ تعلیمی مسائل کی طرح اقتصادی مسائل پر بھی ہمارے **ملک** میں **پولیٹکل** رنگ چڑھتا جاتا ہے اور اقتصادی ترقی کے راستے میں بیسیوں **پولیٹکل** رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے تو ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں رہ کر **پولیٹکل** آزادی کی سخت ضرورت ہے۔"[۱۲]

24

۲۷ مئی تھی۔ رُوس کا عظیم الشان جنگی بیڑا یورپ اور افریقہ کے گرد چکر کاٹ کر کوریا کے جنوب میں سمندری دُھند میں سے برآمد ہوا تو اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دشمن جاپانی بیڑا تاک لگائے بیٹھا تھا۔

روس کے پینتیس جنگی جہازوں میں سے صرف تین چھوٹے جہاز بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ بقیہ سب تباہ ہو کر ڈوبے، بیکار ہوئے یا جاپان کے قبضے میں چلے گئے۔ آدھی رات کے بعد روسی اڈمرل نے ہتھیار ڈال دیے۔ اُس کے نو ہزار چھ سو افراد کے عملے میں سے نصف ہلاک ہو گئے تھے جبکہ جاپانیوں کے صرف ایک سو سترہ ملاح اور تین تارپیدو کشتیاں کام آئی تھیں۔ تاریخ میں پہلے کبھی اتنی بڑی بحری جنگ نہیں لڑی گئی تھی۔

اس سے قطعِ نظر کہ جنگ میں کون حق بجانب تھا یا دونوں ہی غلطی پر تھے ایشیا کے تمام ملکوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ روس ایک مغربی استعماری سلطنت تھی اور جاپان ایک چھوٹی سی مشرقی سلطنت۔ اُس کی فتح نے ثابت کر دیا تھا کہ مغرب کو شکست دی جا سکتی ہے۔

25

قطعہ

واعظ ترے فلسفے سے ہوں میں حیراں
منطق ہے تری نئی، نیا اندازِ بیاں
انسان کے واسطے ہے مذہب، لیکن
تُو کہتا ہے، مذہب کے لیے ہے انساں

زمانہ (کانپور)، جون ۱۹۰۵ء

زمانہ ہی میں اُسی مہینے اقبال کی ایک مختصر سی نظم 'ابر' بھی شائع ہوئی۔ یہ اُس نظم سے مختلف تھی جو پچھلے سال اِسی عنوان سے مخزن میں چھپی تھی۔[۱۳]

26

۱۹ جون کو حکومت نے تقسیمِ بنگال کا حتمی اعلان کر دیا۔ انتہاپسند ہندوؤں کا غصہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی نکل رہا تھا۔

اتحاد کو بگاڑنے میں قصور کس کا تھا، غیرمحفوظ اقلیت کا یا طاقتور اکثریت کا جسے اپنی طاقت کے لحاظ سے کھلے دل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا؟

27

اقبال کو ولیم کوپر کی نظم یاد آ گئی جس میں ایک بُلبل کسی جگنو کو دیکھ کر اقبال کے 'ہمدردی' والے بُلبل کے برعکس اُس کی مدد کرنے کی بجائے اُسے کھانے دوڑا تھا:

So, stepping down from hawthorn top
He thought to put him in his crop.
The worm, aware of his intent,

Harangued him thus, right eloquent:

اقبال کے ترجمے میں جگنو نے بلبل سے کہا۔

”تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی
اُسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اِس بوستاں کی“

مخزن، جولائی ۱۹۰۵ء

نظم کا عنوان 'ایک پرندہ اور جگنو' تھا۔ اِس میں بارہ اشعار تھے۔

28

داغ کے شاگرد احسن مارہروی جن سے مدت پہلے اقبال نے داغ کی تصویر کی فرمائش کی تھی اب لاہور آ چکے تھے اور مطبع مفید عام میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

اُن کی اقبال سے بھی ملاقات ہوئی ہوگی مگر اس کا حال معلوم نہیں۔[۱۴]

29

یورپ روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ کالج میں طویل رخصت بلاتنخواہ کی درخواست دے چکے تھے جو غالباً گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے منظور ہو گئی۔

شاید زندگی میں پہلی دفعہ انگریزی سوٹ اور ہیٹ خریدا۔ علی بخش سے کہا کہ وہ ہنگو جا کر اُن کے بھائی کے پاس ملازم ہو جائے، ولایت سے واپس آ کر یہ اُسے بلا لیں گے۔ مکان چھوڑ دیا، ستار کسی دوست کے حوالے کیا اور خود گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے سیالکوٹ چلے گئے۔

باب۲

شمع کے سامنے

اگست ۱۹۰۵ء

1

شیخ عطا محمد کے بیوی بچے سیالکوٹ ہی میں تھے۔ سب سے چھوٹا لڑکا مختار بہت کم سن تھا اور اُس کی عادت تھی کہ گھنٹوں شمع کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اُچھل کر اُس کے شعلے کو پکڑنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ عطا محمد تو شاید اچھی طرح خبر لیتے ہوں مگر اقبال اُسے گود میں بٹھا کر لیمپ یا شمع دان سامنے رکھ دیتے تھے اور بڑی دلچسپی سے اُسے دیکھتے رہتے تھے۔

بچہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلکِ پروانہ خُو
شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تُو
یہ، مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا؟
روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا؟
اِس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے
شمع اِک شعلہ ہے، لیکن تُو سراپا نُور ہے
آہ! اِس محفل میں یہ عُریاں ہے تُو مستور ہے

دستِ قدرت نے اسے، کیا جانے، کیوں عریاں کیا
تجھ کو خاکِ تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی
ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی
زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ
محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حُسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن
حُسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن
رُوح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اِس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس؟
حُسن کے اِس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

2

''میری والدہ کو دردِ گردہ اِس شدت سے ہوتا تھا کہ ہمیں ان کی موت سامنے نظر آیا کرتی تھی،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''ایک دفعہ وہ دردِ گردہ سے بیہوش پڑی تھیں، رات کا وقت تھا کہ حکیم نورالدین صاحب قادیانی نے آ کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حکیم صاحب نے جو ہیجان دیکھا تو پوچھا کیا بات ہے؟ ہم نے صورتِ حال بیان کی۔ حکیم صاحب نے کہا میں بھی ذرا دیکھوں...''

حکیم نورالدین نے امام بی بی کی ایڑی کے قریب کسی رگ کو دبایا تو اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ حکیم صاحب نے کہا، ''اب رات کا وقت ہے، اِس وقت تو سینک کرو، صبح باقاعدہ علاج ہوگا۔''

صبح ہوئی تو حکیم صاحب نے چوزہ تجویز کیا اور کہا کہ اس کا شوربہ پئیں اور گوشت کھائیں۔[1]

3

مولوی میر حسن کی عادات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مرحوم بہن سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لیے ہر صبح اُس کی قبر پر جاتے تھے۔ پھر کالج جاتے تھے۔ پیدل چلتے تھے اور اپنا ہر کام خود کرتے تھے۔

''ایک دفعہ وہ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا،'' اُن کے ایک شاگرد مولوی ظفر اقبال کا بیان ہے۔ ''نماز کے بعد میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُن کا جُوتا اُٹھالیا اور لے کر چلا کہ مسجد کے باہر اُن کو پہنا دوں گا۔ آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ یہ جُوتا میرا ہے۔ اور میرے ہاتھ سے جُوتا لے لیا۔''[2]

ایک روایت کے مطابق اقبال نے میر حسن سے بھی پی ایچ ڈی کی تحقیق کے بارے میں مشورہ کیا۔

4

اقبال نے اپنی مغربی ادب کی کتابیں یورپ جانے سے پہلے سیالکوٹ میں چھوڑ دیں ۔[۳]

5

۲۰ اگست کو وائسرائے لارڈ منٹو نے استعفٰی دے دیا۔ ہندوستان میں برطانوی فوج کے کماندارِ اعلیٰ لارڈ کچنر سے اُس کے اختلافات ہو گئے تھے جو فوج کو وائسرائے کی نگرانی سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔

حکومت نے اُسی روز ایک وائٹ پیپر چھاپ کر وائسرائے کے استعفے کی وضاحت پیش کی۔

6

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

اقبال ایک دفعہ پھر لاہور میں تھے اور دوستوں کی محفل تھی ۔[۴] راوی اُس زمانے میں صاف ستھرا اور بھرپور دریا تھا جس میں بادبانی کشتیاں چلا کرتی تھیں ۔ اُنہیں دور جاتے دیکھتے تھے تو پہلے اُن کے بادبان نظر سے غائب ہوتے اور پھر آہستہ آہستہ پوری کشتی غائب ہو جاتی تھی ۔

اقبال نے سوچا، کشتی نظر سے غائب ہوتی ہے مگر موجوں میں ڈوبتی تو نہیں ۔ یہ تو نظر کا دھوکا ہے جو کشتی کو غیر موجود بتا رہا ہے ورنہ وہ تو باقی ہے ۔ابد کے سمندر میں انسانی زندگی کی مثال بھی تو یہی ہو سکتی ہے؟

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی، نہاں ہے یونہی

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

نظم کا نام 'کنارِ راوی' رکھا۔ اس میں تیرہ اشعار تھے۔ پہلے بند میں تین، دوسرے میں چھ اور تیسرے میں چار۔

7

اقبال ایک دفعہ پھر مرزا جلال الدین سے ملنے گئے۔ ولایت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ''علمی بات نہ میں نے چھیڑی نہ انہوں نے کی،'' مرزا جلال کا بیان ہے۔

8

اخبار وطـــن کے اڈیٹر انشاء اللہ خاں سے اقبال نے وعدہ کیا کہ وہ یورپ کے سفر کا حال اُن کے اخبار میں اشاعت کے لیے لکھ کر بھیجیں گے۔

9

اقبال نے اپنے سفر کی اطلاع میر غلام بھیک نیرنگ کو بھیجی جو انبالہ میں وکیل تھے۔ نیرنگ نے کئی سال پہلے قانون کا وہی امتحان پاس کیا تھا جس میں ناکامی کا داغ اقبال کے دل میں اب تک تھا اور شاید بیرسٹر بننے کے بعد ہی مٹ پاتا۔

CyberLibrary.net All rights reserved. اقبال اکادمی پاکستان © 2002-2006

باب ۳

سمندر

ستمبر ۱۹۰۵ء

دہلی

1

یکم ستمبر کو نیرنگ عدالتی مصروفیات کی وجہ سے شملہ میں تھے۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن کالکا تھا اور وہاں تک مسافروں کو تانگے سے آنا پڑتا تھا۔ محکمہ ڈاک کے دوگھوڑوں والے تانگے اس راستے پر عام چلتے تھے جن میں دن کے وقت مسافروں کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی مگر کوئی مسافر رات کے تانگے میں بیٹھنا چاہے تو اُسے ایک فارم پر دستخط کرنے پڑتے تھے کہ اُس کے کسی نقصان یا حادثے کے لیے حکومت ذمہ دار نہ ہوگی۔

نیرنگ نے بھی یہی فارم پُر کیا اور شام چھ بجے تانگے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تاکہ اگلی صبح کالکا سے دہلی جانے والی گاڑی نہ چھوٹے۔ منزل سے دو میل پہلے ایک کھیت میں آگ جلتی دیکھ کر گھوڑے بے قابو ہوئے اور ایک پُل پر اس طرح چڑھے کہ تانگہ ٹوٹ گیا اور گھوڑے ٹوٹے ہوئے تانگے سے آزاد ہو کر بھاگ نکلے۔ ڈاک کے تھیلے سڑک پر بکھر گئے اور نیرنگ کے گھٹنے سے خون بہنے لگا۔

کچھ دیر بعد کالکا کی جانب سے ایک خالی تانگہ شاید اس حادثے کی اطلاع پا کر بگل بجاتا پہنچا اور نیرنگ وقت پر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔[1]

اقبال ۲ ستمبر کی صبح گیارہ بجے دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے دوست نذر محمد بی اے موجود تھے۔ اقبال نے کچھ دیر نذر محمد کے گھر آرام کیا اور اُس کے بعد دوستوں کے ساتھ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر پہنچ گئے جہاں نیرنگ بھی اُن سے آن ملے۔ شیخ محمد اکرام جو عبدالقادر کی غیر موجودگی میں مخزن کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے وہ بھی اب اقبال کے میزبانوں میں شامل ہو چکے تھے۔

''اللہ اللہ! حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''بس یہ سمجھ لیجیے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔''[۲]

اُنہوں نے دوستوں سے درخواست کی کہ وہ باہر صحن میں ٹھہریں اور خود مزار کے سرہانے بیٹھ کر اپنی نظم 'التجائے مسافر' پڑھی:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

۳۶ اشعار کی نظم میں دو بند تھے۔

صحن میں آئے تو دوستوں نے فرمائش کی۔ اقبال مزار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے اور نظم دوبارہ پڑھی۔ اس کے علاوہ 'برگِ گل' بھی جو دو برس پہلے درگاہ میں پڑھی گئی تھی

دوبارہ پڑھ کر سنائی۔

اسی قبرستان کے ایک گوشے میں ایک قبر ہے جس پر میر مہدی مجروح کا لکھا ہوا مادۂ تاریخ درج ہے:

ہاتف نے کہا، گنجِ معانی ہے تہِ خاک!

''شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالبؔ مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی...'' غضب ہوا کہ ولایت نامی ایک قوال لڑکے نے مزار کے قریب بیٹھ کر موقع کی مناسبت سے ایک غزل گائی۔ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں اور اقبال تو لوحِ مزار کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لے کر بیٹھ گئے اور سر جھکا لیا:

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

خاص طور پر اُس وقت اقبال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جب ولایت اِس شعر پر پہنچا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

یہ اُٹھے اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں وہ اِس کے علاوہ صرف ہمایوں کے مقبرے اور دارا شکوہ کی قبر پر جا سکے کیونکہ وقت کم تھا۔ ہمایوں کا مقبرہ بھی خواجہ نظام الدین کی بستی ہی میں واقع تھا جس سے کچھ دُور نظام الدین اولیا کی اصل خانقاہ کے کھنڈر موجود تھے جن میں کبھی

امیر خسرو بھی مرشد سے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ معلوم نہیں اقبال نے وہ کھنڈر دیکھے یا نہیں کہ میں، وہ راتیں اور اُس کوچے کا کنارا کہ بس میں ہی جانتا ہوں۔ دل بھی گیا اور روح بھی گئی مگر اُس طرف کہ بس میں ہی جانتا ہوں:

من و شبہا و یادِ آں سرِ کوئے کہ من دانم!
دلم رفتست و جاں ہم می رود سوئے کہ من دانم

امیر خسرو[۳]

''شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں فاتحہ پڑھا۔ داراشکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ھو الموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی سبق لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔''

3

جس وقت اقبال خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر گزری ہوئی تہذیب کے نشان تلاش کر رہے تھے عین اُسی وقت کلکتہ سے نئے وائسرائے لارڈ منٹو نے اعلان کیا کہ ۱۶ اکتوبر تقسیمِ بنگال کی حتمی تاریخ ہے۔

ہندوستانی معاشرہ ایک نئی کروٹ لینے والا تھا جس کے بعد کوئی چیز ویسی نہ ہو سکتی تھی جیسی وہ اب یا پہلے کبھی تھی۔

بمبئی

4

کم و بیش ایک دن ٹرین میں گزار کر اقبال ۴ ستمبر کی صبح دہلی سے بمبئی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی انگلش ہوٹل تھا جس کا نگران ایک پارسی بزرگ تھا جس کے چہرے پر اس قدر تقدس تھا کہ اقبال کو ایران کے قدیم خور (نبی) یاد آ گئے۔ طامس کک کمپنی

نے اِس ہوٹل میں قیام تجویز کیا تھا لیکن اگر نہ کیا ہوتا تب بھی شاید اقبال کفایت شعاری کی وجہ سے اِسے پسند کرتے کیونکہ اس کا کرایہ دوسرے ہوٹلوں سے کم تھا یعنی صرف تین روپے یومیہ۔

وہ بمبئی کی وسعت اور رنگینی سے بہت متاثر ہوئے۔ ''خدا جانے لندن کیا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے،'' انہوں نے لکھا۔ اُن کا لاہور تو خیر دہلی کے عبرت کدے کا پائیں باغ تھا اور خود دہلی ایک پرتکلف تہذیب کا مزار مگر بمبئی کی کیفیت بالکل جدا تھی۔ ''خدا اِسے آباد رکھے، عجیب شہر ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سربفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمدورفت اِس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ و امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو، فوراً آ ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔''

اگر اُنہیں یہاں مستقل رہنا پڑتا تو شاید زندہ درگور ہو جاتے مگر چونکہ صرف سات دن کا قیام تھا لہٰذا ہنسی خوشی شہر دیکھتے اور پارسی لڑکیوں کے حسن پر تنقید کرتے رہے۔ فطرتاً سست ہونے کے باوجود جس مقام پر جاتے وہاں کے تہذیبی مزاج کو جلد ہی سمجھ لیتے اور چند بنیادی تقاضوں سے قطعِ نظر بڑی روشن خیالی سے مشاہدہ کر سکتے تھے۔

اُنہوں نے اپنے مختصر سفرنامے میں بمبئی کا تذکرہ جس طرح کیا ہے اُس میں اس شہر کی تجارتی اور میٹروپولیٹن فضا کا تاثر اقبال کے ذہن میں کارفرما لگتا ہے۔ اس پہلو نے اقبال کو اس وجہ سے بھی اپنی طرف کھینچا ہوگا کہ اقتصادیات اُن کی دلچسپی کا خاص مضمون تھا اور بمبئی گویا اس مضمون کے لیے ایک بہت بڑی تجربہ گاہ تھی جو انہیں مطالعے کی دعوت دے رہی تھی۔

''(انگلش ہوٹل) کا منتظم ایک پارسی پیرمرد ہے... دکانداری نے اُسے ایک ایسا عجز

سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علما میں باوجود عبادت اور مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ 'محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے۔'''

کچھ دنوں میں اُس سے اتنے متاثر ہو گئے کہ بعض اوقات اُسے دیکھ کر آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔

ہوٹل کا حجام ہر روز گجراتی اخبار پڑھتا تھا اور ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا اور دادا بھائی نوروجی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا جو بقول اُس کے انگلستان میں "ہم کالوں کے لیے لڑتا ہے۔"

ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار تھے اور وہ بھی ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے مگر اُردو نہیں پڑھ سکتے تھے حالانکہ اُن کا مولوی اُردو ہی میں اُن کا نکاح پڑھاتا تھا۔ اقبال نے لکھا۔ "یہاں ہر کوئی اُردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ کبھی ہندوستان نہیں گیا مگر اُردو خاصی بولتا تھا۔" ہوٹل کا سیٹھ وہی پیر مرد تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ذہنی طور پر بمبئی کو ہندوستان سے الگ ہی ایک دنیا سمجھ بیٹھے تھے۔

ہوٹل میں مختلف اقوام کے لوگ آتے جاتے رہتے اور اقبال کوشش کرتے کہ کسی نہ کسی طرح اُن کے درمیان جا بیٹھیں۔ ایک یونانی تاجر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا اور چین سے اپنا بوریا بستر اٹھا کر ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) جا رہا تھا کیونکہ اب چینیوں نے یورپی چیزیں خریدنا چھوڑ دی تھیں۔ "شاباش اَفیمیو! شاباش، نیند سے بیدار ہو جاؤ،" اقبال نے اپنے دل میں سوچا۔ "ابھی تم آنکھیں مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو ازسرِ نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروّت کی بُو باقی نہیں رہی۔ ہم اُس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اُس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو

مسلمانوں کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش! خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔''

اِن جذبات میں اُس سودیشی تحریک کی طرف بھی اشارہ ہے جو انہی دنوں تقسیمِ بنگال کے اعلان کی مخالفت میں کلکتے سے شروع ہوئی تھی اور بمبئی میں بھی اِس کے اثرات محسوس ہوئے ہوں گے۔ ''اِس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اِس قدر ہے کہ بعض اوقات مجھے مجنون کر دیتا ہے۔''

جب اقبال ایک سستے ہوٹل میں بیٹھے قوم کے مستقبل پر غور کر رہے تھے نوجوان بیرسٹر محمد علی جناح شہر کے کسی اور حصے میں واقع اپنی شاندار قیام گاہ میں شاید کانگریس کی کسی میٹنگ میں پڑھنے کے لیے اپنی تقریر تیار کر رہے ہوں گے۔ ممکن ہے اقبال نے کانگریس کے سرگرم رکن کے طور پر اُن کا نام بمبئی کے کسی روزنامے میں پڑھا ہو اور نظر انداز کر دیا ہو۔ مگر یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ اگر اُس زمانے میں بمبئی کی کسی شاہراہ پر دونوں کی ملاقات ہو جاتی تو وہ ایک دوسرے پر کیا تاثر قائم کرتے؟

5

ایک رات کھانے کے کمرے میں دو جنٹلمین اقبال کے سامنے آ بیٹھے اور فرانسیسی میں باتیں کرنے لگے۔ جب کھانے کے بعد اُن میں سے ایک نے کرسی کے نیچے سے لال ٹوپی نکال کر پہنی تو اقبال کو معلوم ہوا کہ وہ تُرک ہیں۔

اگلے روز اقبال نے اُن میں سے ایک کے ساتھ فارسی میں گفتگو شروع کی کیونکہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اُس کی فارسی اتنی ناقص تھی کہ اقبال کو مجبوراً ٹوٹی پھوٹی عربی پر اُترنا پڑا۔ یہ نوجوان ترک ینگ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور سلطان عبدالحمید کا مخالف تھا۔ ترکی کے سب سے مشہور زندہ شاعر کمال بے کا شاگرد تھا اور سیاسی موضوعات پر لکھتا تھا۔ اُس نے کمال بے کے کچھ عمدہ اشعار اور سلطان کی ہجو میں اپنے اشعار بھی سنائے۔

اقبال نے اُسے مشورہ دیا، ''ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے

کیونکہ جس طریق سے رعایائے انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کیے وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت وخون ہو جانا کچھ خاکِ انگلستان ہی کا حصہ ہے۔"

تقریباً اُسی وقت وہاں سے بہت دُور دمشق میں پچیس برس کا ایک نوجوان فوجی افسر 'وطن وحریت' کے نام سے ایک باغیانہ تنظیم کی بنیاد رکھ رہا تھا جس کا مقصد سلطان کی حکومت ختم کر کے ترکی کو جمہوریت کے راستے پر لانا تھا۔ اس افسر کو پچھلے برس ترکی کی فوجی اکیڈمی سے تربیت پا کر فارغ ہوتے ہی باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث پا کر ترکی سے جلاوطن کیا گیا تھا اور دمشق بھیجا گیا تھا تا کہ آیندہ سیاست میں حصہ نہ لے سکے۔

اُس کا نام مصطفیٰ کمال تھا۔

6

ستمبر کے مخزن میں اقبال کی نظم 'بچہ اور شمع' شائع ہوئی۔

7

ستمبر ہی میں ہندوستان کے اردو دان طبقے میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ یہ مثنوی گلزارِ نسیم کے بارے میں عبدالحلیم شرر اور لکھنوی ادیب چکبست کا جھگڑا تھا۔ کئی رسالے اس جھگڑے میں شریک ہوئے۔

8

اقبال کا خیال تھا کہ بمبئی میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا کیونکہ یہاں کے مسلمان دولت مند تھے۔ مگر ایک شام اُسی ترک جنٹلمین کے ساتھ بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھتے ہوئے انہوں نے چند لڑکوں سے معلومات حاصل کیں جو اسکول کی گراونڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے تو معلوم ہوا فنڈ موجود ہیں مگر جو مسلمان طلبہ میٹرک سے آگے تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ دوسرے کالجوں میں پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ جیسی اچھی تعلیم

وہاں ملتی ہے ویسی تعلیم ایک الگ کالج بنا کر نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ مسلمانوں کا الگ کالج نہیں بنایا گیا۔ ''معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ اُن میں عقل بھی ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں... نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔''

اُنہوں نے اسکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے بھی دیکھا جو ''چستی کی مورتیں تھی، مگر تعجب ہے کہ ان کی خوبصورت آنکھیں اسّی فیصد کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔''

تجارتی نقطۂ نگاہ رکھنا اگر اقبال کو بمبئی کے مسلمانوں میں پسند آیا تھا تو یہی بات پارسیوں میں بری لگی کیونکہ ''یہ لوگ کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرّہ یہ ہے کہ فارسی کو حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہیں۔'' بات شاید یہی تھی جس نے اقبال کو اُن سے بدگمان کر دیا۔

''اِس قوم کی صلاحیت نہایت تعریف کے قابل ہے اور اُن کی دولت و عظمت بے اندازہ، مگر اس قوم کے لیے کسی اچھے فیوچر کی پیش گوئی نہیں کر سکتا،'' اُنہوں نے لکھا۔

بمبئی سے رخصت ہونے سے پہلے اقبال ہوٹل کے سیٹھ سے بھی متنفر ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ایک شام وہ نیچے والی منزل میں کرسی پر بیٹھے تھے کہ ''پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اُس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُس نے چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دُور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اِس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پیے ہوئے بھی تھا، بولا: سرابِ سوک پینے سے سبھی گم دُور ہو جائے۔ میں نے سن کر کہا واہ رے بڈھے خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کی کھیت

واڑی میں بکتا پھرے۔''

آخری جملے کی پرتکلف عبارت کا آسان الفاظ میں مطلب یہ تھا کہ اُس بزرگ کی کئی بیٹیاں پیدا ہو کر بمبئی کے بازارِ حسن میں جسم فروشی کریں۔ بظاہر اُس غریب کی شراب نوشی ایسی بات نہ تھی جس پر یہ اُسے گالی دیتے۔ اگر شراب کی بوتل سے مراد کوئی طوائف نہیں تو پھر یہ اُن کی طبیعت کا وہی پہلو تھا جو کبھی کبھی کسی سے بلا وجہ وابستہ کی ہوئی توقعات پوری نہ ہونے پر طبیعت کو بیزار کر دیتا تھا۔

سمندر

9

۷ ستمبر تھی۔ اقبال کے لاہور کے دوست لالہ دھنپت رائے اور اُن کے دوست کوئی ڈاکٹر صاحب جو اُس روز اتفاق سے بمبئی میں موجود تھے اقبال کو چھوڑنے بندرگاہ تک گئے۔

''اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔'' اقبال بمبئی کی وکٹوریہ ڈاک (Victoria Dock) کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ''کئی طرح کے جہاز اور سینکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح وسلامت منزلِ مقصود پر پہنچا دیں گے۔ خیر، طبّی معاینہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا... کوئی ۳ بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے۔ یہاں تک کہ موجیں ادھر اُدھر سے آ آ کر ہمارے جہاز کو چومنے لگیں۔''

یہ مسرت اور سرخوشی اُس وقت غارت ہو گئی جب اندازہ ہوا کہ جہاز پر ساٹھ سے زیادہ مسافر نہیں اور چونکہ یہ فرانسیسی کمپنی کا جہاز تھا لہٰذا تقریباً سب فرانسیسی بول رہے تھے۔ گویا پندرہ دن کے سفر میں گفتگو کے مواقع محدود۔ بہت پچھتائے کہ انگریزی کمپنی

کے جہاز سے سفر کیوں نہ کیا۔

''اگرچہ فرانسیسی جہازوں میں ہر طرح کی آسائش ہے تاہم میری رائے یہی ہے کہ ہم لوگوں کو انگریزی کمپنیوں کے جہازوں سے سفر کرنا چاہیے،'' اُنہوں نے لکھا۔

10

رات کو مسافر اپنے اپنے کمروں میں سوتے تھے اور صبح سے شام تک عرشے پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے تھے۔ سیفٹی میچ کا رواج ہونے سے قبل ماچس ایک ایسی چیز تھی جسے استعمال کرنے کی جہاز پر مسافروں کو اجازت نہ تھی۔ عرشے پر کسی کیبن کی دیوار سے کوئی انگیٹھی نما چیز لٹک رہی تھی کہ جس کسی کو سگریٹ یا سگار جلانا ہو وہ اُس میں سے ایک لکڑی اٹھا لے۔

ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی تھے جو عربی بولتے تھے مگر افسر تمام فرانسیسی تھے جن کے تکلفات دیکھ کر اقبال کو لکھنؤ یاد آ گیا۔ ''ایک روز افسر تختۂ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اتفاق سے یا غالباً ارادتاً یہ عورت اُس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گزری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے۔''

سفر کے دوسرے دن ہی مسافر بحری امراض میں مبتلا ہونے لگے مگر اقبال بھلے چنگے رہے۔ ''بمبئی سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر متلاطم تھی،'' اُنہوں نے نوٹ کیا۔ ''خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی اُونچی اُونچی موجیں آتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ دیکھ کر دہشت ہوتی تھی۔ ایک شب ہم کھانا کھا کر تختۂ جہاز پر آ بیٹھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم سب کو سُلا دیا مگر دفعتہً ایک خوفناک موج نے اُچھل کر ہم پر حملہ کیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے۔ عورتیں، بچے اور مرد نیچے بھاگ کر اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر کا باعث بنے رہے۔

''راستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اِس نظارے کی یکسانیت سے اکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے اٹھتی ہیں تو اُن کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور دُور دُور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں۔''

اُنہوں نے محسوس کیا کہ خدا کی بے انتہا قوت کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ اُنہوں نے لکھا، ''حجِ بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں اُن سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اُس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارعِ اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔''

ہم سفروں میں اقبال نے کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب دریافت کر لیے جو اٹھارہ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے تھے۔ بہت باخبر آدمی معلوم ہوتے تھے اور ان کے ساتھ علم و ادب پر گفتگو ہو سکتی تھی۔

11

۹ ستمبر کو اُن کے سمندر سے بہت دُور رُوسی ادب کا سب سے بڑا آدمی کاؤنٹ ٹالسٹائی اپنی تراسیویں سالگرہ منا رہا تھا۔ وہ اپنی تمام جائداد سے دست بردار ہو چکا تھا اور غریب کسانوں میں زندگی بسر کرتا تھا۔

پہلے وہ سپاہی بنا مگر ہولنا کیوں نے اُسے بیزار کر دیا۔ پھر اُس نے انتہائی ضخیم ناول لکھے مگر بہت جلد محسوس کیا کہ جس حقیقت کی اُسے تلاش ہے وہ ادب اور افسانے کی دنیا میں نہیں ہے۔ تب اُس نے مذہب کی طرف رجوع کیا اور یسوع مسیح کی سادہ تعلیمات میں اُسے کئی سوالوں کا جواب مل گیا۔ اُس کے بدلے ہوئے خیالات سے واقف ہو کر عیسائی دنیا اُس کی گرویدہ ہو گئی اور دُور دُور سے لوگ اُس کی زیارت کو آنے لگے مگر بے

چین طبیعت نے پھر کروٹ لی اور کلیسا کی طاقت بھی اُس کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔

کلیسا کی رُوح مسیح کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی تھی۔ ٹالسٹائی نے تہذیب کے تمام اداروں کو باطل قرار دیا۔ ریاست، قانون، جنگ، حُبِ وطن، شادی بیاہ، جدید ادب، فن، سائنس اور طب سبھی دھوکہ قرار پائے۔ کلیسا نے راندۂ درگاہ کرنے کا فیصلہ کیا مگر وہ تو بہت مدت پہلے ہی تعریف اور تنقید سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اُس کے پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ بادشاہ کی فوج کا سپاہی شیطان کا چیلہ ہے جو تلوار کے زور پر روٹیاں چھین کر اپنے آقا کی جھولی میں ڈالتا ہے۔ تاج و تخت، کلیسا اور وطن خواب آور دوائیں ہیں جن کے عوض بادشاہ رعایا کی عزتِ نفس خریدتے ہیں۔

''ٹالسٹائی! ٹالسٹائی!!'' جہاز پر ایک فرانسیسی پادری نے پکارا جو رُوسی زبان سے واقف تھا مگر ٹالسٹائی کے نام سے اُسے اقبال ہی نے چند روز پہلے واقف کروایا تھا۔ ''تم ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو؟''

''ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے،'' اقبال نے جواب دیا۔ ''زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر لگاتی ہے تب کہیں جا کر ایک ٹالسٹائی پیدا ہوتا ہے۔''

رات دیر تک ڈپٹی کمشنر صاحب سے گفتگو رہی۔

سر ولیم میور کے بارے میں اُن کا کہنا تھا کہ کاش یہ شخص ذرا کم متعصب ہوتا۔ اُنہوں نے عمر خیام کی تعریف بھی کی جس پر اقبال نے کہا کہ اہلِ یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ خیام کو بھول گئے ہوتے۔ غیر معروف شاعروں کو گفتگو میں لا کر اُن کی تعریف کرنا شاید اُن دنوں اقبال کی عادت تھی۔ ۵

12

اگلے روز وہ صبح جلدی اُٹھ گئے۔ ''آج ۱۲ ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمۂ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہو رہا ہے اور سمندر اس وقت ایسا

ہی ہے جیسا ہمارا دریائے راوی۔ شاید صبح کے پُرتاثیر نظارے نے اُس کو سمجھا دیا ہے کہ سکونِ قلب بھی ایک نایاب شے ہے۔ ہر وقت کی اُلجھن اور بیتابی اچھی نہیں۔ طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دِل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے... حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے میں اُن کو قابلِ معذوری سمجھتا ہوں۔''

جہاز کی اوپر کی چھت پر کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب اور فرانسیسی پادری بھی اس منظر کا لطف اٹھا رہے تھے۔

''اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا''۔ اقبال نے لکھا۔ ''ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اُس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں... اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تُو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔

''باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ مگر اے پاک سرزمین تُو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو اُن کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔

''تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزروں ولیوں اور سلمانوں کو تمازتِ آفتاب محفوظ رکھا ہے۔ کاش! میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں

لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اُس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''

قطرے کے منہ سے نام جو تیرا نکل گیا
بادل سے گر کے روئے ہوا پر سنبھل گیا
عظمت ہے خاص، پاک مدینے کی خاک کو
خورشید بھی گیا تو وہاں سر کے بل گیا

عدن

13

جہاز عدن پہنچا مگر مسافروں کو قرنطینہ کی وجہ سے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی۔عرب کے ساحل پر قدم رکھنے کی اقبال کی تمنا پوری نہ ہو سکی مگر شاید یہیں سے کسی کے ذریعے مولوی انشاءُ اللہ خاں کے نام اپنے سفرنامے کی پہلی قسط پوسٹ کروائی۔ [۸]

سویز

14

اُنہوں نے مولوی انشاءُ اللہ کو لکھا تھا کہ سفرنامے کی اگلی قسط وہ سویز پہنچ کر لکھیں گے مگر سویز تک راستہ بہت مختصر تھا۔ جہاز ساحل سے لگا تو مسلمان دکانداروں کی ایک تعداد جہاز پر آموجود ہوئی۔

''اِنہی کے آبا و اجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔'' اقبال نے لکھا۔''سلیمانِ اعظم ان ہی میں کا ایک شہنشاہ تھا جس کی وسعت تجارت نے

اقوامِ یورپ کو ڈرا کر ان کو ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔''

پوسٹ کارڈ اور پھل سے لے کر مصر کے پرانے بتوں تک، جو غالباً جعلی تھے بہت سی چیزیں بِک رہی تھیں۔ معلوم نہیں اقبال کو اپنے پسندیدہ 'قینچی' کے سگریٹ ملے یا نہیں مگر ایک نوجوان مصری دکاندار سے انہوں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور اپنی عادت کے مطابق گفتگو شروع کرنے کی کوشش کی تو اُسے بتا بیٹھے کہ مسلمان ہیں۔ اُسے یہ ماننے میں تامل ہوا اور اُس نے ان سے پوچھا کہ اگر مسلمان ہیں تو ہیٹ کیوں پہنتے ہیں۔ اقبال نے جواب دیا کہ کیا ہیٹ پہننے سے اسلام تشریف لے جاتا ہے تو اُس نے کہا کہ اگر مسلمان کی ڈاڑھی منڈی ہو تو اُس کو ٹرکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہو گی؟

اقبال نے دل میں سوچا کہ کاش ہندوستان میں یہی اصول رائج ہو جائے تاکہ کم سے کم ڈاڑھی منڈوانے کے خلاف وعظ کرنے والے مولویوں سے نجات ملے۔

معلوم ہوا کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بھی جانتا تھا اور حافظِ قرآن تھا، جب اقبال نے چند آیات پڑھیں تو خوشی سے اُن کے ہاتھ چومنے لگا اور باقی دکانداروں کو بلا لیا جو اقبال کے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہنے لگے "یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔''

تھوڑی دیر بعد مصری جوانوں کا ایک وفد جہاز کے عرشے پر آیا جسے دیکھ کر اقبال کو علی گڑھ کے طلبہ یاد آ گئے۔ ''یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور میں بھی دخل در معقولات ان میں جا گھسا،'' اقبال نے لکھا۔ ''ان میں سے ایک مسلمان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا جیسے حریری کا کوئی رسالہ پڑھ رہا ہو۔''

بندرگاہ سے روانہ ہو کر جہاز آہستہ آہستہ سویز کنال میں جا داخل ہوا۔ اس زمانے میں اسے انجینئرنگ کا معجزہ سمجھا جاتا تھا۔ بحیرۂ احمر کو بحیرۂ روم سے ملا کر ایشیا سے یورپ کے سفر کو سیکڑوں میل مختصر کر دیا گیا تھا۔ اقبال نے دیکھا کہ بعض جگہوں پر یہ کنال ایسی

تنگ تھی کہ دو جہاز مشکل سے اس میں سے گزر سکتے تھے۔ سیکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے تھے جب ٹھیک رہتی تھی۔

''یہ کنال جسے ایک فرانسیسی انجنیر نے تعمیر کیا تھا دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔'' اقبال نے لکھا۔ ''عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانہ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا۔''

کنارے پر جو مزدور کام کر رہے تھے اُن میں سے بعض نہایت شریر تھے۔ جب جہاز آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور جہاز کی چند یورپین عورتیں عرشہ پر کھڑی ساحل کا نظارہ کر رہی تھیں تو اُن میں سے ایک مکمل ننگا ہو کر ناچنے لگا اور یہ بے چاریاں دوڑ کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

کنال میں اقبال نے ایک مصری جہاز بھی دیکھا جس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے عربی غزل گاتے جا رہے تھے۔ ابھی پورٹ سعید بھی نہ پہنچے تھے کہ ایک بارود سے بھرے ہوئے جہاز کے پھٹ جانے کی خبر ملی۔

کچھ دیر بعد اُس کے ٹکڑے کنال سے گزرتے ہوئے دکھائی دیے۔

پورٹ سعید

15

اقبال کے خیال میں یہ چھوٹا موٹا بمبئی تھا۔ وہ ایک ہم سفر کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر پہنچے تھے اور ایک مسلمان رہنما کی مدد سے شہر کی سیر کر رہے تھے۔ نوٹس بورڈ سے انہوں نے چند نئے عربی الفاظ سیکھے جنہیں ایک کاغذ پر لکھ لیا۔ یہودی، فرانسیسی، انگریز، یونانی، مسلمان سب یہاں آباد تھے اور سب کے محلے، ہوٹل اور عبادت گاہیں

الگ تھیں ''لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمان آباد ہیں وہ جگہ بہت میلی ہے۔'' پوسٹ آفس سے اقبال نے کچھ خط ڈاک میں ڈالے اور رہنما کو کچھ انعام دے کر واپس جہاز پر آ گئے۔ یہاں تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔

''اِن عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہو گی نہایت حسین تھی۔'' اقبال نے لکھا۔ ''مجھے دیانت داری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حُسن نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سخت اثر کیا لیکن جب اُس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔''

بحیرۂ روم

16

بحیرۂ روم کی خوش گوار آب و ہوا مشہور ہے۔ جزیروں سے پٹے ہوئے سمندر میں پہنچتے ہی اقبال کی طبیعت نہال ہو گئی۔ سامنے افق سے ذرا پرے یورپ کے مختلف ممالک تھے، جو اب قریب آتے جا رہے تھے۔

ایک طرف سسلی تھا عربی میں جسے صقلیہ کہتے تھے۔ کبھی یہ عربوں کی تہذیب کا گہوارہ تھا مگر اب عرصے سے اٹلی کے قبضے میں تھا۔ ممکن ہے اقبال نے تہذیبِ حجازی کے اس مزار کے بارے میں بھی تاثرات لکھے ہوں مگر ابھی وہ دل پر نہیں صرف کاغذ پر درج ہوئے ہوں گے کیونکہ کاغذ گم ہونے پر یاد نہ آ سکے۔

اٹلی کے جزیرے جو سامنے نظر آ رہے تھے ایک بڑے انقلاب سے دوچار ہونے کے بعد تیس پینتیس برس پہلے ہی متحد ہوئے تھے اور اس اتحاد میں مزینی اور اس کے ساتھیوں کا بڑا ہاتھ تھا جنہوں نے تلوار اور قلم دونوں کی قوتیں جمع کر کے اپنی قوم کو یورپ

کی دوسری اقوام کے برابر لا کھڑا کیا تھا۔

''سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے،'' اقبال نے لکھا۔ ''میری طبیعت قدرتاً شعر پر مائل ہو گئی...''

غزل

مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں
نماز ادا یہی ہم صبح و شام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ؟
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں
جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبالؔ
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

غزل میں ۱۴ شعر تھے۔'

جہاز چھ روز بحیرۂ روم میں رہا۔ سمندر کا آخری حصہ بہت طوفانی تھا چنانچہ جہاز کے کپتان نے احتیاطاً ایک محفوظ راستہ اختیار کیا جو اصل راستے سے زیادہ لمبا تھا۔

مارسیلز

17

۲۳ ستمبر کی صبح مارسیلز پہنچ کر اقبال نے پہلی دفعہ یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا۔

وہ راستے میں دیکھ آئے تھے کہ ہندوستان سے پورٹ سعید تک تمام علاقے یا تو براہِ راست یورپی اقوام کے تصرف میں تھے یا بالواسطہ اُن پر یورپ کی عملداری قائم تھی۔ اب وہ خود اُس چھوٹے سے برِ اعظم کے کنارے پر کھڑے تھے جہاں کے رہنے والوں نے یہ سب کرشمے دکھائے تھے۔

یہاں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ ملا جس کی وجہ سے بندرگاہ کی سیر کرنے کا موقع پایا۔

''مارسیلز کا نوٹر ڈام گرجا نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم و فنون کی محرک ہوئی ہے۔'' ایک عمارت دیکھ کر تمام علوم و فنون کے بارے میں فیصلہ دے دینا عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر یہ اُس زمانے میں اُردو انشا پردازی کا عام انداز تھا۔ البتہ بنیادی خیال جو یہاں ظاہر ہوا تھا وہ اقبال کی اُس سوچ سے منسلک تھا جو مضمون 'قومی زندگی' میں بھی ظاہر ہو چکی تھی یعنی تاثیرِ نبوت زندگی کے تمام شعبوں پر عمل کرتی ہے۔

مارسیلز سے وہ گاڑی میں روانہ ہوئے اور رات کے اندھیرے میں بھی گاڑی کے اِدھر اُدھر آنے والی کھیتیوں سے فرانسیسی لوگوں کے نفیس مذاق کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

ڈوور

18

۲۴ ستمبر کو اقبال برٹش چینل عبور کر کے ڈوور پہنچے۔ اندھیری رات میں اس ساحل پر

لہروں کے ٹکرانے کی آوازوں کے حوالے سے مشہور شاعر میتھو آرنلڈ نے مذہبی عقاید سے خالی دنیا کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کی تھی:

And we are here as on a darkling plain
Swept wth confused alarms of struggle and flight,
Where ignorant armies clash by night.

بہر حال وہ ڈوور میں نہ ٹھہرے اور سیدھے لندن روانہ ہو گئے۔

لندن

19

۱۹۰۵ء کا لندن دلچسپ جگہ تھی۔

موٹر کاروں کا رواج نیا نیا شروع ہوا تھا۔ رولز رائس کمپنی اُسی برس وجود میں آئی تھی۔ سڑکوں پر ابھی گھوڑا گاڑیاں زیادہ تھیں اور ٹریفک سگنل کا تصور موجود نہیں تھا۔ ایمبولنس کے لیے بھی گھوڑا گاڑیاں ہی استعمال ہوتی تھیں۔ شہر میں چلنے والی ریل گاڑیوں کے لیے نئی طرز کے زیرِ زمین راستے بھی اُسی برس وجود میں آئے تھے اور 'انڈر گراؤنڈ' کی بجائے 'ٹیوب' کے نام سے زیادہ مشہور ہو رہے تھے۔

یہ وہ قوم تھی جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اور جس کے رہنما تقدیر کے فیصلوں پر مہر لگاتے تھے۔ ہندوستان میں انگریز مغرور ہی کیوں نہ نظر آتے ہوں مگر ان کی اصل طاقت جمہوریت سے تھی اور انگلستان آتے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ دو تین سو سال کے سیاسی تجربات نے شخصی آزادی کا احترام پیدا کر دیا تھا۔

عورتوں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہ تھی بلکہ یہ حق مانگنا جرم تھا۔ اقبال عورت اور مرد کی برابری کے قائل نہیں تھے لہٰذا اس تحریک کے بارے میں اُن کی رائے وہی تھی جو ہر

زمانے میں عورتوں کی کسی بھی عام یا خاص آزادی کے بارے میں اکثر مردوں کی ہوتی ہے یعنی اگر یہ آزادی دے دی گئی تو تہذیب پر برا اثر پڑے گا۔

انگریزوں کے بارے میں اقبال نے یہ تاثر قائم کیا کہ ''جو قوم خود آزدی کی دلدادہ ہو وہ اوروں کی آزادی کو رشک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی۔''

لندن میں شیخ عبدالقادر اقبال کے منتظر تھے۔ عبدالقادر کی ''باریک نگاہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہو گئے،'' اقبال نے لکھا۔

جس کاغذ پر اقبال سفر کے نوٹ لکھتے آئے تھے اور وہ کاغذ بھی جس پر پورٹ سعید سے نئے عربی الفاظ درج کیے تھے کہیں گم ہو چکے تھے۔

باب ۴

تثلیث کا مدرسہ

ستمبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۷ء تک

پہلا حصہ

1

بیسویں صدی میں دنیا جن انقلابات سے دوچار ہونے والی تھی اُن کے آثار ابھی نمایاں نہیں ہوئے تھے مگر کسی کو مستقبل کا علم ہوتا تو اُسے وہ معمولی واقعات دلچسپ نظر آتے جن کی اہمیت سے اُس وقت کوئی واقف نہیں تھا۔

مثال کے طور پر جرمنی میں زیورخ یونیورسٹی کا سینتالیس سالہ پروفیسر میکس پلانک روشنی کے بارے میں اپنے خیالات مرتب کر رہا تھا جنہیں وہ کوانٹم تھیوری کہتا تھا اور جو ابھی مقبول نہیں ہوئی تھی۔ اِسی پروفیسر کی نگرانی میں اُس برس ایک نوجوان نے فزکس میں ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی جس کے اسکول کے زمانے میں اساتذہ اُس سے ہمیشہ مایوس رہے تھے اور اب بھی اُس کے خیالات کو سمجھنا مشکل تھا کیونکہ وہ سائنس میں بھی ایک وجدانی شعور کی ضرورت پر زور دیتا تھا اور اپنے نظریات کو بہت زیادہ تمہید کے بغیر پیش کر کے توقع رکھتا تھا کہ اُنہیں سمجھ لیا جائے گا۔

اب تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی اور خاص طور پر اُس کا تازہ مقالہ تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا جس میں حرکت کے متعلق relativity یعنی اضافیت کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ نوجوان کا نام البرٹ آئن اسٹائن تھا۔

2

۲۴ ستمبر لندن میں اقبال کی پہلی صبح تھی اور اتوار کا دن تھا۔ اُنہوں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی مصروفیات کا آغاز کر دیا۔ دفاتر بند تھے لہٰذا ان مصروفیات کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ممکن ہے آرنلڈ سے ملنے گئے ہوں جو مبلڈن میں رہتے تھے اور لندن یونیورسٹی میں عربی پڑھاتے تھے۔ خیال ہے کہ جہاز پر لکھی ہوئی غزل بھی انہوں نے لندن پہنچتے ہی دکن ریویو میں چھپنے کے لیے روانہ کر دی۔ البتہ سفر کے نوٹس گم ہونے کی وجہ سے مولوی انشاء اللہ خاں کے لیے سفرنامے کی دوسری قسط ابھی نہ لکھ سکے اور کیمبرج روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے ۱۷ پرتگال پلیس میں رہائش اختیار کی۔ غالباً پے اِنگ گیسٹ تھے۔

کیمبرج سے اقبال کو بی اے کی نئی ڈگری حاصل کرنی تھی مگر چونکہ لاہور سے ایم اے کر چکے لہٰذا انہیں ایڈوانسڈ اسٹوڈنٹ کی رعایت مل سکتی تھی یعنی باقاعدہ کلاسوں میں حاضر ہونے کی بجائے صرف تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈیڑھ سال میں ڈگری حاصل کر لیں۔

اس کے بعد پی ایچ ڈی کسی جرمن یونیورسٹی سے کرنی تھی کیونکہ کیمبرج میں ابھی اس کے قواعد مرتب نہ ہوئے تھے۔ طلبہ عام طور پر ہائیڈل برگ یا میونک جاتے تھے۔

3

ٹرنٹی کالج کیمبرج میں سب سے بڑا کالج تھا۔ اِسے ہنری ہشتم نے ۱۵۴۶ء میں قائم کیا تھا اور ۱۶۹۰ء میں انگلستان کے سب سے مشہور معمار سر کرسٹوفر رین نے اِس کی دلکش لائبریری کی عمارت بنائی تھی۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کو یہاں میٹریکولیشن کی تقریب (Matriculation Ceremony) ادا کی گئی جس میں ہر طالبِ علم لائبریری میں رکھے ہوئے رجسٹر داخلہ میں اپنے کوائف درج کرتا تھا۔ کلرک نے اُن کا نام Mohammed Iqbal لکھ کر رجسٹر اُن کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے محمد کے آخر میں e کو a سے بدلا مگر 'اقبال' کے

ہجے درست نہیں کیے۔ تاریخ پیدائش محرم ۱۸۷۶ء غالباً اپنے اندازے سے درج کی۔ٹیوٹر کا نام پروفیسر سج وک لکھا جو علم حیوانیات کے پروفیسر تھے۔یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ ٹیوٹر کا کام صرف طالب علم کے رہن سہن کے مسائل میں مشورہ دینا تھا۔

لائبریری میں اقبال کے محبوب شاعر بائرن کا مجسمہ نصب تھا۔ملٹن کی کھوئی ہوئی جنت یعنی *Paradise Lost* کا اصل مسودہ بھی موجود تھا۔کھڑکی سے باہر کیم ندی کا دلکش منظر دیکھا جاسکتا تھا جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کشتی چلایا کرتے تھے۔[۲]

4

کیمبرج میں کئی فلسفی اور عالم جمع تھے۔میک ٹیگرٹ ہیگل کے فلسفے پر سند مانے جاتے تھے۔اُن کے علاوہ وائٹ ہیڈ، وٹگن اسٹائن، جارج مور اور برٹرینڈ رسل بھی ان دنوں کیمبرج میں تھے۔

مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن بھی یہاں تھے جنہوں نے رومی اور دوسرے فارسی شاعروں کے کلام کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔۱۸۹۳ء میں وہ ٹرنٹی کالج کے فیلو منتخب ہوئے تھے۔جس تھیسس کی بنیاد پر یہ تقرر ہوا تھا وہ مولانا روم کی شاعری کے انتخاب اور تبصرے پر مشتمل تھا۔پانچ برس بعد انہوں نے رومی کے دیوانِ شمس تبریز کا انگریزی ترجمہ بھی کردیا:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر

ایک اور استاد پروفیسر ای جی براؤن تھے جو فارسی ادب کی تاریخ لکھ رہے تھے۔بہائی تحریک کا بغور مطالعہ کیا تھا جس کا تعلق اقبال کے موضوع سے بھی تھا۔شاید انہی کے کہنے پر اقبال نے حافظ شیرازی پر مرزا محمد دارابی کی تصنیف دیکھی ہو جو حال ہی میں تہران سے شائع ہوئی تھی اور جس میں حافظ پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا۔

مشہور ہندوستانی عالم سید علی بلگرامی بھی اپنے اہل و عیال سمیت کیمبرج میں مقیم

تھے۔نوجوان طلبہ اُن کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اقبال بھی وہاں جانے لگے۔

5

کیمبرج میں میاں شاہنواز بھی موجود تھے۔یہ لاہور کے مشہور میاں خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ دین ہمایوں کے رشتہ دار تھے۔اس لحاظ سے شاید پہلے سے اقبال کے واقف رہے ہوں مگر کیمبرج میں یہ دوستی زیادہ مضبوط ہوگئی۔[۳]

6

اکتوبر کے مخزن میں اقبال کی نظم 'التجائے مسافر' شائع ہوئی۔

7

کسی مذہب کے بارے میں ایک آزاد طالبِ علم کا رویہ اُس مذہب کے بانی یا مبلغ کے رویے سے مختلف ہوتا ہے، اقبال کا خیال تھا۔ایک آزاد طالبِ علم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس مذہب کے مختلف اجزا کا جائزہ لے کر یہ دیکھے کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل نظام ترتیب دیتے ہیں۔

ہر مذہب انسان اور کائنات کے بارے میں کسی خاص تصور پر قائم ہوتا ہے۔ مثلاً عیسائیت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان گناہگار ہے۔یہی وجہ ہے کہ عیسائیت میں ایک مسیحا کی بنیادی اہمیت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے گناہوں سے مغفرت حاصل کرے۔اسی طرح بدھ مت کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ دنیا بہت تکلیف دِہ جگہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ بدھ مت میں اپنی زندگی کی شمع کو ہمیشہ کے لیے بجھا دینا بنیادی مقصد قرار پاتا ہے۔

کائنات کے بارے میں وہ کون سا تصور ہے جس پر اسلام کی بنیاد ہے؟[۴]

8

میک ٹیگرٹ کے نزدیک ego یعنی انا، خودی یا 'میں' ہی کائنات کی حتمی سچائی تھی۔ انا ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ موت کے بعد بھی باقی رہتی تھی۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بات وقت میں رہتے ہوئے نہیں سمجھی جاسکتی تھی کیونکہ اس کے لیے ابدیت کی ضرورت تھی۔

انا کی حقیقت عمل کے ذریعے نہیں بلکہ محبت کے ذریعے سمجھی جاسکتی تھی۔ محبت کسی کے قریب آنے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محبت ہی کی وجہ سے کوئی قریب آتا ہے۔ محبت موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک کے دوسرے سے محبت کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے مگر یہ ساری محبتیں مل کر کائنات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

9

میک ٹیگرٹ کے نزدیک خدا کا وجود ممکن نہیں تھا۔ محبت ہی دنیا کی ابدی سچائی تھی۔ یہ دو اناؤں کو قریب لاسکتی تھی مگر ایک انا دوسرے کے ساتھ یکجا نہیں ہوسکتی تھی۔ وصال میں بھی محبت کرنے والے دو ہی رہتے تھے ایک نہیں ہوجاتے تھے۔ اگر خدا کا وجود تسلیم کیا جاتا تو پھر ماننا پڑتا کہ وہ ایک ایسی انا ہے جس میں باقی تمام انائیں شامل ہیں۔

''ٹرنٹی کالج میں اُن کے کمرے میں تقریباً ہر روز میری اُن کے ساتھ ملاقات ہوتی تھی،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''اکثر ہماری گفتگو کا رخ خدا کے موضوع کی طرف پھر جاتا تھا۔ ان کی طاقتور منطق اکثر مجھے خاموش کردیتی تھی مگر وہ مجھے کبھی قائل نہ کرسکے۔''[۵]

10

ہر انا بہت سی اناؤں کا مجموعہ ہوتی ہے، چنانچہ ایک ایسی انا کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے جو باقی تمام اناؤں پر محیط ہو۔ کائنات کی ہر انا جس کا حصہ ہو۔

اُن دنوں اقبال کا یہی خیال تھا۔

11

''ایک دعوت میں ہمیں ایک صاحب سے ملاقات کا اتفاق ہوا جو صرف سطحِ بحر کی مخلوقات کے پروفیسر تھے،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''انہوں نے اپنے فن سے متعلق عجیب وغریب انکشافات فرمائے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ سمندر کی سطح پر رہنے والے جانداروں کی انواع واقسام اوران کے احوال وکوائف بیحد دلچسپ اوراہم ہیں۔ مجھ پر اُن کی تقریر سے سحر ہورہا تھا۔''

اقبال جس خیال سے متاثر ہورہے تھے وہ یہ تھا کہ کس طرح وہ چیزیں جو دوسروں کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتیں ایک ماہرِ علم کے لیے تہ درتہ کھلتی چلی جاتی ہیں۔[1]

12

شبلی نعمانی کا مسئلہ یہ تھا کہ ہر نئی جگہ پہلے بہت سے دوست اور پھر بے شمار دشمن بنا لیتے تھے۔ آخر ناراض ہوکر وہاں سے رخصت ہوجاتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی یہی ہوا اور وہاں سے لکھنؤ واپس آکر انہوں نے ندوۃ العلماٗ کا اہتمام سنبھال لیا۔

یہ ادارہ پرانے مزاج کے مولویوں نے جدید تعلیم کی روک تھام کے لیے بنایا تھا۔ شبلی کے ذہن میں جدید اورقدیم کی جو آویزش چل رہی تھی اُس نے انہیں یقین دلایا کہ اب تعلیم کے میدان میں ان کا قد سرسید مرحوم سے اونچا ہوجائے گا مگر یہ خواب ہی خواب تھے۔

ندوہ کے نصاب میں علم الکلام، عربی ادب، جدید عربی زبان اورانگریزی کا اضافہ کیا گیا اورسمجھا گیا کہ اب وہ عالمِ دین پیدا ہونے لگیں گے جو نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں گے مگرانگریزی کی تعلیم کا یہ حال تھا کہ کم سن مولوی اے بی سی ڈی سے آگے بڑھتے نظر نہ آتے تھے کیونکہ اساتذہ ہی میں اس سے زیادہ اہلیت نہ تھی!

خود شبلی جتنے بڑے مصنف تھے ویسے اُستاد نہ ہوئے مگر یہ خوبی ضرورتھی کہ جن طلبہ پر مہربان ہوتے تھے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔ ایسے طلبہ دو ہی چار تھے۔

عبدالسلام، مسعود علی اور سید سلیمان۔ ندوۃ العلماٗ کی رعایت سے یہ بھی اپنے ناموں کے آگے ندوی لکھتے تھے، عبدالسلام ندوی، مسعود علی ندوی، سید سلیمان ندوی۔

لکھنؤ میں شبلی کا اصل ہنر اُس تحقیقی رسالے میں ظاہر ہوا جس کا نام الندوۃ تھا اور جو دارالعلوم سے خاص علماٗ کے لیے شائع ہوتا تھا۔ اِس کی ادارت میں شبلی کے ساتھ نواب حبیب الرحمٰن شیروانی کا نام بھی لکھا ہوتا تھا مگر سارا کام شبلی ہی کرتے تھے۔

13

کلکتہ کے نوجوان محی الدین احمد، جن کا قلمی نام ابوالکلام آزاد تھا، شبلی نعمانی کے کہنے پر لکھنؤ آ کر الندوۃ کی ادارت میں ہاتھ بٹانے لگے۔ عمر سترہ برس تھی۔ والد صاحب گدی نشین پیر تھے۔ بچپن ہی سے ایسی مشق کروائی تھی کہ ذہن میں کئی خانے بن گئے تھے جن میں مذہب، فلسفہ، شعروادب اور سیاست الگ الگ رکھی ہوئی تھیں۔

شبلی انہیں خاص طور پر پسند کرتے تھے۔ ہر روز صبح چار بجے آزاد اُن کے کمرے میں پہنچ جاتے تھے اور چائے کے ساتھ بہت سے علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔

14

۱۶ اکتوبر کو سنڈیکیٹ بلڈنگ میں میٹنگ ہوئی جس کی صدارت پروفیسر سورلے نے کی۔ پروفیسر میک ٹیگرٹ، پروفیسر وارڈ اور دو اور صاحبان بھی میٹنگ میں شریک تھے۔ منٹ نمبر ۲ کے مطابق اقبال کے تحقیقی مقالے کی تجویز منظور ہوئی اور میک ٹیگرٹ کو اس کی رہنمائی کے لیے مقرر کیا گیا۔ مقالے کا عنوان تھا:[۴]

The Genesis and Development of Meta-Conceptions in Persia

اقبال کے تحقیقی مقالے کا بنیادی خاکہ یوں تھا:[۸]

پہلا باب، فارسی ثنویت کے بارے میں یعنی ایران میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے جو روشنی اور تاریکی کو اس کائنات کی دو قوتوں کے طور پر خدا کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔

دوسرا باب، ایران کی فتح کے بعد مسلمانوں میں جو نوافلاطونی فلسفی گزرے ان کے بارے میں یعنی فارابی، ابن مسکویہ اور بوعلی سینا۔

تیسرا باب، اسلامی عقلیت پسندی کا دَور یعنی یونانی اور ایرانی فلسفہ کی امیزش سے جو عقلیت پسند فرقہ معتزلہ پیدا ہوا تھا اُس کا عروج و زوال۔ اس کے ردِعمل میں جو اسمٰعیلیہ اور اشاعرہ فرقے وجود میں آئے اُن کا ذکر بھی اس باب میں ہونا تھا۔

چوتھا باب، تصوف کے بارے میں۔ اس میں مشہور مسلمان فلسفیوں کے عقاید و افکار کا جائزہ پیش ہونا تھا۔

پانچواں باب، آخری دَور کے ایرانی فلسفے کے بارے میں لکھا جانا تھا۔

یہ ممکن نہ تھا کہ اس مختصر عرصہ میں وہ تمام فلسفیوں کے افکار کا خلاصہ پیش کر دیتے جو ایران نے ڈھائی ہزار سال میں پیش کیے تھے مگر وہ ان افکار کا خاکہ ضرور مرتب کر سکتے تھے جس کے مطابق بعد میں وہ خود یا کوئی اور ایک مفصل تاریخ مرتب کر سکے۔

دشواری یہ تھی کہ اقبال پہلی دفعہ اسلامی فکر کو جدید فلسفے کی اصطلاحات میں بیان کرنے جا رہے تھے چنانچہ تقریباً تمام کام عربی اور فارسی ماخذوں کی مدد سے کرنا تھا جن میں سے اکثر نایاب تھے۔ انڈیا آفس لائبریری، رائل لائبریری اور برٹش میوزیم میں سولہ مخطوطے اقبال کے مقالے میں براہِ راست کام آ سکتے تھے۔ ان میں برٹش میوزیم میں پڑا ہوا بوعلی سینا کی تحریروں کا کلیات بھی شامل تھا۔[۹]

مسلمانوں کی کیسی بدنصیبی تھی کہ یہ کتابیں جو اُن کے آباواجداد کے علم و تحقیق کا حاصل تھیں یورپ کے کتب خانوں میں تو دیکھی جا سکتی تھیں مگر مسلمان ممالک میں اکثر

ناپید تھیں۔

شاید اقبال کو غنی کاشمیری کا وہ شعر یاد آیا ہو جس میں حضرت یعقوبؑ کے حوالے سے ایک بات کہی گئی تھی۔ مشہور ہے کہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے کی جدائی میں روتے روتے نابینا ہو گئے تھے۔ غنی نے کہا کہ اُن کی قسمت کا اندھیر دیکھو کہ اُن کی آنکھوں کے نُور سے زلیخا اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہیں:[۱۰]

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

16

۱۹۰۵ء کے اواخر میں جب ابھی انگلستان میں بھی عورتوں کی برابری کا تصور عام نہ ہو سکا تھا شبلی نے ہمت کر کے ایک مضمون گیارہویں صدی کے مشہور عالم ابن حزم کے بارے میں تحریر کیا جن کے خیال میں عورتیں نہ صرف مردوں کے برابر ہوتی تھیں بلکہ اگر قرآن شریف کو غور سے پڑھا جائے تو وہاں بی بی سارہ، والدۂ حضرت موسیٰ اور بی بی مریم کو بھی نبی قرار دیا گیا تھا۔ اِس سلسلے میں جتنے اعتراضات ایک عام قاری کے ذہن میں آ سکتے تھے اُن کا جواب ابن حزم کئی سو سال پہلے دے گئے تھے۔

''علامہ موصوف کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے،'' شبلی نے لکھا۔"

یہ درست تھا مگر دوسری طرف پرانے زمانے کے لوگوں کے ہم خیال بھی نئے زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ابھی تک موجود تھے۔ ان میں ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔ دکن ریویو کے اِسلام نمبر میں کسی مولوی محمد اختر صاحب کا اسلام میں عورت کے مرتبے پر مضمون شائع ہوا تو ظفر علی خاں نے لکھا کہ زندگی کے بعض کارنامے صرف مردوں کا حصہ ہیں اور اگر عورتوں کو برابر سمجھ لیا گیا تو وہ صورت حال پیش آئے گی جس کا

ذکر اکبر الہ آبادی نے یوں کیا ہے کہ:

جس کو بیٹا وہ سمجھتے تھے بھتیجا نکلا

پردہ اٹھ جانے کا آخر یہ نتیجہ نکلا

سچ ہے کہ عورت کو آدھے انسان کی بجائے پورا انسان سمجھنے میں ذہن کے چھپے ہوئے باریک ترین خوف سامنے آتے ہیں مگر ابنِ حزم اور شبلی جیسا دل و دماغ کم ہوتا ہے۔ بہت لوگ اپنی جنسی اَنا کو مذہبی شعور سمجھ بیٹھتے ہیں۔[۱۲]

17

۱۴ اکتوبر کو برطانیہ میں ووٹ کا حق مانگنے والی خواتین میں سے دو رضا کاروں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا اور عدالت نے انہیں بالترتیب سات روز اور تین روز قید کی سزا سنائی۔

ممکن ہے اِس واقعے پر اقبال اور میک ٹیگرٹ کے درمیان گفتگو ہوئی ہو اور یہ معلوم کر کے اقبال حیران رہ گئے ہوں کہ میک ٹیگرٹ عورتوں کو ووٹ دینے کے حق میں ہیں۔

18

کوئی اسٹیڈ صاحب تھے۔ ان کی دعوت میں اقبال بھی مدعو تھے۔

اسٹیڈ صاحب مسلمانوں کی جنت میں حوروں کے تصور پر اعتراض کر رہے تھے۔ اتفاق سے اُسی وقت کہیں سے تار آیا جس میں انہیں ایک جلسے کی صدارت کے لیے بلایا گیا تھا مگر جلسے میں کسی عورت کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسٹیڈ نے اُسی وقت جواب لکھا، "No woman, no Stead" اور اقبال کو بھی پڑھ کر سنایا۔

''میں نے اُسی جواب کو لے کر اس کے جنت والے اعتراضات کا جواب دے دیا،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''کہنے لگا تم مشرقی لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہو۔''[۱۳]

19

۱۶ اکتوبر کو لاہور میں مولوی انشاءاللہ خان کے اخبار وطن میں اقبال کے سفرنامے کا پہلا حصہ شائع ہوا۔

اُسی روز بنگال تقسیم ہوا اور کانگریس کے کہنے پر اس صوبے میں یومِ سیاہ منایا گیا۔

20

اگرچہ اقبال کے مقالے میں تصوف کا ذکر چوتھے باب میں تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق کی ابتدا اسی موضوع سے کی۔ ممکن ہے وہ جاننا چاہتے ہوں کہ وہ خود جن عقاید پر اب تک قائم رہے تھے اُن کا اسلام کے ساتھ کتنا تعلق ہے اور کس حد تک وہ عقائد ایرانی فلسفہ سے ماخوذ ہیں۔

از کیمبرج ٹرینٹی کالج

۱۸ اکتوبر ۱۹۰۵ء

اسرارِ قدیم سیّد حسن نظامی

ایک خط اس سے پہلے ارسال کر چکا ہوں۔ امید ہے کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہو گا۔ اُس خط کے جواب کا انتظار ہے اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اب ایک تکلیف اور دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں اُن کا پتہ دیجیے۔ سپارہ اور رکوع کا پتا لکھیے۔ اِس بارہ میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے...

اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں۔ اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے

تعلق ہے؟ کیا حضرت علی مرتضےٰ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر میں مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں مگر جواب جلد آئے۔ باقی خیریت ہے۔

اقبال

پورٹ سعید سے اقبال نے حسن نظامی اور دوسرے دوستوں کو جو خط بھیجے تھے اُن میں سے کسی کی رسید ابھی تک نہیں ملی تھی۔ معلوم نہیں حسن نظامی نے اب بھی انہیں مطلوبہ مواد بھیجا یا نہیں مگر شاید انہی دنوں اُن کی طرف سے رسالہ احسان کے دو شمارے اقبال کو موصول ہوئے۔ یہ رسالہ تصوف کے بارے میں تھا جسے حسن نظامی نے جاری کیا تھا۔

''کس قدر تغیر ہے!'' اقبال نے لکھا۔ ''ایک وہ زمانہ تھا کہ اس مضمون پر بات کرنا خلافِ اصولِ طریقت تھا۔ اب یہ زمانہ ہے کہ ماہوار رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اس کی ضرورت ہے اور سخت ضرورت ہے۔''[۱۴]

21

اکبرالٰہ آبادی کا کلام اب مخزن میں بھی شائع ہونے لگا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ اُس زمانے میں اقبال نے اس کا کیا اثر لیا۔ بظاہر انگلستان پہنچ کر وہ ایک ایسے دور سے گزر رہے تھے جب ان کی نظر میں مغربی زندگی کی بعض چیزوں کو اپنانا ضروری تھا۔ ''مغربی خیالات اور تعلیم کی اشاعت سے اب ہماری ضرورتوں کا حاطہ وسیع ہو گیا ہے،'' ان کا کہنا تھا۔ ''اس میں سے بعض ضرورتیں اس قسم کی ہیں کہ سر دست ہمارا اپنا ملک اُن کو پورا نہیں کر سکتا۔''[۱۵]

اکبر کے لڑکے سید عشرت حسین بھی کیمبرج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر اُن کی دلچسپی دوسری چیزوں میں زیادہ تھی۔ اکبر ایک دفعہ یہاں تک لکھ کر بھجوا چکے تھے:

عشرتی! گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا، عہدِ وفا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

22

۲۱ اکتوبر کو اقبال نے کیمبرج سے میٹرکولیشن کی سند حاصل کی۔ کسی رسمی کاروائی کے لیے ضرورت رہی ہوگی۔

23

اکتوبر کے کسی ہفتے یا نومبر کے شروع میں وہ کیمبرج سے واپس لندن آئے۔
۶ نومبر کو انہوں نے لنکنز ان میں داخلہ لیا تاکہ بیرسٹری کی سند حاصل کر سکیں۔ فیس آٹھ پونڈ بارہ شلنگ تھی۔ اُنہوں نے پچاس پونڈ کی رقم جمع کروائی اور غالباً کسی فارم پر اپنے کوائف لکھ کر داخلہ کلرک کے حوالے کیے۔ چونکہ وہ انگریزی میں اپنے والد کا نام لکھتے ہوئے اُس کے حروف کو کھینچنے کے عادی تھے لہٰذا کلرک نے نور محمد کو میر محمد پڑھا اور نمبر ۶۹ کے سامنے اقبال کے کوائف درج کرتے ہوئے ولدیت میں اسی طرح لکھا۔

24

''جب اقبال لندن آتے تو بیرسٹری کے لیکچروں یا کھانوں کے لیے ہم دونوں مل کر جاتے،'' شیخ عبدالقادر کا بیان ہے۔ ''بعض علمی مجالس میں بھی اکٹھے شریک ہوتے

تھے۔ ہمارے بعض احباب بھی ساتھ تھے مگر اقبال کی طبیعت کی دو عادتیں وہاں زیادہ نمایاں ہو جاتی تھیں۔ ایک تو ان کی کم آمیزی جس کا اشارہ انہوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ بہت سے دوست نہیں بناتے تھے۔ دوسری عادت نقل و حرکت میں تساہل و تکاہل تھی۔ وہ کئی دفعہ کسی جگہ جانے کا وعدہ کرتے تھے اور پھر کہتے تھے۔ 'بھئی کون جائے۔ اس وقت تو کپڑے پہننے یا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا۔' ہم انہیں ہنسی سے 'قطب از جا نمی جنبد' کی کہاوت سنایا کرتے تھے۔''

شیخ عبدالقادر کے مطابق لندن میں عورتوں اور مردوں کے آزادانہ ملنے جلنے سے اقبال بھی محظوظ ہوئے۔[۱۶]

25

اقبال کے کسی ملنے والے ہندوستانی طالب علم نے اُن سے اپنی پریشانی بیان کی۔ اُس کی ایک انگریز خاتون سے دوستی تھی جس نے اُس کی کسی چیز کی تعریف کی تو اس نے وہ چیز اُسے پیش کرتے ہوئے کہا، ''یہ میرے کسی کام کی نہیں۔'' وہ خاتون یہ سن کر بہت ناراض ہوئی۔

اقبال اس ہندوستانی طالبِ علم کی طرف سے انگریز خاتون کے پاس گئے اور اسے سمجھایا کہ مشرق میں کسی کو تحفہ دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تحفہ لینے والے کو یہ احساس نہ ہونے دیا جائے کہ اس پر کوئی احسان کیا جا رہا ہے۔ بات انگریز خاتون کی سمجھ میں آ گئی۔[۱۷]

26

نومبر میں مخزن میں اقبال کی نظم 'کنارِ راوی' شائع ہوئی۔

دکن ریویو کا ستمبر کا شمارہ بھی دیر سے نومبر میں شائع ہوا جس میں اقبال کی غزل بھی شامل تھی۔

27

شیخ عبدالقادر کو اخبار وطن کے مدیر مولوی انشاء اللہ خاں کا خط موصول ہوا جس میں یہ شکایت تھی کہ اقبال نے اپنے سفرنامے کی دوسری قسط ابھی تک ارسال نہیں کی۔ شیخ عبدالقادر نے یہ شکایت اقبال تک پہنچا دی۔

28

برٹش میوزیم میں ابن سینا کا کلیات جو اقبال نے دیکھا تھا اُس میں عشق کے موضوع پر ایک نایاب تحریر بھی شامل تھی۔

ابنِ سینا کے نزدیک عشق کی تعریف یہ تھی کہ یہ حسن کی ستائش کا نام ہے۔ چنانچہ کائنات میں تین اقسام کی ہستیاں موجود ہیں۔ پہلی وہ جو حسن کے انتہائی کمال پر فائز ہیں۔ دوسری، جو حسن میں کمترین مقام پر پائی جاتی ہیں۔ تیسری ان دو انتہائی مقامات کے درمیان ہیں مگر یہ کوئی علیحدہ قسم نہیں ہے کیونکہ تمام چیزیں یا تو حسن کے کمال پر پہنچ چکی ہوتی ہیں یا پہنچ رہی ہوتی ہیں۔

حسن یا کمالِ ہستی تک پہنچنے کی اِسی خواہش کا نام عشق ہے۔ چیزوں کے ظاہری ارتقا کے پیچھے عشق کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ عشق کائنات کی ہر چیز میں جدّ و جہد، حرکت اور عمل پیدا کرتا ہے۔

میک ٹیگرٹ کے نزدیک علم کا سرچشمہ عمل نہیں محبت تھی۔ مگر محبت کی فطرت میں عمل بھی تو شامل تھا!

محبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا

نہ واقف تھا ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے
سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دِلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکّب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا

گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

29

اقبال کی ایک اور نظم جو کہیں شائع نہ ہوئی وہ بھی شاید اُسی زمانے میں کہی گئی ہو۔ اس کا نام 'عورت' تھا اور جس طرح پچھلی نظم میں محبت کا فارمولا بتایا تھا اُسی طرح اس نظم میں عورت کے اجزائے ترکیبی بیان کیے تھے۔ اُن میں سے خاص خاص یہ تھے: چاند کی گولائی، سانپ کا پیچ وخم، گھاس کی پتی کی ہلکی تھرتھراہٹ، بیدِ مجنوں کی نزاکت، مور کا بانکپن، پہاڑی پھول کی نرمی، چینی ہرن کی آنکھیں، بادل کے آنسو اور اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ۔

ممکن ہے اُن دنوں عورتوں کی برابری کی جو تحریک چل رہی تھی اُس کے جذباتی ردِ عمل کے طور پر یہ نظم وارد ہوئی ہو جس میں عورت کو خالصتاً مرد کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا تھا۔[۱۸]

30

۲۴ نومبر کو اقبال نے مولوی انشأ اللہ خاں کے نام ایک پرائیویٹ خط تحریر کیا اور اگلے روز اپنے سفرنامے کی دوسری اور آخری قسط قلم بند کرتے ہوئے لکھا، ''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سویز پہنچ کر دوسرا خط لکھوں گا مگر چونکہ عدن سے سویز تک کے حالات بہت مختصر تھے اِس واسطے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ لندن پہنچ کر مفصل واقعات عرض کروں گا۔ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر میں دورانِ سفر نوٹ لیتا جاتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وہ کاغذ کہیں کھو گیا...''

پچھلے روز والا پرائیویٹ خط بھی اِسی سفرنامے کے ساتھ روانہ کیا گیا۔

31

۵ دسمبر کو برطانیہ کی لبرل پارٹی کے رہنما سر ہنری کیمبل بینز مین نئے وزیراعظم بنے۔ کنزرویٹو پارٹی کے رہنما آرتھر بالفور نے ٹیرف بل کے مسئلے پر مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔

32

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس اس دفعہ علیگڑھ میں منعقد ہو رہا تھا۔ میر حسن اس میں شرکت کرنے گئے تو اپنے چھوٹے لڑکے ذکی کو ساتھ لے گئے۔
میر حسن کے سابقہ شاگرد اور اقبال کے مشن اسکول کے زمانے کے کلاس فیلو جگن ناتھ دہلی میں تھانیدار تھے۔ اُنہوں نے دہلی میں میر حسن اور ذکی کی خوب خاطر تواضع کی۔[19]

علی گڑھ کے اجلاس میں قریباً ایک ہزار ممبر اور ۳۲۷ وزیٹر شریک ہوئے۔ خان بہادر خلیفہ محمد حسین جو ریاست پٹیالہ کے وزیر تھے وہ صدارت کر رہے تھے۔ اُنہوں نے نواب محسن الملک مرحوم کو خراجِ تحسین پیش کیا، مسلمان لڑکوں میں سائنس کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور لڑکیوں کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا کہ ''اس زمانے میں کسی ذی فہم شخص کو اس امر سے انکار نہیں۔ اگر اس مسئلہ اشاعتِ تعلیمِ نسواں میں کچھ اختلاف ہے تو محض تعلیم دینے کے طریقوں کی نسبت ہے۔''
اجلاس میں تعلیمی مردم شماری کے علاوہ اس بات کے حق میں بھی قرارداد منظور ہوئی کہ صنعتی تعلیم کے لیے کانفرنس کے اہتمام سے طلبہ کو یورپ بھیجا جائے۔
اُن دنوں شاہِ برطانیہ ایڈورڈ ہفتم کے ولی عہد ہندوستان کا دورہ کرنے والے تھے۔ چنانچہ کانفرنس میں نظام حیدر آباد دکن کے قصیدے کے علاوہ ولی عہد سے وفاداری کے بارے میں مسدس پڑھی گئی:[20]

سیاحت کے لیے شہزادۂ ذی جاہ آتے ہیں
مبارک **ملک** کو فرزندِ شاہنشاہ آتے ہیں

دوسرا حصہ

33

آریاؤں کی وہ شاخ جو ایران کے میدانوں میں آباد ہوئی تھی بہت جلد تہذیب سے واقف ہوگئی اگرچہ اس کی ابتدائی تہذیب کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔

اقبال کے مقالے کا پہلا باب اِسی کھوئی ہوئی تہذیب کے ذہنی ارتقا کی جستجو تھی۔

اولین ایرانی دو گروہوں میں بٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ اندھیرا، ظلم، جھوٹ اور نفرت زندگی کی اصل قوتیں ہیں اور کائنات پر انہی کی حکومت ہے۔ ہر دن کا اختتام رات پر ہوتا ہے، تاریکی ہمیشہ غالب آتی ہے۔ یہ بد روحوں کی پُوجا بھی کرتے تھے۔

دوسری طرف ایک اور گروہ کے نزدیک روشنی، انصاف، سچّائی اور محبت میں اصل طاقت تھی۔ جب ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے تو پھر کیوں نہ کہا جائے کہ روشنی اندھیرے پر غالب آتی ہے! یہ گروہ اچھی روحوں کی پوجا کرتا تھا۔

ایران کے ان جھگڑتے ہوئے گروہوں کے درمیان ایک نیم تاریخی اور نیم دیو مالائی انسان نمودار ہوا جس کی فراست کی روشنی نے خیالات پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ پھر وہ ویسے نہ رہے جیسے اُس سے پہلے تھے۔ اس کا نام زرتشت تھا۔

زرتشت نے کہا، کائنات میں اچھائی کی قوتیں متفرق نہیں بلکہ وہ ایک ذاتِ واحد میں جمع ہیں۔ مختلف روحوں کی بجائے اُسی ایک ذات کی پرستش کرنی چاہیے۔ اُس کا نام اہورا مزدا ہے۔ برائی کا سرچشمہ بھی مختلف روحوں کی بجائے صرف ایک ہستی ہے جس کا نام اہرمن ہے۔ زرتشت نے کہا، لوگوں کو چاہیے کہ وہ اہرمن کے خلاف جنگ میں

اہورامزدا کا ساتھ دیں۔

اقبال ان تعلیمات کو جدید مابعد الطبیعات کے نظام کے تحت بیان کرنا چاہتے تھے جسے صرف تین بنیادی سوالوں سے تعلق ہوتا ہے، یعنی (۱) خدا کے وجود کو کس طرح سمجھا جائے؟ (۲) کائنات کیا ہے؟ اور (۳) رُوح کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ زرتشت کے اقوال جو قدیم ایرانی زبان ژند میں موجود تھے وہ کسی مربوط نظام کے تحت نہ لکھے گئے تھے بلکہ اُسی طرح بکھرے ہوئے تھے جس طرح خود ایرانی مزاج منتشر تھا۔ اقبال کوشش کر رہے تھے کہ ان بکھرے ہوئے خیالات میں سے اپنے تین سوالوں کے جواب اخذ کر سکیں اور چونکہ وہ ژند نہیں جانتے تھے لہٰذا انہیں دُوسرے مستشرقین کی کتابوں سے استفادہ کرنا تھا۔

جہاں تک خدا کے وجود کا تعلق ہے زرتشت کا کہنا تھا کہ خیر اور شر دو علیحدہ قوتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدائے بزرگ کی ہستی کے دو رُخ ہیں۔ ''اسی بنا پر ڈاکٹر ہاگ کہتا ہے کہ قدیم ایران کا یہ پیغمبر مذہبی اعتبار سے توحید پرست اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دُوئی پرست تھا،'' اقبال نے نوٹ کیا۔ ''مگر یہ کہنا کہ دو ایسی روحیں موجود ہیں جن میں سے ایک اچھائی کو جنم دیتی ہے اور دوسری برائی کو، اور پھر ان دونوں جڑواں روحوں کو ایک ہی برتر ہستی کے وجود میں سمونا یہ کہنے کے برابر ہے کہ اچھائی اور برائی کی جدّوجہد دراصل خدا کی اپنے آپ سے جنگ ہے۔ چنانچہ زرتشت نے مذہبی توحید اور فلسفیانہ دُوئی میں صلح کروانے کی جو کوشش کی اُس میں یہی بنیادی نقص تھا۔''

کائنات کیا ہے؟ زرتشت کی کائنات کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت، یعنی تمام اچھی تخلیقات کا مجموعہ جو اچھائی کی رُوح سے فیض حاصل کر رہا ہے، اور غیر حقیقت، جو برائی کی پیداوار ہے۔

اقبال نے لکھا، ''اچھائی اور بُرائی کی دو رُوحوں کی کشمکش کی جھلک ہمیں کائنات کی مختلف قوتوں کی آویزش میں نظر آتی ہے... پوری کائنات کی تاریخ انہی کی جنگ کی کہانی

ہے، اور بس! دوسری چیزوں کی طرح ہم بھی اس جنگ میں شریک ہیں اور ہمیں چاہیے کہ روشنی کے طرف دار بنیں جو آخر میں غالب آئے گی اور تاریکی کی رُوح کو بالکل ختم کر کے چھوڑے گی۔ یوں افلاطون کی طرح زرتشت کا نظریۂ کائنات بھی اخلاقیات تک پہنچتا ہے...

''رُوح کے متعلق زرتشت کا نظریہ کافی سادہ ہے۔ اُس کے نزدیک یہ خدا کے وجود کا حصہ نہیں ہے بلکہ اُس کی تخلیق ہے۔ یہ پیدا تو وقت میں ہوئی ہے مگر چاہے تو اِس دنیا کے میدانِ عمل میں برائی کے خلاف جدّ وجہد کر کے ابدی زندگی حاصل کر سکتی ہے۔ گویا وقت کی قید سے آزاد ہو سکتی ہے۔ ایسی رُوح جسم کی قید سے آزاد ہونے کے بعد کچھ خاص مرحلوں سے گزرتی ہے جن میں سے آخری مرحلہ 'ازلی عظمت' کا مرحلہ ہے جہاں رُوح اپنی انفرادی شخصیت کو ختم کیے بغیر نُور کی طاقت یعنی خدا کی ذات سے متحد ہو سکتی ہے۔''[۲]

34

جنوری ۱۹۰۶ء میں مخزن میں اقبال کی نظم 'محبت' شائع ہوئی۔

35

حلال گوشت کی فراہمی کا مسئلہ دوسرے مسلمان طلبہ کی طرح اقبال کو بھی پریشان کر رہا تھا۔ گائے کا گوشت تو خیر اُنہیں ہضم ہی نہیں ہوتا تھا، شاید اُن کے برہمن نسل ہونے کی وجہ سے، مگر بکرے اور مُرغی کے بغیر گزارہ نہ تھا اور ان کا حلال ہونا ضروری تھا۔ پروفیسر سَیج وِک کی مدد سے یا اُس کے بغیر کسی یہودی خاندان کے ساتھ ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا اور غالباً ۱۹۰۶ء میں کسی وقت وہ ۱۰ کاسل اسٹریٹ منتقل ہو گئے۔ عمارت کا نام ہنوور ہاؤس تھا۔

اِن ابتدائی دنوں میں وہ اپنے میزبانوں سے بہت قریب ہو گئے یہاں تک کہ جب

وہ عبادت کرتے تو یہ بھی یہ کہہ کر شریک ہو جاتے کہ حضرت موسیٰ ان کے بھی پیغمبر ہیں۔[22]

36

۱۹۰۶ء میں کسی وقت حافظ محمود شیرانی بھی لندن چلے آئے۔ اُن کی عمر چھبیس برس تھی اور راجستھان کی ریاست ٹونک سے تعلق تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اورینٹل کالج لاہور سے فارسی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا اور اب بیرسٹر بننا چاہتے تھے۔

اقبال، عبدالقادر اور آرنلڈ سے اِن کے مراسم اگر لاہور میں قائم نہیں ہوئے تھے تو اب ہو گئے۔[23]

37

دلی سے نذر محمد کا خط آیا۔ وہ صدمۂ عشق سے دوچار تھے یا کسی اور مشکل میں مبتلا تھے جسے اقبال نے عشق سے تشبیہ دے کر منظوم جواب لکھا جو معلوم نہیں نذر محمد کے کام آ سکتا تھا یا نہیں مگر اقبال کے بدلتے ہوئے خیالات کی ایک اہم کڑی ضرور ملتی ہے۔

جب ہر چیز میں خدا کا حسن ہے اور عشق کی منزل اپنا ہی دل ہے تو پھر ایک حسین کا پابند رہنا بھی ضروری نہیں:[24]

پیغامِ راز

پابندِ یک صنم نہ ہو، ہر لحظہ نو نیاز رہ
پوجا کو اس روش سے تو پیرہنِ نیاز دے
تارے میں وہ، قمر میں وہ، بجلی میں وہ، شفق میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے
رفعت ہے عجز میں نہاں، یعنی نیاز شعار کر

وہ محوِ ناز ہے اگر، تُو بھی جوابِ ناز دے
محفل جو تھی بدل گئی ساقی! تجھے خبر بھی ہے
اب نہ خدا کے واسطے اِن کو مئے مجاز دے
پیرِ مغاں فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر
اِس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تُو خانہ ساز دے

مخزن، فروری ۱۹۰۶ء

بارہ اشعار کی غزلِ مسلسل تھی۔ اس میں اقبال نے عروض کا ایک تجربہ کیا۔ کتابوں میں لکھا تھا کہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن یا مفاعلن یا مفعولن بھی لا سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے یہی کمال اس نظم میں دکھایا جو عروض کے لحاظ سے جائز تھا مگر نظم کی موزونیت اور ترنم پر اس کا اچھا اثر نہیں پڑا تھا۔

38

فروری میں برطانیہ میں عام انتخابات ہوئے اور ۷ فروری کو لبرل پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ ان کی جیت میں مزدور طبقے کی کوششوں کو بھی دخل تھا جس کی نمائندہ لیبر پارٹی کے چیرمین ریمزے میکڈونلڈ کے ساتھ لیبر پارٹی نے خفیہ معاہدہ کر لیا تھا۔

الیکشن کی مہم جو ایک مہینہ جاری رہی اُس میں خواتین نے بھرپور حصہ لیا جن کا مطالبہ ووٹ ڈالنے کا حق تھا۔

39

شاید پچھلے کسی زمانے میں موت کے بعد کی زندگی پر اتنی بحث نہیں ہوئی تھی جتنی اُس زمانے میں ہو رہی تھی۔ اس برس آرچی بالڈ کانسٹیبل لندن سے اس موضوع پر شائع ہونے والی بعض کتابیں اقبال کے مجموعے میں موجود ملتی ہیں اور ممکن ہے لندن ہی میں

خریدی گئی ہوں۔ یہ ولیم اوسلر کی *Science and Immortality*، سیموئیل مکارڈ کروتھرز کی *The Endless Life*، ہگو مانسٹر برگ کی *The Eternal Life* اور ولیم جیمز کی مشہور کتاب *Human Immortality: Two Supposed Objections to the Doctrine* تھیں۔

اسی برس ولیم بلیک وڈ لندن سے شائع ہونے والی جان ڈیوڈسن کی کتاب *New Interpretation of Herbart's Psychology and Educational Theory Through the Philosophy of Liebniz* بھی بعد میں بھی اقبال کی کتابوں کے مجموعے میں شامل ہوئی۔

جوہن فریڈرک ہربرٹ جس کے نظریات اس کتاب میں پیش کیے گئے تھے کانٹ کے بعد آنے والی نسل کے اہم فلسفی اور ماہرِ تعلیم تھے جنہیں اپنے استاد فشٹے سے کئی اختلافات رہے تھے۔ اُن کے خیال میں روح کے اپنے کوئی رجحانات نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ سب کچھ اپنے ماحول سے اخذ کرتی تھی چنانچہ تعلیم کو اہمیت دینی چاہیے۔ ان کے تعلیمی فسلفے کی بنیاد associations کے اصول پر تھی یعنی انسانی ذہن میں تصورات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں سگمنڈ فرائڈ نے اس نظریے سے فائدہ اٹھایا تھا اور اس کی تحقیقات نفسیات کے علم میں بنیادی تبدیلیاں لا رہی تھیں مگر یہ معلوم نہیں کہ اُس زمانے میں اقبال فرائڈ سے واقف تھے یا نہیں۔

اُس برس شائع ہونے والی دیگر کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ تھیں:[۲۵]

Baldwin, James Mark. *Social Ethical Interpretations in Mental Development: A Study in Social Psychology*. New York, McMillan.

Berdoe, Edward. *Browning's Message to His Time:*

His Religion, Philosophy and Science. London, Sonnenschein

Carpenter, Edward. *Love's Coming of Age: The Relations of the Sexes*. London, Swan Sonnensehein

Hamerton, Philip Cilbert. *Human Intercourse*. London, McMillan

Macaulay, Lord. *Selections from the Writings of Lord Macaulay* (Edited by Sir George Otto Trevelyan). London, Longman's Green

40

اقبال کو چونکہ پی ایچ ڈی جرمنی سے حاصل کرنی تھی لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے آغاز تک اُنہوں نے جرمن زبان سیکھنی بھی شروع کر دی تھی۔

گوئٹے کی ایک نظم 'Vier Jahrezeiten' یعنی 'چار موسم' تھی۔ اس میں موسمِ گرما کے تحت لکھا تھا کہ حسن نے زیوس سے اپنے بارے میں پوچھا کہ فانی کیوں ہے۔ دیوتا نے جواب دیا کہ صرف وہی چیزیں حسین بنائی گئی ہیں جو ہمیشہ نہ رہیں۔ عشق، پھول، شبنم اور جوانی سب نے یہ بات سنی اور روتے ہوئے دیوتا کے تخت کے پاس سے روانہ ہوئے۔ جینا اور محبت کرنا چاہیے مگر زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے اور محبت بھی۔ اے تقدیر! تم اِن دونوں کا تار اکٹھے کاٹ دیتی ہو!

مخزن کے مارچ کے شمارے میں اقبال کی ایک نظم اِس نوٹ کے ساتھ چھپی کہ ''اصل خیال جرمن نثر میں دیکھا گیا۔ میں نے ناظرین کے لیے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو نظم میں منتقل کر دیا'':

حقیقتِ حُسن

خدا سے حسن نے اِک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے، حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

مارچ ۱۹۰۶ء میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہوا۔ پچھلے برس بھی اقبال نے کوئی نظم نہیں پڑھی تھی مگر اس دفعہ تو وہ ملک میں ہی نہیں تھے۔ ان کے دوست خواجہ دل محمد نے بالکل انہی کے ترنم میں اپنی نظم پڑھی اور شاید ارشد گورگانی کی بات لوگوں کو یاد آ گئی ہو کہ نظمِ اقبال نے ہر اک کو گویا کر دیا!

ڈپٹی نذیر احمد سے کسی نے کہہ دیا کہ دل محمد صاحب ریاضی میں ایم اے ہیں۔ اُنہوں

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

نے اسٹیج سے اعلان کیا کہ جب خدا نے ایسا دماغ دیا ہے جو ریاضی کی گتھیاں سلجھا سکے تو اُسے شاعری جیسی عامیانہ شے میں صرف کرنا سراسر اُس نعمت کی توہین ہے۔

اِس پر انجمن کے سیکرٹری حاجی شمس الدین تڑپ کر اٹھے اور کہا، ہمارا مقصد تو ایک نیک کام کے لیے چندہ جمع کرنا ہے اور وہ صرف شاعری کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ مگر جو بحث میں ہار مان جائے اس کا نام نذیر احمد نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ انہوں نے اپنی چارکونوں والی ٹوپی اتاری اور کشکول کی طرح پھیلا کر حاضرین سے کہا کہ یہ ٹوپی جو حیدرآباد دکن کے نظام بہادر کے روبرو بھی نہیں اُتری تھی آج کاسۂ گدائی کی طرح آپ کے سامنے ہے، چندہ دیجیے، فقیر آپ کے سامنے ہے۔ ہاں دے دو بابا، بھلا ہوگا!

چندہ جمع ہوا تو ہنس کر حاجی صاحب سے کہا، ''کیوں صاحب، آپ نے دیکھا ہماری نثر کا کمال!''[۲۶]

اِس اجلاس میں ابوالکلام آزاد بھی آئے ہوئے تھے جو کسی وجہ سے شبلی کے رسالے سے الگ ہوکر لکھنؤ سے چلے آئے تھے اور اب امرتسر جا رہے تھے۔

42

سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں کا انداز بدلنے لگا تھا۔ تقسیمِ بنگال کے خلاف مظاہروں سے جو بات شروع ہوئی تھی وہ اب ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں سے نجات کی طرف جارہی تھی۔ اسی تحریک کا ایک حصہ وہ سودیشی تحریک تھی جس میں لوگ انگریزی کپڑوں اور کوٹ پتلون وغیرہ کو آگ کے الاؤ میں جھونک کر حکومت کے خلاف نعرے لگاتے تھے۔

منشی دیانرائن نگم نے سودیشی تحریک کے بارے میں ایک سوالنامہ تیار کر کے ملک کے سرکردہ افراد کے پاس بھیجا تاکہ جوابات اپنے اخبار زمانہ میں شائع کرسکیں۔ اقبال کو بھی سوالنامہ بھیجا گیا:[۲۷]

۱۔سودیشی تحریک بذاتِ خود ملک کی ترقی کے لیے کہاں تک مفید ہے اوراس تحریک کے نشیب وفراز، نفع ونقصان اورعمل درآمد کے متعلق آپ کی مفصل رائے کیا ہے؟

۲۔ اِس تحریک میں ہندوستان کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے؟ خاص مسلمانوں کے لیے اس سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے کی کہاں تک اُمید ہے؟

۳۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اوراس کی کامیابی کا ہندومسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر ہوگا؟

43

کیمرج پہنچ کر اقتصادیات میں اقبال کی پرانی دلچسپی زندہ ہوگئی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اِس خیال سے کہ کہیں فلسفہ انہیں دنیا کے کام سے ناکارہ نہ کردے انہوں نے اقتصادیات کے لیکچر سننا بھی شروع کردیے۔ہم نہیں جانتے کہ یہ شوق کن دنوں اختیار کیا مگر دیا نرائن نگم کے سوالنامے کے جواب لکھتے ہوئے اقتصادیات پیشِ نظر تھی۔

اقبال کا خیال تھا کہ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جس کے ''ہر ذرّے میں اُن لوگوں کا خون چمکتا ہے جنہوں نے سیاسی حقوق کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، باغیوں کی طرح نہیں بلکہ اُن لوگوں کی طرح جن کے دل میں اپنے وطن کے قانون اوراُس کے رسوم کی عزت ہوتی ہے۔''

ایسی قوم کسی دوسرے ملک کو غلام رکھنے پر مائل نہیں ہوسکتی، ہاں ہندوستان میں آزادی کی قابلیت پیدا ہونی ضروری ہے جو ابھی تک موجود نہیں کیونکہ سیاسی آزادی کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں اُن میں سب سے اہم ''کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہے۔''

ہندوستان کی بہتری چاہنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ انگریزوں سے نفرت کرنے کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو ہندوستان سے محبت ہے۔ اِس لیے انگریز دشمنی سے قطع نظر یہ سوچنا چاہیے کہ خود ہندوستان کے لوگوں کی خوش حالی کس بات میں ہے۔

''اِس بات کی کوشش کرنا کہ ہماری ساری ضرورتیں اپنے ملک کی خصوصیات سے پوری ہو جایا کریں سراسر جنون ہے،'' انہوں نے لکھا۔ ''واقعات کے لحاظ سے دیکھو تو یہ بات کسی ملک کو نہ اب نصیب ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور اگر یہ بات ممکن بھی ہو تو اس میں میرے خیال میں بجائے فائدے کے نقصان ہے۔''

وہ سودیشی تحریک کو سیاسی نظر سے نہیں بلکہ ایک دانشور کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایک ملک کی دوسرے ملک کے ساتھ تجارت نے تہذیب کو آگے بڑھایا تھا اور یہ عمل ایسا تھا جسے روکنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ سودیشی تحریک اپنی جذباتیت میں اس بات کو نظر انداز کر رہی تھی۔

''سودیشی تحریک کو عملی صورت دینے کے لیے میری رائے میں اِن باتوں کا لحاظ ضروری ہے،'' انہوں نے لکھا:

(الف) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو اس وقت ملک میں تیار ہو رہی ہیں اور ان کی کمیّت اور کیفیت کیا ہے؟

(ب) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو پہلے تیار ہوتی تھیں اور اب تیار نہیں ہوتیں؟

(ج) وہ کون کون سی مصنوعات ہیں جن کو ہم خصوصیت سے عمدہ اور ارزاں تیار کر سکتے ہیں؟

(د) ملک کے صوبوں یا دیگر قدرتی حصص کے لحاظ سے وہ کون کون سے مقام ہیں جو بعض اسباب کی وجہ سے خاص خاص مصنوعات کے لیے موزوں ہیں؟

(ہ) تخمیناً کس قدر سرمایہ زیورات وغیرہ کی صورت میں ملک میں معطل پڑا ہے اور اس کو استعمال میں لانے کے لیے کیا وسائل اختیار کرنے چاہییں؟''

اِس کے علاوہ مشترک سرمایہ کاری کی ضرورت بھی تھی۔ اقبال نے لکھا، ''لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سکھاؤ، ان کے اسراف کی عادت پر نکتہ چینی کرو اور اُن کے دل پر یہ امر نقش کر دو کہ انسان کی زندگی کا مقصد خودغرضی کے پردے میں بنی نوع انسان

کی بہتری کی جستجو کرنا ہے۔'' اِن الفاظ میں ایمرسن جیسے مفکروں کا اثر جھلک رہا تھا جن سے وہ اُن دنوں متاثر تھے۔

نظم کے دوسرے سوال کے جواب میں اُنہوں نے لکھا کہ ملک میں اتفاق ہونا بہت ضروری ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ یاد رکھا جائے ''مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لیے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے۔'' ان کے خیال میں اگر اس تحریک کے نتیجے میں چیزوں کی قیمتیں سستی ہوجائیں تو ظاہر ہے اس سے مسلمانوں کو بھی فائدہ ہوگا۔

تیسرے سوال کے جواب میں اُنہوں نے صبر و استقلال اور دُور اندیشی پر زور دیا اور مشورہ دیا کہ اچھی اور سستی چیزیں پیدا کر کے مہنگی اور نمائشی اشیا کو ملک سے نکالنا چاہیے۔ ''مقدس عہد لینا کہ ہم خارجی ممالک کی مصنوعات استعمال نہ کریں گے اور جوش میں آکر انگریزی کپڑے کے کوٹ آگ میں پھینک دینا ایک طفلانہ حرکت ہے جو اقتصادی لحاظ سے غیر مفید اور سیاسی لحاظ سے جرم ہے۔ اگر اس تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحادِ اغراض پیدا ہوجائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیے۔ ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام جلی قلم سے فردِ اقوام میں لکھا جائے!''

عجلت میں لکھے گئے اس خط کا طرزِ تحریر اُن خطوط سے بہت مختلف تھا جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے مولوی انشاٗ اللہ کے نام لکھے تھے۔ شاید یہ درسی مصروفیات کا اثر تھا۔[۴۹]

44

نظارۂ کہکشاں نے مجھ کو عجب نکتہ یہ کل سجھایا
ہزار گردش رہی فلک کی مگر یہ تارے بہم رہے ہیں
کوئی غرورِ شہنشہی سے یہ جا کے، میرا پیام کہہ دے
کہ اس زیاں خانے میں سکندر رہے، نہ دارا، نہ جم رہے ہیں
اگر تمنا ہو عافیت کی خدا سے بیگانگی نہ کرنا

جہاں میں تیرِ ستم سے ایمن طیورِ بامِ حرم رہے ہیں[29]

45

فوق نے ایک پرچہ کشمیری میگزین شائع کیا۔انہوں نے اقبال سے شعر یا مضمون کی فرمائش کی۔

''مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں کے مشاغل سے فرصت نہیں ملتی۔'' اقبال نے لکھا۔ ''ایسے حالات میں مضامین لکھنے کی کہاں سوجھتی ہے۔ البتہ شعر ہے جو کبھی کبھی خود موزوں ہو جاتا ہے۔ سو شیخ عبدالقادر (ایڈیٹر مخزن) لے جاتے ہیں۔اُن سے انکار نہیں ہو سکتا، آپ سے بھی انکار نہیں۔ اگر کچھ ہو گیا تو حاضر کروں گا۔''[30]

46

زرتشت کے کئی سو سال بعد ایران میں ایک فلسفی پیدا ہوا جس کا نام مانی تھا۔ اُس کا زمانہ تیسری صدی عیسوی بتایا گیا ہے۔ اُس نے یہ تصور پیش کیا کہ خیر اور شر کی قوتیں ایک وجود نہیں رکھتیں بلکہ دو علیحدہ قوتیں ہیں۔ خیر کی قوت نور ہے اور اس کی خصوصیات شرافت، علم، سمجھ وغیرہ ہیں۔ یہ قوت نَر ہے۔ یہ مانی کا تصورِ خدا تھا۔

کائنات کے بارے میں اُس کا خیال تھا کہ نورانی قوت کے خلاف تاریکی کی مادہ قوت موجود ہے جس کے پیٹ سے شیطان نے جنم لے کر نور کی سلطنت پر حملہ کیا تھا۔ نورانی قوت نے اس کا جواب دینے کے لیے کیومرث یا پہلے انسان کو پیدا کیا۔ شیطان نے کیومرث کو ختم کر کے نُور کے پانچ اوصاف کو تاریکی کے پانچ اوصاف کے ساتھ ملا دیا۔ تب نورانی قوت نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ کائنات کی تخلیق کریں اور اس میں سے روشنی کے ذرّات کو ایک ایک کر کے نکالتے رہیں تاکہ وہ اندھیرے کی قید سے آزاد ہو کر اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ اقبال نے مانی کا موازنہ دوسرے فلسفیوں مثلاً چینی حکما، عیسائی صوفی اکوئی ناس، ہندو فلسفی کپیلا اور میک ٹیگرٹ کے محبوب جرمن فلسفی ہیگل

وغیرہ سے کیا۔

ایران کی ذہنی تاریخ کی اگلی اہم شخصیت مزدک تھی۔ یہ شخص نوشیروانِ عادل کے دورِ حکومت (۵۳۱ء تا ۵۷۸ء) میں نمودار ہوا اور اُس نے مانی کے فلسفے کو ایک نیا رنگ دیا۔ مزدک کا خدا حس رکھتا تھا اور چار بنیادی توانائیوں کا مرکب تھا۔ مگر مزدک کے فلسفے کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ اُس نے تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دیا اور یہ بھی کہا کہ ذاتی ملکیت ایک ایسا تصور ہے جس کے ذریعے شیطان خدا کی کائنات کو دکھوں کا گھر بنادینا چاہتا ہے۔

چنانچہ مزدک کے خیال میں انسان کو ذاتی ملکیت رکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ عورت کا شمار بھی انسانوں کی بجائے ملکیت میں کرتا تھا لہٰذا اُس کے پیروکار شادی بیاہ کے مخالف تھے اور اپنی پسند کی ہر عورت سے جسمانی تعلق قائم کرنے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ مزدکیت اپنے اشتراکی پہلو کی وجہ سے قدیم ایران میں مقبول نہ ہوسکی اور بالآخر اس سوچ کو سختی سے کچل دیا گیا۔

یہ تھا اسلام سے پہلے کے ایران کی ذہنی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ!

اِس کے بعد جنگِ نہاوند ہوئی اور سخت جان عرب شہسوار ایران پر چھا گئے۔ ایرانی بڑی تعداد میں مسلمان ہوئے مگر اُن کے اثر سے اسلام کی صورت میں تبدیلی آنے لگی۔ ایرانیوں کے آریائی ذہن نے بظاہر سامی مذہب قبول کرلیا مگر اندر ہی اندر اپنے پرانے رجحانات کو زندہ رکھا۔ جس طرح چند صدیاں قبل یونان کے آریائی ذہن نے عیسائیت کے سامی مذہب کو قبول کرنے کے بعد اس کی شکل تبدیل کردی تھی اُسی طرح عجم کے گلزاروں میں پہنچ کر اسلام کے سخت اور بے لچک قوانین بھی نرم پڑنے لگے۔ اسلام کے لیے ایسے اصول وضع کیے گئے جو قدیم ایرانی فلسفہ کے اثر سے آزاد نہ تھے۔

یہ عجمی اسلام بوعلی سینا کی تحریروں بھی نظر آتا تھا اور اُن صوفی سلسلوں میں بھی جواب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ کم از کم اقبال اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔

47

''مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر دنیا میں آئے وہ سب کے سب ایشیا میں پیدا ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا؟'' کیمبرج کے ایک انگریز طالب علم نے طنز کیا۔ اقبال نے جواب دیا کہ شروع ہی میں خدا اور شیطان کے درمیان تصفیہ ہو گیا تھا کہ خدا اپنے پیغمبر ایشیا میں بھیجے گا اور شیطان یورپ میں۔

''تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟'' انگریز نے پوچھا۔

''یہ تمہارے میکیاولی اور مشہور اہلِ سیاست اُس کے رسول ہیں،'' اقبال نے جواب دیا۔[۳۱]

شاید یہ محض لطیفہ نہ تھا اور وہ سچ مچ مغرب سے بیزار ہونے لگے تھے۔ ''یہاں بعض لوگ اپنے بچوں کا بیمہ کروا کے اُنہیں بھوکا مرنے دیتے ہیں تا کہ بیمے کی رقم وصول کریں،'' اگر واقعی اقبال نے بعد میں یہ کہا تو یہ اُس زمانے کے عام رجحان کی مثال ہے کہ غیر کی بدترین مثال کا موازنہ اپنی بہترین مثال سے کر کے فخر کا جواز پیدا کیا جائے۔

48

لفظ نیشنلزم دنیا میں پہلی بار پندرہ بیس برس پہلے سنا گیا تھا جب فرانس اور اٹلی میں یہ اُن انتہاپسندوں کی سوچ کے لیے استعمال ہوا تھا جو وطن کے نام پر لوگوں کو شخصی آزادی اور اختلافِ رائے کے حق سے محروم کرنا چاہتے تھے۔

جنگی جذبے کو پروان چڑھانے میں جمہوریت کا بہت ہاتھ تھا کیونکہ انتخاب کے موقع پر سیاسی رہنما حب الوطنی کے نام پر لوگوں کے جذبات ابھارتے تھے۔ چنانچہ پچھلے چالیس برس میں پورا یورپ زرہ پوش ہو گیا تھا۔ برطانیہ کے سوا ہر یورپی ملک میں فوجی ملازمت لازمی تھی۔

اقبال اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلام ایک ایسا وسیع تصور ہے جو وطن سے کہیں زیادہ پھیلا ہوا ہے اور جدید دور میں وطن پرستی کی وجہ سے جو استحصال ہو رہا ہے اُس کا بہترین

حل یہی ہے کہ وطن کی بجائے کسی ایسے روحانی اصول کو اپنایا جائے جس میں ساری انسانیت کو ایک خاندان سمجھا جاسکتا ہو۔

49

اُن کی زندگی میں یہ ایک ایسا موقع تھا جب انہوں نے کئی مشاغل سے دست بردار ہو کر اپنے ذہن کی بکھری ہوئی قوتوں کو جمع کیا تھا اور اب اُن کا خیال ہو گیا تھا کہ وہ شاعری ترک کر دیں گے۔ وہ شعر نہ کہنے کی قسم کھانا چاہتے تھے اور بقیہ زندگی شاید تحقیق اور وکالت یا پھر ہوسکتا ہے سیاست میں گزارنا چاہتے ہوں۔

اِس رویے کے پیچھے ہمیں علی گڑھ تحریک کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جس دَور میں خود مقدمۂ شعر و شاعری لکھنے والا کہہ رہا ہو کہ ''جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے'' اُس دَور میں یہ بات بالکل فطری ہے کہ اقبال جیسا پُرعزم نوجوان اپنے مقاصد سے واقف ہوتے ہی شاعری سے تائب ہو جائے:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
مدیرِ مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے
۳۲

مگر مدیرِ مخزن اِتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ ''میں نے اُن سے کہا کہ اُن کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے، اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا،'' عبدالقادر

کا بیان ہے۔ ''شیخ صاحب [اقبال] کچھ قائل ہوئے، کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔''

آرنلڈ نے عبدالقادر سے اتفاق کیا اور کہا کہ جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ اُن کے لیے بھی مفید ہے اور ملک وقوم کے لیے بھی۔[۴۳]

چنانچہ اقبال دوبارہ شعر کہنے پر مائل ہوئے مگر ایک نئے جذبے کے ساتھ!

غزل

زمانہ دیکھے گا، جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے، گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا
تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں، تو عیب ہے میرے عیب جُو کا
کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تُو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو، گرے رگِ گُل سے قطرہ انساں کے لہو کا
گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟
جو گھر سے اقبالؔ دُور ہوں میں، تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر، وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

مخزن، اپریل ۱۹۰۶ء[۴۴]

غزل میں پندرہ اشعار تھے۔

''لندن میں ایک پنجابی مسلمان اچار، مربّہ اور چٹنیاں بیچا کرتا تھا،'' اقبال کا بیان

ہے۔ ''میں اُس کا ایک مستقل گاہک تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے میرا نام اور مقام پوچھا۔ میں نے اقبال اور سیالکوٹ بتایا۔''

چٹنی والے نے کہا، ''اقبال اور وطن سے باہر؟ آہ، یوسف کوچہ و بازار میں!''

اقبال نے کہا، ''گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر۔''

چٹنی والے نے اُن سے پوچھا کہ وہ کس قبیلے سے ہیں تو اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، مسلمانوں کے قبیلے سے۔ اُس نے کہا، ''میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کس قوم، کس گوت یا ذات سے ہیں؟''

اقبال نے کہا، ''اقبال کا تعلق کسی قوم اور کسی ذات سے نہیں ہوتا۔''[۳۵]

51

اپریل ہی میں نکلسن صاحب کا ایک مضمون Journal of Royal Asiatic Society میں شائع ہوا۔ اُنہوں نے تصوف کی مختلف تعریفیں جمع کی تھیں۔ یہ مضمون اقبال نے بھی پڑھا۔

52

حسن نظامی نے ہندوستان کے مقدس مقامات کی سیر کا پروگرام بنایا۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور شیخ محمد اکرام (معاون مدیر مخزن) کو ساتھ لے کر متھرا، ہردوار، جگن ناتھ، امرناتھ اور بنارس ہر جگہ کی زیارت کی۔

اقبال کو خط میں اس کا حال لکھا تو انہوں نے ۲۵ اپریل کو جواب دیا، ''بنارس جا کر لیلام ہو گئے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟ میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشکِ صنعت آزری ہے۔ اِس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے؟ خدا کی قسم، بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ۔''

غزل

نظارہ ماہ کا سامانِ بے خودی ہے مجھے
یہ چاندنی ہے کہ گردُوں سے مے برستی ہے
وہ سیر دل کی کرے، ذوقِ جستجو ہو جسے
جہاں کو جس نے بسایا یہ اُس کی بستی ہے
میں اُس دیار کے، پُھم کے ساکنو! صدقے
جہاں کے کُوچوں میں غیرت ہے تنگ دستی ہے
ہزاروں نقش مٹے اِک ترے بنانے کو
تری نمود سے غافل! نمودِ ہستی ہے[٣٦]

53

قدیم ایرانی دماغ خدا اور شیطان کی جنگ میں اُلجھا رہا۔ اس کے برعکس یونانی ذہن خدا اور مادّے کی کشمکش سے نبرد آزما ہوا تھا۔ جب ایران میں اسلام آیا تو اس کے کچھ عرصہ بعد شام کے عیسائیوں کے توسط سے یُونانی فلسفہ بھی وہاں پہنچ گیا۔

عجم میں تجزیہ کرنے کی صلاحیت کم تھی، یونانی فلسفے کے مطالعے نے اس خامی کو دُور کیا۔ چنانچہ اس کے بعد مسلمان فلسفیوں کے کارنامے زبردست تجزیاتی اندازِ فکر کے حامل نظر آتے ہیں۔

اقبال نے اس سلسلے میں تین فلسفیوں پر خاص توجہ دی۔ فارابی، ابنِ مسکویہ اور ابنِ سینا۔

54

فارابی نے خدا کا وجود جس طرح ثابت کیا اُس میں ارسطو کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

اُنہوں نے کہا، دنیا میں دو طرح کی ہستیاں ہیں۔ ایک وہ جو ممکن ہے۔ دوسری وہ جو

ضروری ہے۔ مثلاً اگر کسی کے سامنے ایک کرسی پڑی ہے جو ایک مکمل حقیقی وجود رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا وجود میں آنا ممکن رہا ہوگا۔ مگر اسے وجود میں لانے کے لیے ایک بنانے والے کا وجود بھی ضروری ہے۔ پھر اُس بنانے والے کا بنانے والا بھی ضروری ہوگا اور اس طرح سلسلہ خدا تک پہنچے گا۔ خدا کا بنانے والا کوئی نہیں ہے کیونکہ اگر ہم اُس سے پیچھے جائیں گے تو پھر اسباب کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کرسی کی تخلیق ایک ایسے وقت میں ہو رہی ہے جو کبھی ختم نہیں ہو رہا اور اس طرح کرسی کی مکمل تخلیق ممکن ہی نہ رہی ہوگی لیکن چونکہ یہ موجود ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ بنانے والا بھی ہے جس کا وجود ضروری ہے۔ اُسے کسی نے نہیں بنایا۔ وہ وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہے۔ اُس کی کوئی شکل نہیں، نہ وہ کبھی تبدیل ہوتا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک ہے کیونکہ اگر دو ہوں گے تو کسی نہ کسی اعتبار سے آپس میں مختلف بھی ہوں گے اور اپنی اپنی جگہ محدود بھی ہوں گے مگر جو مختلف اور محدود ہوں، وہ حتمی سبب یا سب چیزوں کو بنانے والے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ فارابی نے خدا کو واحد ثابت کیا اور یہ ایرانی فلسفہ پر گویا اسلام کا اثر تھا۔

فارابی کے نزدیک کائنات میں رُوح اصل شے ہے اور مادّہ صرف رُوح کی منتشر صورت ہے۔ اِس طرح یہ یونانی خیال کہ روح اور مادہ الگ الگ ہیں اسلامی فکر میں داخل ہو گیا۔

55

ابن مسکویہ ایران ہی نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام کے سب سے مشہور فلسفی تھے جنہوں نے ارسطو اور دوسرے یونانی فلاسفہ کا ترجمہ کیا اور اپنا مربوط نظامِ فکر بنانے کی کوشش بھی کی جو اس سے پہلے ایران کے کسی فلسفی نے نہیں کی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ مستشرقین نے اب تک ان پر بہت کم توجہ دی تھی۔ چنانچہ اقبال نے ابن مسکویہ کے خیالات کو تفصیل سے بیان کیا اور شبلی نعمانی کی کتاب علم الکلام سے ایک اقتباس

بھی اپنی تحریر میں شامل کیا۔

56

ابنِ سینا کو طبیب ہونے کی وجہ سے رُوح کے موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ اُن کے خیال میں رُوح بدن کے بغیر بھی نہ صرف زندہ رہ سکتی ہے بلکہ ادراک بھی کرسکتی ہے۔ اگر رُوح کو سوچنے یا سمجھنے کے لیے جسم کی ضرورت ہوتی تو پھر جسم کا ادراک کرنے کے لیے، جس میں رُوح موجود ہے، رُوح کو ایک اور جسم کی ضرورت پیش آتی مگر ایسا نہیں ہے۔

ابنِ سینا کے نظریے کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اُن کے خیال میں رُوح اور جسم دونوں اکٹھے بنتے ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے جسم بنتا ہو اور پھر اُس میں رُوح پھونکی جاتی ہو اور نہ ہی رُوح جسم کے وجود میں آنے سے پہلے کہیں اور موجود ہوتی ہے۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ ہی نشوونما پاتے ہیں مگر چونکہ جسم مادّی ہے لہٰذا زوال کے قانون کا پابند ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔ رُوح غیر مادّی ہے لہٰذا جسم کو چھوڑ کر آزادانہ رہنے لگتی ہے اور قبر سے اگلے مراحل میں بھی باقی رہ سکتی ہے۔

رُوح اور مادہ الگ الگ نہیں۔ ان کی اصل ایک ہے۔

57

''ہم اُن فلسفیوں کے کام کا جائزہ لے چکے ہیں جنہیں ابتدائی ایرانی فلسفیوں میں سے نوافلاطونی کہا جاتا ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''یہ نوافلاطونی افکار اُس زمانے میں قدیم ایران کی روشنی اور تاریکی کی ثنویت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ (یونانی فکر سے) ایک علیحدہ زندگی مانگ کر لائے تھے۔ البتہ یہ افکار اُس توحیدی رُجحان کی تقویت اور وسعت کا سبب ضرور بنے جو شروع شروع میں زرتشتی مذہب میں رُونما ہوا تھا۔

''ہم دیکھیں گے کہ آگے چل کر یہ نوافلاطونی فکر بھی عام ایرانی فکر کے دھارے میں

ضم ہوگئی اور وہ ابتدائی توحیدی رُجحان بھی کچھ عرصہ تک اسلام کی فقہی بحثوں کے نیچے دبا رہنے کے بعد پُوری توانائی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا۔''

58

ایک دفعہ تعطیلات کے زمانے میں اقبال اپنے ہم جماعت کے ساتھ اُس کے گھر گئے جو اسکاٹ لینڈ کے دورافتادہ قصبے میں تھا۔ وہاں ایک مشنری صاحب ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے۔ یہ بھی دوست کے ساتھ جلسے میں جا پہنچے جو شام کے وقت قصبے کے اسکول میں ہوا۔ پادری صاحب نے بھیل، گونڈ، دراوڑ اور اڑیسہ کے جنگلات میں بسنے والے غیر مہذب قبائل کی نیم برہنہ مکروہ تصاویر میجک لینٹرن پر دکھا کر قصبے والوں سے کہا کہ ہندوستانی ایسے ہوتے ہیں اور انہیں تہذیب سکھانے کے لیے مخیّر حضرات کے چندے کی ضرورت ہے۔ اقبال جو بچپن ہی سے مشنری سرگرمیوں سے بدظن تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور منتظمین سے اجازت لے کر مجمع کے سامنے آ گئے۔

''میں نے بڑے جوش سے پچیس منٹ تقریر کی،'' اُن کا بیان ہے۔ ''میں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں خالص ہندوستانی ہوں...آپ میری وضع قطع، رنگ روپ، چال ڈھال دیکھ لیجیے...حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مشرقی دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی شمع بلند رکھی ہے۔ اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلام ہو گئے ہیں لیکن ہمارا اپنا ادب ہے، اپنا تمدن ہے، اپنی قومی روایات ہیں جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں۔ مشنری صاحب نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے...''

لوگ اقبال کے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔[۳۸]

59

''میں تو کسی قوم کے تمدن کو اس بات سے جانچتا ہوں کہ اس قوم میں کھانا کھانے کے آداب اور طور طریقے کس قسم کے رائج ہیں،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''جب میں پہلی مرتبہ انگلستان گیا تو مجھے ایک پر لطف واقعہ پیش آیا۔ میں کھانے کی ایک تقریب میں شریک تھا۔ مہمانوں میں انگریز مرد اور عورتیں دونوں موجود تھے۔ میز پر گوشت کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پڑا تھا اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیں اس کے کاٹنے کی کیا سبیل ہوتی ہے۔ اتنے میں میزبان خاتون نے ایک اتنا لمبا چھرا کہیں سے نکالا اور بڑے مزے سے گوشت کو اس ٹکڑے پر چلانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی بھی آئی اور یہ خیال بھی دل میں آیا کہ یہاں وحشت اور تمدن میں آخر کتنا فرق رہ گیا ہے؟''[۳۹]

60

عجیب چیز ہے مغرب کی زندگی جس سے
دماغ ہوتا ہے، دل آشنا نہیں ہوتا[۴۰]

61

میک ٹیگرٹ کے خیال میں وقت محض ایک انسانی تصور تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اقبال کو اس سے اتفاق نہیں تھا اور ایک روایت کے مطابق انہوں نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھ کر میک ٹیگرٹ کو دکھایا جنہوں نے اس پر بہت تنقید کی۔ اقبال نے مضمون ضائع کر دیا۔[۴۱]

اس میں جو خیالات پیش کیے گئے تھے وہ فرانسیسی فلسفی برگساں کے خیالات سے بہت قریب تھے جو ۱۸۸۹ میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے تھے مگر اب تک انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوئے تھے اور اقبال شاید ان سے واقف نہیں تھے۔

62

کیمبرج میں پروفیسر میک ٹیگرٹ کے ایک دوست اُن سے ملنے کبھی کبھی آتے تھے۔ آدھے سے زیادہ گنجا سر، افسردہ سی آنکھیں اور جرمن طرز کی نیچے کو جھکی ہوئی مونچھیں۔ گیارہ سال پہلے اُن کے ایک ناول پر اتنا شدید ردِ عمل ہوا تھا کہ یہ ناول نگاری سے توبہ کر کے نظم تک محدود ہو گئے تھے۔ یہ ٹامس ہارڈی تھے۔

نجانے اقبال کی ہارڈی سے ملاقات ہوئی یا نہیں مگر اقبال کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یورپی ادب مایوسی اور زندگی سے بیزاری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہارڈی نے بھی اپنے ناولوں میں زندگی سے ناامیدی کی تصویر کھینچی تھی۔ بہت عرصہ بعد اقبال نے کسی نجی محفل میں کہا، ''اگر میں کسی **ملک** کا بادشاہ ہوتا اور وہاں کوئی ادیب ٹامس ہارڈی جیسی حرکت کرتا تو میں اُسے گولی مار دیتا۔''

63

عطا محمد کی سخت گیری سے ڈر کر علی بخش بھاگ گیا تھا اور لاہور جا کر اسلامیہ کالج میں نوکری کر لی تھی۔

معراج اور آفتاب کو تو بہت بہت یاد آتے ہوں گے کیونکہ عطا محمد اپنے مخصوص انداز میں اُن دونوں کی تربیت کر رہے تھے۔ ایک روز کسی شرارت پر آفتاب کو برا بھلا کہہ رہے تھے جب کریم بی بی سے یہ غلطی سرزد ہو گئی کہ ڈر کر اپنے بچے کو پاس بلا لیا۔ عطا محمد ایک بید لے کر آئے اور آفتاب کو اس کی ماں کی گود سے چھین کر علیحدہ کمرے میں لے گئے۔ نو برس کے بچے کی بید سے پٹائی کسی کو بھی اچھی نہ لگی۔ نور محمد کو خبر ہوئی تو تڑپ کر اٹھے اور کسی نہ کسی طرح بچے کو اُس کے چچا سے چھڑا لائے۔[۴۲]

اقبال کے خطوط گھر کے سب افراد کے نام آتے تھے مگر وہ محفوظ نہیں ہیں۔ معراج کے لیے عطا محمد صاحب کا حکم تھا کہ وہ خود باپ کو خط نہ لکھے اور جو بات کہنی ہو وہ چچا یا دادا کے ذریعے کہلوائے۔ اُس زمانے میں لڑکیوں کا خط لکھنا ایک معیوب بات تھی اور

اِس سے مطلب نہ تھا کہ خط کسے لکھا جا رہا ہے یا اُس میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ اگرچہ معراج کی عمر صرف گیارہ برس تھی مگر ایک دفعہ جب اُس نے براہِ راست باپ کو خط لکھ دیا تو عطا محمد نے بہت سختی سے باز پرس کی۔[۴۳]

ہندوستان میں اقبال کی کمی محسوس کرنے والے صرف اُن کے ماں، باپ، بچے اور بھتیجے ہی نہ تھے۔ صرف شاعری پڑھنے والے ہی نہیں بلکہ نئے شاعر بھی اُن کی خاموشی شدت سے محسوس کر رہے تھے کیونکہ اپریل کے بعد سے مخزن میں اقبال کی کوئی نظم نہیں چھپی تھی۔ جولائی کے مخزن میں دُرگا سہائے سرور جہاں آبادی کی نظم 'فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال' شائع ہوئی جس میں اقبال سے تقاضا کیا گیا تھا کہ وہ کوئی نئی تخلیق پیش کریں۔[۴۴]

64

اقبال کو معلوم ہوا کہ اُن کے گورنمنٹ کالج کے طالب علم خواجہ فیروز الدین کا رشتہ کریم بی بی کی بہن کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے سسر حافظ عطا محمد کو لکھا کہ رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔[۴۵]

65

خواجہ فیروز الدین ریاضی کے لازمی امتحان میں فیل ہوئے تھے جس کی وجہ سے حافظ عطا محمد نے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ اقبال کا خط ملا تو اُنہوں نے اپنا ارادہ بدلا اور سر مہدی شاہ کولڑ کے کے والدین کے پاس کیمبل پور بھیج کر اپنی منظوری کی اطلاع دی۔

66

ایران پر عربوں کی حکومت خلافتِ راشدہ کے زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ جب بنی امیہ کی حکومت کا دَور آیا تو بقول ڈوزی عربوں نے اسلام کے بلند نصب العین سے منہ

موڑ کر زمانۂ جاہلیت کے تعصّبات کی طرف رجوع کیا۔ مفتوحہ اقوام کے ساتھ ان کا برتاؤ تبدیل ہو گیا۔ اُس زمانے میں بڑے ظلم ہوئے۔ کربلا کا واقعہ پیش آیا۔ صحابہ کو شہید کیا گیا۔ اہلِ بیت پر سختیاں روا رکھی گئیں۔ ایرانیوں کے ساتھ بھی امتیازی سلوک ہوا جو یہ دیکھ رہے تھے کہ بنی امیہ اپنے مظالم کے جواز میں قرآن کی بعض آیتوں سے تقدیر کا مسئلہ تلاش کر لیتے ہیں یعنی جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی ذمہ داری کسی حاکم پر نہیں بلکہ تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا۔ اِس بات کے خلاف ایرانی ذہن نے بغاوت کی اور ''آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں ہمیں بصرہ کا ایرانی واصل ابن عطاؔ اُس عظیم تحریک کی ابتدا کرتا نظر آتا ہے جس کا نام اعتزال یعنی عقلیت پسندی تھا،'' اقبال نے لکھا۔

اعتزال کی تحریک سے وابستہ فلسفیوں نے جنہیں معتزلہ کہا جاتا ہے تقدیر کے مقابلے میں انسانی آزادی کا نظریہ پیش کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ کائنات ایٹموں کی بنی ہوئی ہے جو ٹوٹتے ہیں نہ ختم ہوتے ہیں۔ اِس طرح اُنہوں نے کائنات میں مخلوق اور فطرت کی اہمیت بیان کی مگر اس کے ساتھ ساتھ خدا کے روایتی مذہبی تصور پر زد پڑی اور خدا کا تصور صرف ایک ناقابلِ بیان آفاقیت تک محدود ہو گیا۔ معتزلہ کا ایک محبوب موضوع یہ بھی تھا کہ کائنات میں برائی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بحث ایک طرح سے قدیم زرتشتی فکر کا تسلسل تھی۔

معتزلہ نے مذہب کو انسانی عقل کا پابند کیا تھا۔ بعد میں اسماعیلیہ فرقہ نے اس نظریے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے ایک زندہ اور حاضر امام کا تصور پیش کیا جو باقی انسانوں کے لیے دانائی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ امامت کا مسئلہ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے کائنات کا ایک مربوط نظریہ پیش کیا۔

''خدا کے متعلق اسماعیلیہ کا نظریہ یہ تھا کہ اُس کی کوئی صفات نہیں ہو سکتیں کیونکہ خدا سے صفات منسوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی فطرت اُن صفات کی پابند ہو گی جبکہ وہ قادرِ مطلق ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''پس جب ہم قوت کی صفت کو اُس سے

منسوب کرتے ہیں تو ہمارا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ قوت عطا کرنے والی ہستی ہے۔ چونکہ وہ صفات سے بالاتر ہے لہٰذا اُس میں آ کر تضادات ختم ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات سے متضاد چیزوں کو جاری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس طرح وہ مسئلہ جو زرتشت اور اُن کے پیروؤں کو پریشان کرتا رہا تھا، اسماعیلیوں نے گویا حل کر دیا۔

''اہرمن یا شیطان کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ وہ کوئی بُری چیزیں پیدا کرنے والا بد ذات نہیں بلکہ وہ ایک ایسی قوت ہے جو وحدتِ ازل سے ٹکراتی اور اُسے ظاہری کثرت میں تبدیل کر دیتی ہے،'' اقبال نے مقالے میں لکھا۔ اُن کے اپنے خیال میں یہ نظریہ قدیم ایرانی فلسفے کو اسلام کے توحید کے عقیدے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش تھی۔ اسی سلسلے میں اسماعیلیوں نے قرآن کی علامتی تفسیر پیش کی جس سے بعد میں صُوفیاً نے بھی فائدہ اُٹھایا۔

67

معتزلہ اور اسماعیلی مفکروں نے اسلامی عقاید کی تفسیر میں بڑی آزادی سے کام لیا تھا۔ اس کے خلاف ردِ عمل فطری بات تھی۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی کے آغاز میں ابوالحسن اشعری نظر آتے ہیں جو اسلام کو بنیادی عقاید کی طرف واپس لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود عرب ہونے کے لحاظ سے سامی نسل سے تھے مگر اُن کے ماننے والوں میں ایرانیوں کی بہت بڑی تعداد شامل ہوگئی چنانچہ اُن کے اشعری فرقے کو بھی ایرانی فکر کے تسلسل میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

ابوالحسن خود معتزلہ کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے لہٰذا فلسفیانہ انداز میں معتزلہ کو جواب دیا۔ انہوں نے سبب اور نتیجے کے قانون کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کے خیال میں کسی بھی تخلیق یا واقعے کا سبب تلاش نہیں کیا جاسکتا سوائے اس کے کہ یہ خدا کی مرضی تھی۔ اِس طرح انہوں نے خدا کا وہ تصور بحال کر دیا جسے معتزلہ کی عقلیت پسندی سے نقصان پہنچا تھا مگر مخلوق یا فطرت کی ظاہری حقیقت کا تصور ختم ہو گیا۔

امام غزالی اشعری مکتبِ فکر کی سب سے بڑی شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔انہوں نے رُوح کے بارے میں نظریات پیش کیے جس کے متعلق دوسرے اشعری خاموش رہے تھے۔غزالی نے سمجھنے کی کوشش کی کہ رسول اللہ نے رُوح کے بارے میں خاموشی کیوں اختیار کی تھی۔

''اِس دنیا میں دوطرح کے لوگ ہوتے ہیں،'' اقبال نے غزالی کا نقطۂ نظر تحریر کیا۔ ''عام لوگ،اور مفکر۔عام لوگوں کی نظر مادّیت سے آگے نہیں دیکھتی لہٰذا وہ کسی غیر مادّی چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔اِس کے برعکس مفکرین اپنی منطق کے ذریعے رُوح کے ایک ایسے تصور کے قریب جا پہنچتے ہیں جو عام رُوحوں اور خدا کے درمیان فرق ختم کر دیتا ہے۔غزالی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اُن کی جستجو اُنہیں وحدت الوجود کی طرف لے جا رہی ہے لہٰذا انہوں نے رُوح کی آخری حقیقت بتانے پر خاموشی کو ترجیح دی۔''

اسی طرح ایرانی فلسفیوں کا ایک گروہ خدا کے متعلق خاموش تھا۔اِس روّیے کو اقبال نے 'ایرانی اثباتیت' کا نام دیا۔البیرونی اور ابن سینا یہی روّیہ رکھتے تھے۔

اِن سب سے الگ کچھ اور لوگ تھے جنہوں نے خدا اور رُوح دونوں کے بارے میں اپنی جستجو بڑی بہادری کے ساتھ جاری رکھی۔یہ صوفی تھے۔

68

اقبال ریل گاڑی میں کیمبرج سے لندن آ رہے تھے۔ڈبے میں کچھ لوگ اُن کے قریب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔آخر ایک پارٹی ہار کر اُٹھ گئی۔جیتنے والوں نے رقم سمیٹی اور کچھ نئے لوگوں کو دعوت دی۔بہت جلد یہ بھی ہار گئے۔

اقبال نے بغور دیکھنا شروع کیا اور سمجھ گئے کہ وہ لوگ بے ایمانی کر رہے ہیں۔وہ اب تک بیس پونڈ اکٹھے کر چکے تھے۔اب اقبال کو دعوت دی اور یہ فوراً تیار ہو گئے۔

گاڑی لندن آ کر رُکی تو بیس پونڈ اقبال کی جیب میں پہنچ چکے تھے اور بے چارے پیشہ وَر جواری اُن کے سامنے حیران بیٹھے تھے۔اسٹیشن پر وہ پیچھے پیچھے ہو لیے اور

چاپلوسی کی باتیں کرنے لگے تا کہ کسی طرح رقم واپس مل جائے۔

اقبال نے دھمکی دی کہ اگر غائب نہ ہوئے تو پولیس میں پکڑوا دیے جائیں گے۔ تب وہ ٹلے اور اقبال شاید عبدالقادر کے پاس آ گئے۔[۴۶]

لندن میں لنکنز ان کے لیکچر سننے اور وہاں کے لازمی ڈنرز میں شرکت کرنے، آرنلڈ سے مل کر فلسفۂ عجم پر بحث کرنے اور کتب خانوں کی خاک چھاننے کے علاوہ بھی اقبال کی کچھ مصروفیات تھیں جن کی روداد وہ محمد تقی کو خط میں لکھ کر بھیجتے تھے۔ اقبال کی وفات کے بعد تقی نے وہ سارے خطوط جلا ڈالے لہٰذا اب اُن کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہو سکتی۔ صرف کچھ بکھرے ہوئے واقعات کی روشنی میں ایک دھندلی سی تصویر ابھرتی ہے۔

''تم مسلمان ہو؟'' کسی انگریز نے اقبال سے پوچھا۔ اقبال لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے جواب دیا، ''تیسرا حصہ مسلمان ہوں۔'' جب انگریز نے وضاحت چاہی تو اُنہوں نے کہا، ''رسول اکرمؐ فرماتے ہیں مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں۔ نماز، خوشبو اور عورت۔ مجھے اِن تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے!''[۴۷]

69

نہ پوچھ مجھ سے حقیقت دیارِ لندن کی
یہ ایک شہر ہے گویا پری جمالوں کا
ولی بھی، رند بھی، شاعر بھی کیا نہیں اقبالؔ
حساب ہے کوئی کم بخت کے کمالوں کا[۴۸]

70

علی گڑھ سے سرسید کے کوئی ہمعصر دوست جو شاید وکیل بھی تھے اور مولوی کہلاتے تھے، انگلستان آئے ہوئے تھے۔ آرنلڈ نے اقبال کو بلا کر کہا، ''مولوی صاحب کو لندن

کی تمام قابلِ دید جگہیں اور چیزیں دکھا دو۔"

مولوی صاحب کی سفید داڑھی اور نُورانی چہرہ دیکھ کر اقبال کی رگِ ظرافت پھڑکی اور چڑیا گھر، عجائب خانہ اور تاریخی عمارتیں دکھانے کے بعد وہ انہیں قہوہ خانے لے گئے جہاں کچھ جسم فروش خواتین اقبال کے اشارے پر یا خود ہی مولوی صاحب کے پاس جمع ہو کر اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں۔ شاید ایک نے بڑھ کر اُن کے نورانی رخساروں پر اپنی عقیدت کی مہریں بھی ثبت کر دیں۔ مولوی صاحب آرنلڈ کے پاس پہنچے اور برس پڑے۔

اگلے روز آرنلڈ نے اقبال سے جواب طلب کیا تو اقبال نے کہا کہ اگر وہ مولوی صاحب کو قہوہ خانہ لے کر نہ جاتے تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے اور یکطرفہ خیالات لے کر جاتے جبکہ لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رُخ خواہ برا ہو یا بھلا بہت اہم ہے۔[۴۹]

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
غالبؔ

71

لاکھوں طرح کے لطف ہیں اس اضطراب میں
تھوڑی سی دیر اور ہو خط کے جواب میں
کیوں وصل کے سوال پہ چپ لگ گئی تمہیں
دو چار گالیاں ہی سنا دو جواب میں

گلدستہ نشتر، دسمبر[۵۰]

72

لندن میں کسی خاتون نے اقبال سے پوچھا، ''کیا ہندوستان میں آپ کے بستر کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟'' وہ بے چاری یہ سمجھتی تھی کہ ہندوستان کوئی بہت بڑا جنگل ہے جہاں سب لوگ جانوروں کے درمیان زندگی گزارتے ہیں۔

اقبال نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا، ''ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن۔''[۵۱]

73

پروفیسر براؤن کی فارسی ادب کی تاریخ کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس پر اقبال نے بھی تبصرہ کیا تھا اور وہ اُس زمانے میں شائع بھی ہوا۔[۵۲]

تیسرا حصہ

74

اگست میں شبلی کی کتاب سوانح مولانا روم شائع ہوئی جو پہلے سے مکمل پڑی تھی۔

اقتباس

یہ عجیب بات ہے کہ شمس تبریز سے ملاقات کا واقعہ جو مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہے تذکروں اور تاریخوں میں اس قدر مختلف اور متناقص طریقوں سے منقول کہ اصل واقعے کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

جواہرِ مضیٔہ جو علمائے حنفیہ کے حالات میں سب سے پہلی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے اُس میں لکھا ہے کہ ایک دن مولانا گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ تلامذہ آس پاس بیٹھے تھے چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا

تھا، اتفاقاً شمس تبریز کسی طرف سے آ نکلے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ یہ (کتابوں کی طرف اشارہ کر کے) کیا ہے۔ مولانا نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ یہ کہنا تھا کہ دفعتاً تمام کتابوں میں آگ لگ گئی۔ مولانا نے کہا یہ کیا ہے، شمس نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ شمس تو یہ کہہ کر چل دیے، مولانا کا یہ حال ہوا کہ گھر بار، مال اولاد سب چھوڑ چھاڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور ملک بہ ملک خاک چھانتے پھرے لیکن شمس کا کہیں پتہ نہ لگا۔ کہتے ہیں کہ مولانا کے مریدوں میں سے کسی نے شمس کو قتل کر ڈالا۔

زین العابدین شروانی نے مثنوی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ شمس تبریز کو ان کے پیر بابا کمال الدین چندی نے حکم دیا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے اُس کو گرم کر آؤ۔ شمس پھرتے پھراتے قونیہ پہنچے، شکرفروشوں کی کارواں سرائے میں اُترے، ایک دن مولانا روم کی سواری بڑے تزک و احتشام سے نکلی، شمس نے سرِ راہ ٹوک کر پوچھا کہ مجاہدہ و ریاضت سے کیا مقصد ہے۔ مولانا نے کہا اتباعِ شریعت، شمس نے کہا یہ تو سب جانتے ہیں، مولانا نے کہا، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے، شمس نے فرمایا علم کے یہ معنی ہیں کہ تم کو منزل تک پہنچا دے، پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا:

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل بہ علم بہ بود بسیار

مولانا پر ان جملوں کا یہ اثر ہوا کہ اُسی وقت شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ مولانا حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں، شمس نے پوچھا کہ یہ کیا کتابیں ہیں؟

مولانا نے کہا یہ قیل وقال ہے تم کو اس سے کیا غرض، شمس نے کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں، مولانا کو بہت رنج ہوا اور کہا کہ میاں درویش! تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دیں جواَب کسی طرح نہیں مل سکتیں، ان کتابوں میں ایسے نادر نکتے تھے کہ ان کا نعم البدل نہیں مل سکتا، شمس نے حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام کتابیں نکال کر کنارے پر رکھ دیں۔ لطف یہ کہ کتابیں ویسی ہی خشک کی خشک تھیں، نمی کا نام نہ تھا، مولانا پر سخت حیرت طاری ہوئی، شمس نے کہا یہ عالمِ حال کی باتیں ہیں تم ان کو کیا جانو؟ اس کے بعد مولانا ان کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔

ابنِ بطوطہ سفر کرتے کرتے جب قونیہ پہنچا ہے تو مولانا کی قبر کی زیارت کی تقریب سے مولانا کا کچھ حال لکھا ہے اور شمس کی ملاقات کی جو روایت وہاں تواتر سے مشہور تھی اس کو نقل کیا ہے چنانچہ وہ حسبِ ذیل ہے۔

مولانا اپنے مدرسے میں درس دیا کرتے تھے، ایک دن ایک شخص حلوا بیچتا ہوا مدرسے میں آیا، حلوے کی اس نے قاشیں بنالی تھیں اور ایک ایک پیسے کو ایک ایک قاش بیچتا تھا، مولانا نے ایک قاش لی اور تناول فرمائی۔

حلوا دے کر وہ تو کسی طرف نکل گیا ادھر مولانا کی یہ کیفیت ہوئی کہ بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے اور خدا جانے کدھر چل دیے، برسوں کچھ پتہ نہ چلا، کئی برس کے بعد آئے تو یہ حالت تھی کہ کچھ بولتے چالتے نہ تھے، جب کبھی حالت سنبھلتی تھی تو شعر پڑھتے تھے۔ ان کے شاگرد ان شعروں کو لکھ لیا کرتے تھے، یہی اشعار تھے جو جمع ہو کر مثنوی بن گئی۔ یہ واقعہ لکھ کر ابنِ بطوطہ لکھتا ہے کہ ان اطراف میں اس مثنوی کی بڑی عزت ہے، لوگ اس کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور اس کا درس دیتے ہیں، خانقاہوں میں شبِ جمعہ معمولاً اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔

جو روایتیں نقل ہوئیں ان میں سے بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں (مثلاً جواہر المضئیہ) بعض اور تذکروں میں منقول ہیں، بعض زبانی متواتر روایتیں ہیں لیکن ایک بھی صحیح نہیں، نہ صرف اس لحاظ سے کہ خارج از قیاس ہیں بلکہ اس لیے کہ جیسا آگے آتا ہے صحیح روایت کے خلاف ہیں۔ اس سے تم قیاس کر سکتے ہو کہ صوفیائے کبار کے حالات میں کس قدر دُور از کار روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور وہی کتابوں میں درج ہو کر سلسلہ بہ سلسلہ پھیلتی جاتی ہیں۔

سپہ سالار جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے مولانا کے خاص شاگرد تھے، چالیس برس فیضِ صحبت اٹھایا تھا، واقعہ نگاری میں ہر جگہ خرقِ عادت کی بھی آمیزش کرتے جاتے ہیں تاہم شمس کی ملاقات کا جو حال لکھا ہے سادہ صاف اور بالکل قرینِ عقل ہے چنانچہ ہم اس کو بہ تفصیل اس موقع پر نقل کرتے ہیں لیکن ملاقات کے ذکر سے پہلے مختصر طور پر شمس تبریز کے حالات لکھنے ضروری ہیں۔

شمس تبریز کے والد کا نام علاؤ الدین تھا۔ وہ کیا بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقۂ اسماعیلیہ کا امام تھا لیکن انہوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ شمس نے تبریز میں علمِ ظاہری کی تحصیل کی پھر بابا کمال الدین جندی کے مرید ہوئے لیکن عام صوفیوں کی طرح پیری مریدی اور بیعت و ارادت کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ سوداگروں کی وضع میں شہروں کی سیاحت کرتے رہتے۔ جہاں جاتے کارواں سرا میں اترتے اور حجرے کا دروازہ بند کر کے مراقبے میں مصروف ہوتے، معاش کا یہ طریقہ رکھا تھا کہ کبھی کبھی ازار بند بُن لیا کرتے تھے اور اسی کو بیچ کر کفاف مہیا کرتے۔ ایک دفعہ مناجات کے وقت دعا مانگی کہ الٰہی کوئی ایسا بندۂ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا،

عالمِ غیب سے اشارہ ہوا کہ روم کو جاؤ، اُسی وقت چل کھڑے ہوئے۔

قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا، برنج فروشوں کی سرائے میں اترے، سرائے کے دروازے پر ایک بند چبوترہ تھا، اکثر امرأ اور عمائد تفریح کے لیے وہاں آبیٹھتے تھے شمس بھی اسی چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے، مولانا کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو ان کی ملاقات کو چلے، راہ میں لوگ قدم بوس ہوتے جاتے تھے، اسی شان سے سرائے کے دروازے پر پہنچے۔ شمس نے سمجھا کہ یہی شخص ہے جس کی نسبت بشارت ہوئی ہے، دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک زبانِ حال میں باتیں ہوتی رہیں۔ شمس نے مولانا سے پوچھا کہ حضرت بایزید بسطامی کے ان دو واقعات میں کیونکر تطبیق ہوسکتی ہے کہ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ تمام عمر خربوزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول اللہ نے اس کو کس طرح کھایا ہے دوسری طرف اپنی نسبت یوں فرماتے تھے کہ سبحانی ما اعظم شانی (یعنی اللہ اکبر! میری شان کس قدر بڑی ہے) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم با ایں ہمہ جلالتِ شان فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں، مولانا نے فرمایا کہ بایزید اگرچہ بہت بڑے پائے کے بزرگ تھے لیکن مقام ولایت میں وہ ایک خاص درجے پر ٹھہر گئے تھے اور اس درجے کی عظمت کے اثر سے ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے، بخلاف اس کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منازلِ تقرب میں برابر ایک پائے سے دُوسرے پر چڑھتے جاتے تھے اس لیے جب بلند پائے پر پہنچتے تھے تو پہلا پایہ اس قدر پست نظر آتا تھا کہ اس سے استغفار کرتے تھے۔

مناقب العارفین کی روایت میں جزئی اختلافات کے ساتھ تصریح ہے کہ یہ ۶۴۲ھ کا واقعہ ہے اس بنا پر مولانا کی مسند نشینئ فقر کی تاریخ اسی سال

شروع ہوتی ہے۔

75

شبلی تحقیق نہیں کرتے تھے اپنی جان پر ظلم کرتے تھے۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں سات آٹھ کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک ایک کتاب کو لکھنا آٹھ آٹھ برس کا کام ہوتا۔ اب فارسی ادب کے بارے میں پروفیسر براؤن کی کتاب دیکھ کر اس بری طرح جھلائے تھے کہ کئی جلدوں میں فارسی ادب کی مکمل تاریخ لکھنے کی ٹھان لی اور اس کام کے لیے ندوہ سے چھٹی لی تو صرف تین مہینے کی!

بہر حال پہلے بنارس گئے اور پھر اپنے علی گڑھ کے زمانے کے ایک چہیتے طالب علم سے ملاقات کرنے بڑودہ چلے گئے۔ یہ نوجوان جن کی عمر اٹھائیس برس تھی مہاراجہ کی زمینوں سے حاصل ہونے والی افیون کو بیچنے کے ذمہ دار تھے اور ایسے دیانت دار تھے کہ ان کی وجہ سے منافع بہت بڑھ گیا تھا۔ نام محمد علی اور تخلص جوہر تھا۔ نظم معمولی کہتے تھے مگر انگریزی نثر ایسی تھی جس پر انگریز رشک کیا کرتے۔ انگلستان کے پڑھے ہوئے تھے۔

شبلی اس بار مولانا محمد علی جوہر سے ملے تو اُنہوں نے مارگولیتھ کی لکھی ہوئی سیرۃ النبیؐ کی طرف اُستاد کی توجہ دلائی جس میں رسول اکرمؐ کے مرتبے سے غفلت برتی گئی تھی۔ شبلی نے اس بات سے اتفاق کیا کہ کسی مسلمان کو ایسی مکمل سیرۃ النبی لکھنی چاہیے جس کے بعد ایسی کتابوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

مولانا محمد علی نے شبلی سے اورنگزیب عالمگیر کے دفاع میں کچھ مضامین لکھنے کی فرمائش بھی کی۔ شبلی کے جذبات ایسے ہی علمی تقاضوں سے مہمیز ہوا کرتے تھے چنانچہ پچھلے ارادوں میں یہ نئے منصوبے بھی شامل ہو گئے بلکہ شاید ایک دو روز خیالوں میں رہ کر اُنہیں خوابوں میں مکمل بھی کر لیا ہو گا کیونکہ بڑودہ سے نکلے تو بمبئی پہنچے اور نجانے کتنی مدت کے بعد اپنے آپ کو اجازت دی کہ تھوڑا سا آرام کر لیں۔

وہاں کی دلچسپ فضا کا ایسا اثر ہوا کہ اُنیس برس بعد دوبارہ فارسی میں غزل لکھنا شروع کردیا۔

76

بمبئی کے قریب جزیرہ تھا جسے وہاں کے لوگ اپنے تلفظ میں جنجیرہ کہتے تھے۔ وہاں اُنہی حسن آفندی کا خاندان رہتا تھا جن سے شبلی کی ملاقات بارہ برس پہلے ترکی میں ہوئی تھی۔ بڑی لڑکی کی شادی جنجیرہ کے نواب سے ہوئی تھی۔

حسن آفندی فوت ہو چکے تھے مگر اُن کی بیوہ اپنے لڑکے اور دو چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ جنجیرہ میں رہتی تھیں۔ وہ دونوں جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ایک کا نام زہرہ فیضی تھا اور کافی مشہور تھیں کیونکہ اُن کا سفرنامہ لاہور میں مولوی ممتاز علی کے ماہنامہ تہذیبِ نسواں میں قسط وار شائع ہوتا تھا۔ سب سے چھوٹی کا نام عطیہ فیضی تھا۔

عطیہ فیضی کی عمر چوبیس برس تھی مگر نقوش نازک تھے لہٰذا اور بھی کم عمر نظر آتی تھیں۔ انہیں مغرب کی کلاسیکی موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا مگر غالباً شبلی کی خاطرداری کے لیے حافظ کی کوئی غزل سنائی۔

بمبئی سے واپس لکھنؤ گئے تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا جس میں یہ اکثر اُن کی بمبئی والی اُردو کی غلطیاں درست کرتے تھے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ اُن مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں،'' انہوں نے لکھا۔ ''اگر یہ موقع ملا تو میں پھر چاہوں گا کہ تمہاری کچھ علمی خدمت کر سکوں، تم کو فارسی پڑھاؤں اور اُردو کی انشا پردازی سکھاؤں۔''

77

غالباً ستمبر میں کسی وقت اقبال کو جولائی کا مخزن ملا جس میں دُرگا سہائے سرور

جہاں آبادی کی ایک نظم 'فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال' شامل تھی۔ سرور نے اقبال سے کسی نئی تخلیق کا مطالبہ کیا تھا۔

78

یکم اکتوبر کی صبح ٹھیک گیارہ بجے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو شملہ کے شاہی محل کے دیوانِ خاص میں داخل ہوئے۔ آغا خاں سوئم جو کچھ دن پہلے نواب وقارالملک کی درخواست پر چین کا دورہ منسوخ کر کے واپس آئے تھے چونتیس دوسرے مسلمانوں کے ساتھ دیوانِ خاص میں موجود تھے۔ ان سب کا تعلق مراعات یافتہ طبقے سے تھا۔

آغا خاں کی تقریر ایک نفیس پارچے پر لکھ کر پہلے سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کی جا چکی تھی جسے خود وائسرائے نے بلند آواز میں پڑھ کر سنایا۔ آغا خاں نے درخواست کی تھی کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا خاص خیال رکھا جائے کیونکہ مسلمان ماہرینِ تعلیم اپنے نوجوانوں کو اچھے کردار اور انگریز حکومت سے وفاداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہندوستان میں جمہوریت نافذ کرنے کے برطانوی منصوبے کے خلاف مسلمان جاگیرداروں میں جو بےچینی پھیل رہی تھی اس کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔

''ہم درخواست کرتے ہیں کہ کسی بھی طرح کی نمائندگی میں مسلمان برادری کی حیثیت متعین کرتے ہوئے صرف اُن کی کثیر تعداد (باسٹھ ملین سے زیادہ) ہی نہیں بلکہ اُن کی سیاسی اہمیت اور برطانوی سلطنت کی افواج میں اُن کے حصے کو بھی نظر میں رکھا جائے،'' آغا خان کی تقریر میں درج تھا۔ ''ہمیں محض ایک اقلیت نہ سمجھا جائے، ہم ایک قوم میں دوسری قوم ہیں جس کے حقوق کو باقاعدہ تحفظ فراہم ہونا چاہیے۔''

وائسرائے انگلستان کے قدامت پسند جاگیرداروں میں سے تھا۔ اُس نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ مشرقی نسل کی پیدائشی جبلتوں اور روایات پر مغربی طرز کی سیاست کو مسلط کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ سہ پہر کو ایک گارڈن ٹی پارٹی میں وفد نے لیڈی منٹو سے کہا کہ اب اُنہیں یقین ہو گیا ہے کہ وائسرائے اُن کا دوست ہے۔

آغا خان سوئم نے لارڈ منٹو کو جو لکھی ہوئی تقریر پیش کی تھی اُس میں پہلی دفعہ ہندوستان کے مسلمانوں کے قومی مفادات کا تذکرہ ہوا۔ یہ گویا مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کا اعلان تھا۔ ہندوستان میں جس مسلمان نے اس کی سب سے زیادہ مخالفت کی وہ بمبئی کے نوجوان بیرسٹر محمد علی جناح تھے۔[۵۳]

79

ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو ایک غیر سیاسی ذہن رکھنے والے کھرے مزاج کے منتظم تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان میں صدیوں پرانی روایات کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور یہ روایات بہر حال مطلق العنان بادشاہوں کے سائے میں پروان چڑھی ہیں چنانچہ ان کا جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

وہ اِنہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر ملک کا بندوبست کر رہے تھے مگر لندن میں ہندوستانی امور کے وزیر لارڈ مورلے کا تعلق لبرل پارٹی سے تھا اور ان کے نزدیک ۱۸۲۳ء میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج کے ساتھ ہی گویا اس ملک کے مستقبل کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں جمہوریت اور نئی طرز کے ادارے قائم نہ ہونے سے اُس نئی نسل میں ذہنی انتشار پھیلنے کا اندیشہ تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے ملک کے عام لوگوں کے برعکس جمہوری طرزِ حکومت سے واقف تھی۔

اب کچھ عرصے سے خبر گرم تھی کہ وائسرائے منٹو اور وزیرِ ہند مارلے اکٹھے ہو کر ہندوستان کوئی آئینی اصلاحات دینے والے ہیں۔ اِس خبر سے جہاں کانگریس انتہاپسند اور اعتدال پسندوں میں بٹ گئی تھی وہاں کئی مسلمان رہنماؤں کو بھی فکر لاحق ہوئی تھی کہ نئی اصلاحات کے بعد اُن کا مستقبل کیا ہوگا اور اگر ہندوستان میں جمہوری ادارے قائم ہوئے تو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کہیں مسلمانوں کو ہندوؤں سے دب کر تو نہیں رہنا پڑے گا؟

اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضورؐ نے حضرت علیؓ یا کسی اور کو کوئی پوشیدہ تعلیم دی تھی مگر قرآن میں کم از کم ایک آیت ضرور انہیں نظر آئی تھی جس میں یہ اشارہ تھا کہ رسول اللہ نے قرآن کی تعلیم کے علاوہ بھی کوئی چیز امت کو دی ہے۔ یہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۶ تھی جس میں رسول اللہ کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ ''ہماری آیتیں تمہیں سناتے ہیں، تمہارا تزکیہ کرتے ہیں، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تمہیں وہ سکھاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔'' اگر حکمت بھی کتاب میں شامل ہے تو پھر کیا یہ لفظ غیر ضروری نہیں معلوم ہو گا؟

''میرے خیال میں بڑی آسانی سے دکھایا جا سکتا ہے کہ قرآن اور مستند حدیثوں میں تصوف کے بیج موجود ہیں،'' اقبال نے لکھا۔ ''عرب میں اُنہیں پروان چڑھنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ عربوں کا مزاج پوری طرح عمل پسندی کی جانب مائل تھا۔ دوسری سرزمینوں میں پہنچنے کے بعد یہ ایک بھرپور نظامِ فکر کی صورت میں نمایاں ہوئے۔'' اس طرح گویا تصوف کی ابتدا ہوئی۔

نکلسن کا خیال تھا کہ تصوف نوافلاطونی فلسفے کی وجہ سے شروع ہوا۔ پروفیسر براؤن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ تصوف سامی نسل کے عربوں کے غیر جذباتی مذہب کے خلاف آریائی نسل کا ردِ عمل تھا۔ اقبال کو اپنے دونوں اساتذہ سے اختلاف تھا۔

''کوئی خیال اُس وقت تک کسی قوم کے ذہن میں جڑ نہیں پکڑ سکتا جب تک کہ وہ اُس قوم کا اپنا خیال نہ ہو،'' اُنہوں نے لکھا۔ چنانچہ تصوف کی ابتدا کا سراغ لگانے کے لیے بھی اُن مخصوص فکری، سماجی اور سیاسی حالات کا جائزہ لینا چاہیے جن سے ایران یا عالمِ اسلام دسویں صدی کی ابتدا میں دوچار تھا۔ دراصل ایرانی ذہن میں پہلے سے کچھ ایسی خصوصیات موجود تھیں کہ جب ایک مخصوص صورت حال پیدا ہوئی تو اُس نے قرآن کی بعض آیتوں کے ایسے معانی تلاش کر لیے جو عمل پسند عربوں کی نگاہوں سے چھپے رہے

تھے۔انہی نئے دریافت کیے ہوئے معانی کی بنیاد پر تصوف کی عمارت کھڑی ہوئی۔

مگر وہ صورت حال کیا تھی جس نے ایرانی ذہن کو تصوف کی طرف مائل کیا؟ مامون اور امین کی خانہ جنگی، مختلف بغاوتوں میں سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا نام استعمال ہونا، عقلیت پسندی کا عام ہونا اور اسلامی فکر میں غیر جذباتی سُنّی مکاتیبِ فکر کا وجود میں آنا، اِن سب باتوں کے ردِعمل میں تصوف کا آغاز ہوا جو مذہب کا یہ تصور پیش کرتا تھا کہ سب سے محبت کی جائے اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کو فراموش کردیا جائے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نویں صدی عیسوی میں مذہبی انتہا پسندی میں کمی آ چکی تھی اور مختلف مذاہب کے علماٗ کے درمیان مکالمہ ہورہا تھا۔ چنانچہ عیسائی راہبوں کی مثالیں بھی مسلمانوں کے سامنے رہی ہوں گی۔ اقبال کا خیال تھا کہ صوفیوں نے عیسائی راہبوں سے ترکِ دنیا کا سبق لیا تھا ورنہ یہ اِسلام کی رُوح کے خلاف تھا۔

سامی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی ہدایات میں لچک نہیں ہے۔ دُوسری طرف ویدانت ایک سرد نظامِ فکر ہے۔ اِن دونوں کے برعکس صوفی انسانی فطرت کا ایک مکمل تصور پیش کرتا ہے۔ ایک طرف وہ بُدھ مت سے فنا کا تصور لیتا ہے اور اپنے تصورِ کائنات کی بنیاد اِس عقیدے پر رکھتا ہے کہ خدا کے سوا ہر شے کو بالآخر فنا ہونا ہے۔ دوسری طرف وہ اِس تصور کا جواز قرآن سے تلاش کرکے قرآن کے اُن معانی کو بے نقاب کرتا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے۔

غزل

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، رَم کے سوا کچھ بھی نہیں

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو، مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
زائرانِ کعبہ سے اقبال! یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں[۵۴]

82

سیالکوٹ میں بے جی یعنی امام بی بی نے محلے کی جن غریب لڑکیوں کو اپنے گھر رکھا ہوا تھا تا کہ اُن کی تربیت کر کے شادی کر دیں، اُن میں سے کسی کو بے جی کی کسی بیٹی نے بازار سے کوئی چیز لانے بھیج دیا۔ بے جی نے اُس لڑکی کو بازار سے واپس آتے دیکھ لیا۔

''جب اُنہیں معلوم ہوا کہ اُسے پھوپھی جی نے بھیجا تھا تو بیچاری پھوپھی جی کی شامت آ گئی،'' عطا محمد کے بڑے لڑکے اعجاز احمد کا بیان ہے۔ ''بار بار اُنہیں کہتیں، تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو تم اُسے بازار بھیجتیں؟ اس واقعے کے بعد اُن لڑکیوں کے گھر سے نکلنے پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔''[۵۵]

83

کسی تالاب میں مچھلیاں رہتی تھیں، اُنہیں احساس ہوا کہ پانی میں وہ رہتی اور حرکت کرتی ہیں اور یہی پانی اُن کی زندگی کا ذریعہ بھی ہے مگر خود اس کی حقیقت سے وہ بے خبر ہیں۔ وہ مچھلیاں دریا میں رہنے والی کسی سمجھدار مچھلی کے پاس گئیں اور اپنا سوال پیش کیا۔

اُس نے کہا، ''اے کہ تم وجود کا عُقدہ کھولنا چاہتی ہو! تم وصال میں پیدا ہوئی ہو مگر ایک خیالی جدائی کے تصور میں مرتی ہو۔ ساحل پر پیاسی! مفلسی میں مرنے والی جبکہ خزانوں کی کنجیاں تمہارے پاس ہوں!''

صوفی نسفی نے یہ کہانی بیان کی تھی اور پھر کہا تھا، ''اے درویش! کیا تُو سمجھتا ہے کہ تیرا وجود خدا سے الگ ہے؟ یہ بہت بڑی بھول ہے۔''

وہ صوفیوں کے اُس گروہ میں سے تھے جس نے ذاتِ حق کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ توجہ دی تھی۔ رومی بھی انہی میں سے تھے۔

اِن لوگوں کے خیال میں حُسنِ ازل یا حقیقتِ اصلی لامحدود ہے۔ اُس کا نہ شروع ہے نہ آخر، نہ دایاں نہ بایاں، نہ اوپر نہ نیچے۔ کائنات یا فطرت آئینہ ہے جس میں حسنِ ازل اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ مگر آئینہ دو طرح کا ہوتا ہے...

نسفی نے یہ بات جس رسالے میں کہی تھی اُس کا مطالعہ تو شاید اقبال نے ٹرنٹی کالج کی لائبریری میں کیا ہو مگر غالباً دوسرے ذرائع سے یہ بات بہت پہلے اُن کے علم میں آ چکی تھی اور اُنہوں نے اپنی نظم 'انسان اور بزمِ قدرت' میں بیان کی تھی۔ [۵۱]

صوفیوں کے دوسرے گروہ نے ذاتِ حق کو ایک خالص فکر کے طور پر پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ اِس گروہ کا نمائندہ اُن کا پرانا ہیرو ابن الجیلی تھا۔ انہوں نے اپنا *Indian Antiquary* والا مقالہ تقریباً پورا ہی یہاں شامل کرلیا۔

ایک اور گروہ بھی تھا جو ذاتِ حق کو ارادے کے طور پر پہچانتا تھا۔ اِس میں رابعہ بصری، شفیق بلخی اور ابراہیم ادہم جیسے لوگ شامل تھے مگر یہ سوچ بچار سے زیادہ عمل پر زور دیتے تھے لہٰذا مابعد الطبیعات کی بحث میں ان کا کوئی خاص حصہ نہ تھا۔ اقبال نے ان کا سرسری تذکرہ کیا۔

غزل

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری، ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں
شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چُھپا جاتا ہُوں اپنے دِل کا مطلب استعارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پُھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے
میں
مجھے پُھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے
میں
مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا
تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

غالباً اکتوبر میں کسی وقت اقبال نے ۱۲ اشعار کی یہ غزل اس نوٹ کے ساتھ مخزن میں اشاعت کے لیے شیخ عبدالقادر کے حوالے کی کہ ''گو مصروفیت کا وہی عالم ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حضرت سرور جنہوں نے خاموشی کو توڑنا چاہا ہے کہیں ناراض نہ ہو جائیں، اِس لیے اُن کی نظم کے شکریے میں سرِ دست یہ غزل بھیجتا ہوں۔ اُمید ہے کہ عنقریب کچھ اور بھی بھیجوں گا۔''

سوامی رام تیرتھ جن سے اقبال نے چند برس پہلے سنسکرت سیکھی تھی اور جو ویدانت کی روشنی پھیلانے امریکہ گئے تھے، کچھ عرصہ قبل وطن لوٹ آئے تھے مگر لاہور آنے کی بجائے لکشمن جھولا چلے گئے۔

اُن کا جذب گہرا ہو رہا تھا۔ ہر ذرے میں خدا نظر آتا تھا۔ اپنے گرو کو خط لکھا تو بس اتنا کہ کر بات ختم کر دی، ''آپ اور میں ایک ہیں۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

نومبر میں ایک روز پانی میں نہاتے ہوئے پتھر سے پھسلے اور گنگا میں غوطہ کھانے لگے۔ جب دیکھا کہ ڈوبنے والے ہیں تو زور سے بولے، ''اگر تیری قسمت میں اسی طرح مرنا تھا تو یہی سہی۔''

لاش برآمد ہوئی تو مشہور ہوا کہ سوامی جی کا جسم بالکل سمادھی کی حالت میں تھا اور منہ اس طرح کھلا ہوا تھا گویا 'اوم' کہہ رہے ہوں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دریا میں اس لیے اُترے تھے کہ اُنہیں ہر طرف برہما نظر آ رہا تھا اور عین دریا کے بیچ اُن پر رام کی محبت طاری ہو گئی جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی بچانے کی فکر نہ کر سکے۔

سوامی کی وفات کی خبر اقبال کو پہنچی تو اُنہوں نے سوچا، عشق ایک ابراہیم ہے جو زندگی کے بت کو پاش پاش کر کے مخلوق کو خدا سے ملا دیتا ہے۔ جس پر ہمیشہ کی زندگی کی سچائی روشن ہو جائے وہ دنیاوی زندگی کی پروا نہیں کرتا: ؎

کیا کہوں زندوں سے میں اُس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی

''وحشی تاتاری حملہ آوروں کو بھلا آزاد خیالی سے کیا رغبت ہو سکتی تھی، چنانچہ اُن کے زیرِ سایہ فلسفے کی نشوونما کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا،'' اقبال نے دَورِ آخر کے ایرانی فلسفے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا۔ ''تصوف کا واسطہ چونکہ مذہب سے تھا لہٰذا اس کے دائرے میں رہتے ہوئے پرانے افکار بھی منظم ہوتے رہے اور نئے خیالات بھی ترقی پاتے رہے مگر خاص فلسفہ تاتاری مزاج کے لیے ناگوار تھا یہاں تک کہ اسلامی فقہ کی ترقی کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ تاتاریوں کے نزدیک حنفی فقہ انسانی سوچ کی معراج تھی اور قانون کی اس سے زیادہ نفیس تعبیریں اُن کے ذہن سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔''

اقبال نے ملا صدرا کا ذکر کیا تھا جن کے نزدیک ''حقیقت ہر شے تھی اور ان میں سے کوئی شے بھی نہیں تھی۔ سچا علم موضوع (subject) اور معروض (object) کی پہچان پر مبنی تھا۔''

سترہویں صدی کے ملا ہادی کو اقبال نے کتاب کے اس حصے میں سب سے زیادہ اہمیت دی۔ ہادی کہتے تھے کہ کائنات کا بغور مطالعہ کر کے ہم تین چیزوں کو پہچان سکتے ہیں: ا۔حقیقت، جو روشنی ہے۔ ۲۔سایہ، اور ۳۔غیر حقیقت، جو اندھیرا ہے۔

وہ جو حقیقی ہے وہ حتمی بھی ہے اور ضروری بھی ہے جبکہ سایہ اضافی ہے اور دوسرے پر انحصار کرتا ہے۔ یہ حقیقی فطری طور پر اچھا ہے اور اسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی حقیقی کسی بھی امکان کو واقعہ بناتا ہے۔ واقعہ بننے سے پہلے اُس امکان کے لیے واقعہ بننے اور نہ بننے کے راستے کھلے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے دلائل سے ملا ہادی یہ ثابت کرتے ہیں کہ حقیقی ہستی یعنی خدا موجود ہے اور ایک ہے۔ وہی ہر شے کو آگے بڑھنے اور مکمل ہو جانے کی ترغیب دے رہا ہے۔ بے جان پتھر، جان دار نباتات بننا چاہتا ہے۔ نباتات حیوان بننا چاہتے ہیں اور حیوان سے اگلا مرحلہ انسان ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ماں کے رحم میں انسان ان تمام مراحل سے گزرتا ہے۔

87

انیسویں صدی کے ایران میں ایک نئی تحریک نمودار ہوئی۔ مرزا محمد علی باب شیعہ فرقے کے ایک فرد تھے مگر انہوں نے غائب امام اور باقی دنیا کے درمیان واسطہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ جیسے جیسے اس فرقہ پر سختیاں ہوئیں ان کے بنیادی عقاید اسلام سے جدا ہوتے گئے۔

محمد علی باب کے عقاید کا جائزہ لینے کے بعد اقبال نے لکھا۔ ''بہائیت خالص تخیل اور خواب آلود تصوف کا راستہ روکتی ہے۔ مخالفت سے بے پروا، یہ ماضی سے ورثے میں ملنے والے تمام فلسفیانہ اور مذہبی رجحانات کو تحلیل کر کے انسانی رُوح کو اشیاً کی حقیقت

کا زبردست شعور عطا کرتی ہے۔ ممکن ہے بہائیت کا یہ غیر صوفیانہ کردار اور عمل پسند رویہ ہی ایران میں حالیہ سیاسی ترقی کا دُور دراز سبب رہا ہو۔"

88

دسمبر کے مخزن میں اقبال 'چمک تیری عیاں' والی غزل درگا سہائے کے نام ان کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ سات ماہ بعد مخزن میں ان کی کوئی نظم چھپی تھی۔[۵۸]

89

ایک دن اقبال کو معلوم ہوا کہ وہ اپنے یہودی میز بانوں کے ذریعے جو چیز بھی بازار سے منگواتے ہیں میز بان اُس میں سے اپنا کمیشن کاٹ لیتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی مگر اُن کے لیے یہ انکشاف بمبئی کے بوڑھے پارسی کی بوتل سے کم نہ تھا۔ طبیعت بیزار ہوگئی۔[۵۹]

دسمبر ۱۹۰۶ء ہی میں یا اگلے برس انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنی اقامت گاہ تبدیل کی اور ۹۰ ہن ٹنگ ٹن روڈ منتقل ہو گئے۔ ممکن ہے یہ وہی مکان ہو جس کی بوڑھی مالکن کے بارے میں اقبال کا بیان ہے کہ وہ اس بات پر اکثر حیران ہوتی تھی کہ اقبال غسل خانے جاتے ہوئے ایک عجیب سی چیز اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ چیز ایک لوٹا تھا۔

آخر ایک دن اُس سے رہا نہ گیا اور اُس نے پوچھ ہی لیا، "تم یہ چیز غسل خانے میں کیوں لے جاتے ہو؟" اقبال نے اُسے لوٹے کا مقصد سمجھایا اور یہ بھی بتایا کہ اسلام میں کن کن موقعوں پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ پھر کہا، "بڑی بی کسی خاص غسل کی تو آپ کو حاجت نہ ہوگی البتہ طہارت کے لیے پانی ضرور استعمال کیا کیجیے۔"

اقبال کہتے تھے کہ وہ بڑی بی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئیں۔[۶۰]

ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں بیماری کی وجہ سے اکتوبر کے شملہ وفد میں شریک نہ ہو سکے تھے۔اب وہ صحت یاب ہو گئے اور فرمائش کی کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اُن کے شہر میں منعقد ہو۔شاید مولوی میر حسن کو بھی دعوت نامہ سیالکوٹ بھیجا گیا ہو گا مگر وہ طویل فاصلے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔اجلاس ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ کے شاہ باغ میں منعقد ہونا تھا۔

اجلاس سے پانچ روز قبل دارالحکومت کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا بیسواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں محمد علی جناح ۴۴ ہم خیال مسلمانوں اور ڈیڑھ ہزار ہندوؤں، پارسیوں اور عیسائیوں کے ساتھ شریک ہوئے۔دادا بھائی نوروجی اس کی صدارت کر رہے تھے جن کی تقریر لکھوانے میں بیرسٹر جناح نے خاصی مدد کی تھی۔

نوروجی اتنے ضعیف ہو چکے تھے کہ ان کی تقریر گوکھلے کو پڑھ کر سنانی پڑی۔ ''تمام مذاہب اور ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو متحد ہو کر اپنے مستقبل کی تعمیر کرنی چاہیے،'' تقریر میں کہا گیا تھا۔ ''بنگال کی تقسیم انگلستان کی نہایت بدنما غلطی ہے لیکن اگر ہم چاہیں تو مظاہروں کے ذریعے اِسے دُرست کروا سکتے ہیں۔''

اِسی جلسے میں جناح کی ملاقات سروجنی نائیڈو سے ہوئی۔وہ شاعرہ تھیں اور اُردو، ہندی اور انگریزی پر عبور رکھتی تھیں۔جناح کی شخصیت نے انہیں متاثر کیا اور بمبئی کے اونچے حلقوں میں یہ تاثر پھیل گیا کہ وہ ان کی وجاہت سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔

''خدا نہ کرے، اگر انگریز اس ملک سے چلے جائیں تو ہندو حکومت کریں گے،'' ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نواب وقارالملک نے کہا۔ ''اور ہمیں ہر وقت جان، مال اور عزت کا دھڑکا لگا رہے گا۔''

اِسی کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ اب ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے سیاست

میں شریک ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اُنہیں کانگریس سے دُور کرنے کے لیے مسلمانوں کی ایک نمائندہ سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ آغا خاں اجلاس میں شریک نہ ہو سکے تھے مگر انہیں جماعت کا صدر نامزد کیا گیا اور جماعت کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔

چوتھا حصہ

92

سات سمندر پار بیٹھے اقبال نے مسلم لیگ کے قیام کی خبر اخبار میں پڑھی ہوگی اور ممکن ہے اس نے اُنہیں بعض نتائج پر پہنچنے میں مدد دی ہو۔ شاید اُنہیں نظر آیا ہو کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی شناخت کا نظریہ جس کا اعلان چند نوابوں اور جاگیرداروں نے کیا ہے اُسے عوام کے جذباتی روّیے میں بھی ڈھالا جا سکتا ہے اور خود اقبال اپنی شاعری کے ذریعے یہ کام کر سکتے ہیں۔

93

اُس برس شائع ہونے والی کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[1]

Blunt, Wilfrid. *Secret History of the English Occupation of Egypt*. London, T. Fisher

Bon, Gustave Le. *The Evolution of Matter* (Translated by F. Legge). London, The Walter Scott Publishing

Forrest, J. Dorsey. *The Development of Western Civilization*. Chicago, University

Francke, Kuno. *A History of German Literature*. New York, Henry Holt

Gibbon, Edward. *The History of the Decline and Fall of the Roman Empire* (Volumes 1-7). Oxford, University Press.

Green, Thomas Hill. *Lectures on the Principles of Political Obligation*. New York, Longmans Green

Jalal Uddin Qazi. *The Abbasids, Part 1*. Moradabad, A.M. Zaman Bros. Publishers

Kellogy, Vernon L. *Darwinism Today*. London, George Bell

Loria, Archille. *The Economic Foundations of Society*. London, Swan

Scott, Sir Walter. *Waverley Or Its Sixty Years Since*. London, Cassell

Seignobos, Charles. *History of Ancient Civilization*. London, T. Fisher

Seligman, Edwin, R. A. *The Economic Interpretation of History*. New York, Columbia University Press

Whittaker, Thomas. *The Liberal State: A Speculation*. London, Watts

94

مقالہ شاید فروری ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوا۔ میک ٹیگرٹ سے منظور کروانے کے بعد اقبال نے چند کاپیاں چھپوانے کے لیے اسے ٹائپ رائیٹنگ بیورو کے حوالے کیا جو ۵ کنگز پریڈ پر واقع تھا۔[۱۲] اب ذرا فراغت نصیب ہوئی ہوگی۔

مقالہ یونیورسٹی کے مطلوبہ معیار سے بہت اونچا تھا اور علم کی دنیا میں نیا اضافہ تھا، چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ میک ٹیگرٹ یا نکلسن نے اقبال سے کہا کہ وہ اِسی مقالے کو ذرا سی اصلاح کے ساتھ جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے داخل کروا سکتے ہیں۔

شیخ عطا محمد کی رائے تھی کہ اقبال بی اے کے بعد بیرسٹری کی ڈگری لے کر واپس آجائیں مگر اب اقبال نے اُنہیں پی ایچ ڈی کے ارادے کی اطلاع دیتے ہوئے مزید رقم کی درخواست کی۔

عطا محمد نے فراخ دلی سے وہ رقم بھجوا دی۔ ایک روز دوستوں کی محفل میں کسی نے دریافت کرلیا کہ "کیوں شیخ صاحب، سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟" تو کہنے لگے، "بھئی کیا بتاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لیے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا اجر کب ہوگا۔"[۱۳]

95

فروری میں اکبر الہ آبادی کے بیٹے عشرت قانون میں بی اے کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس چلے گئے۔

96

۲۵ فروری کو انگلستان سے بہت دُور پنجاب کے شہر ملتان میں وہ شمع بجھ گئی جس کی روشنی میں اقبال کی زندگی کا پہلا یادگار مشاعرہ ہوا تھا۔ مرزا ارشد گورگانی اٹھاون برس کی

عمر میں وفات پا گئے۔[۱۴]

97

حیدرآباد دکن میں اقبال کے مداحوں نے اقبال کلب بنائی ہوئی تھی۔ دکن کے حکمران نظام نواب محبوب علی خاں کی سالگرہ کے موقع پر اقبال کلب نے اپنا سالانہ جلسہ بھی منعقد کیا اور اس میں شرکت کے لیے ریاست کے وزیرِ اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کو دعوت دی۔

کشن پرشاد کو نواب صاحب سے اجازت لینی ضروری تھی مگر یہ اجازت مل گئی۔[۱۵]

98

۷ مارچ کو اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں اپنا مقالہ داخل کروا دیا۔ پونے دو برس کی محنت رنگ لائی تھی۔

اُس روز کلیۂ اخلاقیات کے خصوصی بورڈ (Special Board for Moral Science) کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت پروفیسر کینز کر رہے تھے۔ وارڈ، سورلے، میک ٹیگرٹ اور رِوَرز بھی میٹنگ میں شامل تھے۔ فیصلہ ہوا کہ سورلے اس سلسلے میں نکلسن سے رابطہ کریں گے۔ وہ اور نکلسن یا براؤن اقبال کے مقالے کو جانچیں گے۔

مقالے کے عنوان میں ترمیم ہو چکی تھی۔ اب عنوان تھا:

Development of Metaphysics in Persia

99

حق میں آزادوں کے ہے قیدِ تعلق کیمیا
بن گئی گوہر جو موجِ آب زندانی ہوئی"

100

اس برس اقبال کی عمر تیس برس ہونے والی تھی اور اُن کے اپنے حساب سے ہو بھی چکی تھی۔

101

زرتشت کی عمر تیس برس تھی جب وہ اپنا گھر اور گھر والی جھیل چھوڑ کر پہاڑوں میں چلا گیا، جرمن فلسفی شاعر نیٹشے نے اپنی تخیلاتی کتاب زرتشت نے کہا میں لکھا تھا۔

زرتشت کی رُوح نے پہاڑوں میں سکون پایا۔ اس نے اپنی تنہائی کا لطف اٹھایا اور دس سال تک بیزار نہ ہوا۔ پھر اُس کا دل بھر گیا اور ایک دن وہ طلوعِ سحر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، سورج کے سامنے آیا اور اُسے مخاطب کر کے کہا۔

''اے عظیم ستارے! تیری خوشی کہاں ہو اگر وہ نہ ہوں جن کے لیے تُو چمکتا ہے! تُو یہاں میرے غار پر دس سال آتا رہا ہے۔ اگر میں، میرا شاہین اور میرا سانپ نہ ہوتے تو تُو اپنی روشنی اور اپنے سفر سے تنگ آ جاتا۔ مگر ہم نے ہر صبح تیرا انتظار کیا، تیری کھرچن تجھ سے وصول کی اور تیرا احسان مانا۔

''دیکھ! میں اپنی دانائی سے تنگ آ گیا ہوں، شہد کی اُس مکھی کی طرح جو ضرورت سے زیادہ شہد جمع کر بیٹھی ہو۔ میں وہ ہاتھ چاہتا ہوں جو اِسے لینے کے لیے بڑھے ہوئے ہوں۔ میں اپنی دانائی سے دامن جھاڑنا چاہتا ہوں اور اسے بانٹ دینا چاہتا ہوں یہاں تک کہ جو انسانوں میں سے عقل مند ہیں وہ دوبارہ اپنی حماقت پر راضی ہو جائیں اور جو غریب ہیں وہ اپنی امیری پر خوش ہو جائیں۔

''مجھے پستیوں میں اُترنا پڑے گا جس طرح اے عظیم ستارے تُو ہر شام اُترتا ہے جب تُو سمندروں کے نیچے چلا جاتا ہے تاکہ پاتال کو روشن کر دے۔ مجھے آشیرباد دے اے مطمئن آنکھ کہ تُو بڑی سے بڑی مسرت کو بغیر رشک اور حسد دیکھنے پر قادر ہے۔ اس جام کو آشیرباد دے جو چھلکنا چاہتا ہے تاکہ اس کے پانی تمام دنیا پر محیط ہو جائیں اور

تیری خوشیوں کے سنہرے عکس سب کے سامنے پیش کریں۔ دیکھ یہ جام دوبارہ خالی ہونا چاہتا ہے اور زرتشت دوبارہ انسان ہو جانا چاہتا ہے!"

اِس طرح زرتشت نے نیچے اترنا شروع کیا۔

102

نیٹشے کا زرتشت اُن تاریخی زرتشت سے بہت مختلف تھا جنہوں نے پارسی مذہب کی بنیاد ڈالی تھی۔ نیٹشے نے اس کردار کو اپنے فلسفے کے اظہار کے لیے استعمال کیا تھا جس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ اب خدا کا وجود باقی نہیں رہا ہے اور اس کی جگہ زمین مقدس ہے۔

ارتقا کے سلسلے میں ہر مخلوق نے اپنے سے بہتر کسی مخلوق کو جنم دیا ہے، زرتشت نے کہا۔ پھر کیا تم چاہتے ہو کہ یہ سلسلہ تم پر ختم ہو جائے اور تم انسان کے مرحلے سے آگے بڑھنے کی بجائے دوبارہ جانور بن جاؤ؟

انسان سے اگلا مرحلہ سپرمین یعنی فوق البشر تھا۔ بستی کے لوگ ایک کرتب دکھانے والے کے انتظار میں جمع تھے جو رسی پر چل کر دکھاتا تھا۔ زرتشت نے اُن سے کہا، انسان بھی ایک رسی ہے جو حیوان اور سپرمین کے درمیان تنی ہوئی ہے۔

103

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے نیٹشے کا مطالعہ کب شروع کیا مگر اس بات کا امکان ہے کہ یہ مطالعہ کیمبرج کے دنوں میں شروع ہوا ہو۔

بہر حال اب انگلستان سے جرمنی جانے کا وقت آ رہا تھا۔ شاید انہی دنوں اقبال نے ایک نوٹ بک میں شناساؤں کے پتے جمع کرنا شروع کیے۔[۱۷]

104

ایک روز اقبال نے شیخ عبدالقادر سے کہا کہ تمام اسلامی ممالک کی ایک عالمگیر

کانفرنس منعقد ہونی چاہیے۔[۱۸]

105

اقبال جدید اسلامی تاریخ کی پہلی شخصیت تھے جسے یورپی فلسفے کو براہِ راست پڑھنے کے بعد اِسلامی مفکروں کے خیالات کو بھی اُن کی اپنی تحریروں میں دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلام کی فکری روایت کی طرف سرسید، امیر علی اور شبلی نے اشارہ کیا تھا مگر یہ روایت بیجان صفحوں سے نکل کر اقبال کے سینے میں منتقل ہوئی تو زندہ ہو گئی۔

اِس زندگی کی توانائی وہ اپنے آپ میں محسوس کر سکتے تھے۔ یہی انقلاب تھا جس نے اُنہیں ایک نئے احساس سے دوچار کر دیا۔

غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اِس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہو گا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

نہ پوچھ اقبالؔ کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سرِ رہگزار بیٹھا، ستم کشِ انتظار ہو گا

مخزن، مارچ ۱۹۰۷ء[۶۹]

باب ۵

پری جمالوں کا شہر

مارچ سے جولائی ۱۹۰۷ء تک

پہلا حصہ

1

عطیہ فیضی مارچ ۱۹۰۷ء میں اپنے بھائی کے ساتھ لندن پہنچیں۔

ایک دن مس بیک نامی انگریز خاتون اُن کے پاس آئیں اور اُنہیں ایک چٹھی دی جو کسی 'آپ کا مخلص، اقبال' کی طرف سے تھی اور اس میں صرف اتنا کہا گیا تھا کہ وہ لندن آرہے ہیں اور ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ عطیہ کو اکثر نوجوانوں کی طرف سے ایسے دعوت نامے ملتے رہتے تھے اور وہ اس اجنبی کے پیغام کو بھی رد کر دیتیں مگر مس بیک کی سفارش آڑے آئی۔

''میں ایک زبردست دعوت کا بندوبست کر رہی ہوں،'' مس بیک نے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی آئیں اور پروفیسر اقبال سے ملیں۔ وہ زبردست آدمی ہیں۔''

''وہ کس لحاظ سے زبردست آدمی ہیں؟'' عطیہ نے دریافت کیا اور مس بیک نے بتایا کہ پروفیسر براؤن اُن کی ذہانت کی تعریف کرتے ہیں۔

اِس طرح عطیہ اور اقبال کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔[1]

2

عطیہ سے اقبال کی پہلی ملاقات یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو ہوئی۔

''دعوت میں مس بیک لپک کر میرے پاس آئیں،'' عطیہ کہتی ہیں۔ ''اُن کے پیچھے

پیچھے ایک سنجیدہ سا آدمی تھا جس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں۔ 'پروفیسر اقبال! یہ ہیں مس فیضی!'

''مس بیک نے ہمیں لے جا کر ایک طرف بٹھا دیا جہاں ہم نے خوب باتیں کیں۔

''اقبال کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ ذہنی پیچیدگی کا شکار ہیں، اچھائی اور برائی کا مجموعہ ہیں، اُن کی زندگی کا محور اُن کی اپنی ذات ہے اور وہ اپنے نظریات کو اہمیت دینے کے شوقین ہیں۔ 'بری علامت!' میں نے دل میں سوچا۔

'' 'آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟' میں نے اُن سے پوچھا۔

''' آپ لندن اور ہندوستان میں اپنے سفرنامے کی وجہ سے مشہور ہو چکی ہیں۔' اُن کی گہری گہری آنکھوں سے یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ وہ تعریف کر رہے ہیں یا مجھ پر طنز کیا ہے۔ میں نے کہا، 'سفرنامہ میری بہن زُہرہ بیگم کا ہے اور میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے کیمبرج سے یہاں تک آنے کی زحمت صرف اس لیے گوارا کی کہ مجھے خراجِ عقیدت پیش کریں۔ لیکن مذاق چھوڑیں اور بتائیں کہ آپ کا اصل مقصد کیا ہے؟'

''میری صاف گوئی اور روکھے پن پر وہ ذرا حیران ہوئے اور پھر کہا، 'میں آپ کو مسٹر اور مسز بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ آپ کیمبرج میں اُن کی مہمان بنیں۔ اگر آپ انکار کریں گی تو ناکامی کا داغ مجھ پر رہے گا جسے میں نے آج تک قبول نہیں کیا۔'

''اقبال سوسائٹی میں بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اگرچہ اُن کے مذاق اکثر طنزیہ ہوتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں نے حافظ کے بہت سے برمحل اشعار سنائے۔ 'جب میں حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں تو اُن کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں،' اقبال نے کہا۔''

اسی دوران طے ہو چکا تھا کہ ۲۲ تاریخ کو عطیہ کیمبرج آئیں گی۔

3

غزل

یُوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اِک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدّتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی
حُسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم
اِتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی
محفلِ ہستی میں آزارِ تہی دستی نہ ہو
یہ بھی اِک میری جوانی کی تمناؤں میں تھی
میں نے اے اقبالؔ! یورپ میں اُسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی[۲]

4

اقبال کی لندن آمد کا مقصد غالباً آرنلڈ سے مل کر آیندہ تعلیم کا منصوبہ بنانا تھا۔ جرمنی کی کوئی یونیورسٹی منتخب کرنی تھی جو کم سے کم وقت میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دے سکے۔

چنانچہ ۹ اپریل کو جب عطیہ اقبال کی دعوت پر اُن کے ساتھ ڈنر کرنے ہوٹل فراس کاتی پہنچیں تو وہاں چند جرمن مہمان بھی موجود تھے۔ ''کھانوں کی فہرست اور پھولوں کی سجاوٹ دیکھ کر میں حیران رہ گئی،'' عطیہ کہتی ہیں۔ جب نہوں نے تعریف کی تو اقبال نے جواب دیا۔ ''میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں۔ ظاہری شخصیت ہر اُس چیز کی قدردان ہے جو کارآمد اور عملی ہے۔ باطنی شخصیت خواب دیکھنے والی فلاسفر اور صوفی!''

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال کے قریبی دوستوں میں سے کسی نے اُن کے رُوحانی

تجربات پر اتنی روشنی نہیں ڈالی جتنی عطیہ فیضی نے فراہم کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگلی چند ملاقاتوں میں اقبال نے عطیہ فیضی کے سامنے اپنی باطنی شخصیت کی کافی گرہیں کھولنے کی کوشش کی۔ بچپن کا وہ واقعہ بھی انہوں نے بیان کیا جب ان کی عمر گیارہ سال تھی اور نور محمد کو کسی قافلے کی مصیبت کے بارے میں کشف ہوا تھا۔

۱۵ اپریل کو عطیہ نے اقبال کو چائے پر بلایا جہاں بعض ذہین طالبات بھی موجود تھیں۔ اقبال نے اُسی وقت ایک غزل لکھ کر عطیہ کی نذر کر دی۔ اس محفل میں اقبال کی ظرافت عروج پر تھی اور وہ مزاحیہ اشعار بھی کہہ رہے تھے جنہیں عطیہ نے لکھنے کی کوشش کی تو اقبال نے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ وقتی چیزیں ہیں۔

5

۱۷ اپریل کو شبلی نعمانی لکھنؤ سے اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے جہاں ان کی اولاد رہتی تھی۔ صبح دس بجے کے قریب دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں گئے جہاں تخت بچھے ہوئے تھے اور ایک طرف کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی۔

یہ پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور بندوق اٹھا کر بہو کے ہاتھ میں دے دی۔ انہوں نے نال نیچے کو جھکا کر پکڑی مگر عین اُسی وقت ٹریگر دب گیا اور شبلی کو اپنے پاؤں میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ انہوں نے کہا یہ کیا ہوا مگر باہر سے جو نوکر اور مامائیں اندر آئیں وہ سخت گھبرائیں اور رونے لگیں۔ کسی نے آ کر ان کے جوتے پر ہاتھ رکھ دیا تو انہوں نے پاؤں باہر نکالا اور کہا اس پر پانی ڈالو۔ پانی ڈالا جاتا تھا تو بھک بھک کی آوازیں آتی تھیں اور دُھواں اٹھتا تھا۔ پندرہ منٹ بعد جب اس طرح پنڈلی اٹھائے رکھنے سے دکھن محسوس ہوئی تو کہا کہ اب تکیہ لا کر میرا پاؤں اُس پر رکھ دو۔ جو آدمی اب تک پانی ڈال رہا تھا اُس نے روتے ہوئے کہا، کیا چیز ہے جو رکھی جائے۔

اب معلوم ہوا کہ پاؤں غائب تھا۔ کارتوس میں اگرچہ صرف چھرّے تھے مگر بندوق چونکہ صرف بالشت بھر کے فاصلے سے چلی تھی اس لیے سب سے پہلے ٹخنے کی

ہڈی چور ہوئی تھی اور پھر جوتے میں سے پاؤں نکالتے ہوئے ایڑی اُسی میں رہ گئی تھی۔

شبلی میں درد کی برداشت اُتنی ہی تھی جتنی اقبال میں، یعنی بھڑ کاٹ لے تو اس قدر ہائے واویلا کرتے تھے کہ سننے والوں کو اُن تمام جنگوں کے زخمیوں کا کرب یاد آ جاتا تھا جنکا ذکر شبلی نعمانی کی کتابوں میں آیا تھا۔ مگر آج خود شبلی کو وہ جنگیں یاد آ گئیں اور سوچا کہ ''تکلیف گو سخت ہے لیکن وہ ہمارے ہی بزرگ تھے جنہوں نے سر کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا روؤں۔'' چنانچہ خود کو تیمور لنگ سمجھ کر بیٹھے رہے۔

آپریشن ہوا اور چونکہ ٹانگ کی ہڈی کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھی لہٰذا پاؤں کے ساتھ نصف پنڈلی بھی کاٹ کر پٹی باندھ دی گئی۔[۳]

6

۲۲ اپریل کو لندن سے کیمبرج جانے والی ریل گاڑی میں اقبال اور عبدالقادر کے ساتھ عطیہ فیضی بھی موجود تھیں۔ یہ سب دوپہر بارہ بجے سید علی بلگرامی کے دولت کدے پر پہنچے اور اقبال نے عطیہ کا تعارف یوں کروایا جیسے کوئی مقدس چیز اُن لوگوں کے سپرد کر رہے ہوں۔ کم از کم عطیہ نے یہی محسوس کیا۔

''اگر زندگی میں مجھے کبھی ناکامی کا خطرہ پیش آیا تو وہ اُس وقت جب میں مس فیضی سے ملا...'' اقبال نے کہا اور ایک فارسی شعر سنایا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ موقع تھا جس کے بارے میں شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اقبال کسی دوست کے یہاں مدعو تھے جب اُن سے فارسی میں شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ خود بھی فارسی میں شعر کہتے ہیں یا نہیں۔ ''اُنہیں اعتراف کرنا پڑا کہ اُنہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی،'' شیخ عبدالقادر کا بیان ہے (اور اِس لحاظ سے عجیب ہے کہ خود مخزن ہی میں اقبال کی دو فارسی نظمیں شائع ہو چکی تھیں)۔

شام کو عطیہ واپس چلی گئیں اور اپنی ڈائری میں لکھا، ''یہ دن ہمیشہ یاد رہے گا!''

اُنہوں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اقبال جب کبھی اکتائے ہوئے اور اُچاٹ نظر آتے ہیں تو دراصل وہ موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ پارٹی میں کسی شخص کے منہ سے کوئی بات نکلے اور وہ فوراً اُسے طنز کی نوک پر رکھ لیں۔ "تب اُن کا جواب اتنا جلد اور غیر متوقع ہوتا ہے کہ دُوسرا تھوڑی دیر کے لیے تو ضرور سٹپٹا جاتا ہے،" اُنہوں نے لکھا۔

7

عبدالقادر کا بیان ہے، "دعوت سے واپس آ کر، بستر پر لیٹے ہوئے، باقی وقت [اقبال] شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اُٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو اُنہوں نے مجھے زبانی سنائیں۔"

8

اگر یہ درست تھا کہ انسان کا دل اصل میں خدا کی محبت میں دھڑکتا ہے اور کائنات کی ہر حسین شے میں اُسی بچھڑے ہوئے محبوب کا عکس دیکھ کر مچل جاتا ہے تو پھر خدا نے انسان کو زمین پر بھیج کر بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔

خدا سے اقبال کی شکایت اُس سال بہت دھیمے سُروں میں شروع ہوئی۔ اُن کی ایک مشہور فارسی غزل اُنہی غزلوں میں سے معلوم ہوتی ہے جن کے بارے میں عبدالقادر کہتے ہیں کہ دعوت سے واپس آ کر رات کو لکھی گئیں۔ یہ اُسی نوٹ بک میں درج ہوئی جس میں وہ شناساؤں کے پتے محفوظ کر رہے تھے:[۴]

آشنا ہر خار را از قصہٴ ما ساختی
در بیابانِ جنوں بُردی و رُسوا ساختی

آپ نے ہر کانٹے کو ہمارے قصے سے واقف کر دیا۔ ہمیں دشتِ جنوں میں بھیج کر رُسوا کر دیا۔

پہلے اُس سے ناراض ہوئے کہ اُس نے ہمیں سجدہ نہ کیا۔ پھر ایک دانے کی وجہ سے

ہمیں بھی مجرم ٹھہرا دیا۔ آپ نے نہ اُس بیچارے سے نبھائی نہ ہم سے بنا کر رکھی!

کوئی نئی طرز لائیے کہ طبعیت نیا پن چاہتی ہے۔ یہ کیسا حیرت خانہ بنایا ہے جہاں صرف آج اور کل ہیں۔

شراب کی طرح آپ نے بھی شیشے کے پردے میں چھپنا پسند کیا ہے کیونکہ آپ کے حسن کی جھلک تو صاف نظر آ رہی ہے!

9

دو روز بعد یعنی ۲۴ اپریل کو عطیہ کو اقبال کا خط موصول ہوا جس میں انگریزی میں لکھا تھا: میں ایک غزل بھیج رہا ہوں جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔'[۶]

غزل نہ صرف فارسی میں تھی اور حافظ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی بلکہ اس کا مطلع بھی کافی معنی خیز تھا: اے گلاب تُو آرزو کے کانٹے سے آزاد کیسے ہوا، آخر تُو بھی تو ہماری طرح اسی چمن کی مٹی سے بنا ہے!

اے گُل زخارِ آرزو آزاد چوں رسیدہ

تُو ہم زخاکِ ایں چمن مانندِ ما دمیدہ

10

اقبال اپنی کتاب علم الاقتصاد کا ایک نسخہ عطیہ کی نذر کرنا چاہتے تھے۔ شاید ۲۴ اپریل ہی کو انہوں نے اس کتاب کے لیے ہندوستان خط بھی لکھا۔

11

''فلسفیانہ مضامین پر تبادلۂ خیال کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور اکثر مواقع پر انہوں نے چھٹیاں گزارنے کے لیے مقام کے تعین اور کتابوں کے انتخاب میں میری امداد طلب کی،'' عطیہ فیضی کا بیان ہے۔ ''جدید اور قدیم فلسفہ کے

متعلقہ نصاب کو میں نے انہی دنوں ختم کیا تھا اور افلاطون اور نیٹشے جیسے فلسفیوں کے نظریوں کی تشریح کے بارے میں ہماری آرا میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال مطمئن نہیں ہوئے بلکہ خط و کتابت میں بحث جاری رکھی۔''

عطیہ فیضی نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے اور اقبال کے درمیان کیا اختلافات پیدا ہوئے مگر آگے چل کر اقبال نے افلاطون کی جس طرح کھل کر مخالفت کی وہ مشہور ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُس کا فلسفہ زندگی سے فرار کا راستہ دکھاتا ہے اور دنیوی زندگی کی تحقیر کر کے قوتِ عمل کو مفلوج کرتا ہے۔

نیٹشے نے اگرچہ خدا کو خیر باد کہا تھا مگر یہ اُس کے جذبے کے خلوص سے بہت متاثر تھے۔

12

علی گڑھ میں نواب محسن الملک کی طبیعت اکثر ناساز رہنے لگی تھی۔ ہم نشیں سمجھ گئے کہ اب چل چلاؤ ہے۔

کالج کی بیشتر ذمہ داریاں نواب وقار الملک کی طرف منتقل ہو چکی تھیں جو اُن کے دوست تھے مگر مزاج میں اُن کی ضد تھے۔ محسن الملک جتنے نرم دل اور بردبار تھے یہ اُتنے ہی سخت گیر اور جلد بھڑک اُٹھنے والے تھے۔

اُن کے مزاج کا اثر یا عام سیاسی فضا کی تاثیر تھی کہ علی گڑھ کے طلبہ نے انگریز پرنسپل کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بعض ٹرسٹیوں نے بھی مطالبہ کیا کہ کالج کے یورپین اسٹاف کو برطرف کرنا چاہیے۔ یہ خبر انگلستان پہنچی تو اقبال نے علی گڑھ کے طلبہ کے نام ایک منظوم پیغام لکھا اور شاید اُسے عبدالقادر کے حوالے کر دیا ہو کیونکہ وہ اُنہی دنوں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس جا رہے تھے۔

اِس نظم میں بھی اقبال نے عروض کے وہی تجربات کیے تھے جو وہ اس سے پہلے 'پیغامِ راز' اور ایک فارسی غزل میں کر چکے تھے۔

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

اَوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

یوں تو پلانے آتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند
لیکن اُنہیں خبر نہیں، یہ تشنہ کام اور ہے

جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چیں سے مصر تک
ساقی ہی اُس کا اور ہے، مے اور، جام اور ہے

فانوس کی طرح جیو، آتش بہ پیرہن رہو
اے جلنے والو! لذّت سوزِ دوام اور ہے

عجلت کرو نہ میکشو، بادہ ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے مُنہ پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی'

13

عبدالقادر روانگی سے پہلے آخری بار کیمبرج آئے تو ایک دوست نے چائے کی دعوت کی۔ سب لوگ دریائے کیم کے کنارے سیر کے لیے گئے۔ ایک خاتون کے پاس کیمرہ تھا مگر عین اُس وقت جب سب لوگ کیمرے کے سامنے کھڑے ہوئے تو سورج بادلوں میں چھپ گیا۔

اقبال نے فوراً فارسی میں شعر موزوں کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ چاند سے چہرے والی ندی کے کنارے ہماری تصویر اتار رہی ہے اور ہم انتظار میں ہیں کہ سورج نکل آئے:

ماہ روئے بر لبِ جُوئے مے کشد تصویرِ ما

منتظر باشیم ما تا آفتاب آید بروں

''یہ مجھے اب یاد نہیں کہ آفتاب پھر نکلا اور وہ خاتون تصویر کھینچ سکی یا نہیں،''عبدالقادر کا بیان ہے۔[۷]

14

اُس برس فرانسیسی میں برگساں کی اہم کتاب شائع ہوئی جسے انگریزی میں Creative Evolution کا نام دیا گیا مگر ابھی تک پوری کتاب کا انگریزی ترجمہ نہ ہوا تھا۔ یہی موقع ہو گا جس کا اقبال نے وقت کے بارے میں اپنے اُس مقالے کے حوالے سے ذکر کیا جسے انہوں نے کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا اور میک ٹیگرٹ کی تنقید سے پریشان ہو کر ضائع کر دیا تھا۔

''تھوڑے ہی دنوں میں جب برگساں نے اس موضوع پر ویسے ہی اظہارِ خیال کیا اور اس کے نظریے کی اشاعت ہونے لگی تو میک ٹیگرٹ کو بڑا دُکھ ہوا،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''برگساں نے بھی کم و بیش وہی نظریہ قائم کیا تھا جسے پہلے میں اپنے مقالے میں پیش کر چکا تھا۔ میک ٹیگرٹ نے مجھ سے کہا افسوس ہے میں نے اپنا فریضۂ استادی ادا نہیں کیا۔ میں نے تم پر بڑا ظلم کیا کہ ایک بہت بڑے کارنامے سے محروم کر دیا۔ مجھے بھی رنج تھا کہ میں نے اپنا مقالہ کیوں تلف کر دیا۔''[۸]

زیادہ رنج نہ ہونا چاہیے تھا۔ برگساں کے نظریات کی بنیاد بہت پہلے اس کی کتاب Time And Free Will میں رکھی جا چکی تھی جو فرانسیسی میں ۱۸۸۹ میں شائع ہوئی تھی۔ اقبال کا مقالہ وقت پر شائع بھی ہوا ہوتا تو برگساں سے پہلے یہ خیالات پیش کرنے کا اعزاز نہ ملتا۔

15

۷ مئی کو کلیۂ اخلاقیات کے خصوصی بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ اس کی ترتیب وہی تھی جو ۷

مارچ والی میٹنگ میں رہی تھی۔ اقبال کے مقالے پر سورلے اور نکلسن کی رپورٹیں پڑھ کر سنائی گئیں اور بورڈ نے رائے ظاہر کی کہ یہ مقالہ دنیائے علم میں ایک تازہ اضافے کی حیثیت سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

دو روز بعد اقبال نے مقالے کے داخلے کی فیس ادا کر دی۔'

16

۷ مئی کو کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے اقبال کو سندِ تحقیق جاری کی گئی۔ کچھ دنوں میں بی اے کی ڈگری بھی ملنے والی تھی۔ اگلا مرحلہ میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنا تھا۔ اِس کے بعد لنکنز اِن سے بیرسٹری اور پھر وطن واپسی... گویا ابھی ڈیڑھ سال اور یورپ میں قیام کرنا تھا۔

17

عبدالقادر لاہور پہنچے تو ان کا شاندار استقبال ہوا اور جلوس نکالا گیا۔

''اُس زمانے میں یہ بات بڑی عجیب تھی،'' مرزا جلال الدین کہتے ہیں۔ ''بڑے بڑے انگریز افسر بھی اس استقبال سے بہت متاثر ہوئے۔ اگلے دن گورنمنٹ ہاؤس میں ایک پارٹی تھی۔ ہم نے شیخ عبدالقادر کو بھی ایک دعوت نامہ بھجوا دیا۔ وہاں چیف کورٹ کے چیف جج مسٹر کنگ نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کون آدمی تھا جس کا کل پرجوش استقبال ہوا؟ میں نے شیخ عبدالقادر کو لے جا کر ملوا دیا اور اُن کی بڑی تعریف کی۔ چیف جج نے کہا، 'شیخ صاحب! آپ کا خوب استقبال ہوا۔'''

18

کیمبرج، یکم جون ۱۹۰۷ء، عطیہ کی ڈائری:

آج ندی کے کنارے درخت کے سائے میں بہت بڑی پکنک پارٹی جمع ہوئی۔ پروفیسر آرنلڈ نے زندگی اور موت کے مسائل پر بہت کچھ باتیں کہیں۔ آخر میں اقبال

نے ایک بات کہی جس کے بعد بحث ختم ہوگئی۔ اُنہوں نے فرمایا، ''زندگی موت کی شروعات ہے اورموت زندگی کی۔''

یہ جملہ کہتے وقت ایک قسم کی طنزیہ مسکراہٹ اُن کے چہرے سے نمایاں تھی۔

19

مخزن کے جون کے شمارے میں علی گڑھ کے طلبہ کے نام اقبال کا منظوم پیغام شائع ہوا۔

20

۱۳جون کو کیمبرج یونیورسٹی نے اقبال کو بی اے کی ڈگری دے دی۔

دوسرا حصہ

21

اقبال لندن آ گئے۔

تحقیقی مقالے کو میونخ یونیورسٹی میں داخل کروانے سے پہلے وہ اُس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے اس میں آرنلڈ کا مشورہ بھی شامل رہا ہو۔

بہر حال انہوں نے تیسرے باب کے آخری حصہ کو ایک مستقل باب بنا دیا، دوسرے باب کا وہ حصہ نکال دیا جس میں فارابی کے نظریات سے بحث کی تھی اور کسی ماہر مستشرق سے عربی اور فارسی الفاظ کا متبادل انگریزی املا اُس زمانے کے علمی رواج کے مطابق کروا دیا۔ بعض ابواب کے نام تبدیل کیے اور کچھ مقامات پر جہاں ان کا قلم بہک کر تاریخ نویسی یا انشا پردازی کے میدان میں ذرا دُور نکل گیا تھا اُسے کھینچ کر واپس فلسفے کی طرف لے آئے۔

دو تین ماہ قبل اپریل میں کسی سلیمن صاحب کی تحریر فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی تھی

اور اقبال کے موضوع سے مطابقت رکھتی تھی۔ اُس سے بھی واقفیت حاصل کی۔

اِس کے علاوہ معتزلہ کے بارے میں پروفیسر آرنلڈ اور پروفیسر براؤن سے غالباً طویل بحثیں ہوئیں جن کے نتیجے میں اقبال نے ان دونوں کی بعض تحریروں کے حوالے بھی اپنے مقالے میں شامل کر لیے۔[۱۰]

22

''۱۹ جون کو میں پروفیسر آرنلڈ کے یہاں کھانے پر مدعو تھی اور اقبال بھی وہاں موجود تھے،'' عطیہ کا بیان ہے۔ ''پروفیسر آرنلڈ نے جرمنی میں ایک نایاب عربی مخطوطے کی دریافت کا ذکر کیا جس کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ کیا ہے، اور کہا، 'اقبال! میں تمہیں وہاں بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں کیونکہ تم ہی اس ذمہ داری کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخص ہو۔'

''اقبال نے معذرت کے لہجے میں کہا، 'میں اپنے استاد کے سامنے بالکل مبتدی ہوں۔' پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا، 'مجھے پورا یقین ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے آگے بڑھ جائے گا۔' اقبال نے قدرے خشک مزاجی سے کہا، 'اگر یہ آپ کی رائے ہے تو میں مانے لیتا ہوں اور جیسا آپ کہیں کرنے کے لیے تیار ہوں۔'

''پروفیسر آرنلڈ اُن کا مطلب سمجھ گئے اور کہا کہ اِس بارے میں اقبال کو اُن پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔''

23

اگلی شام اقبال عطیہ کے گھر آئے اور چند جرمن اور عربی کتابیں بھی ساتھ لائے۔

''میں دیکھتی ہوں کہ اقبال جرمن فلاسفروں کی کتابوں سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں،'' عطیہ نے ڈائری میں لکھا۔ ''فارسی شعرا میں زیادہ تر حافظ کا کلام سناتے رہے۔ تین گھنٹے تک برابر بحث رہی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اِس طرح سنانے اور بحث کرنے سے میرے

خیالات پختہ ہو جاتے ہیں۔"

24

۲۳ جون کو عطیہ فیضی کے یہاں ایک اور پارٹی تھی۔ پونے تین بجے سے مہمان آنا شروع ہوئے اور رات گئے تک محفل جمی رہی جس میں ڈاکٹر انصاری نے بھی گانا سنایا۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ اقبال جنہوں نے ہندوستان میں مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کی روایت شروع کی تھی وہ لندن میں گانے سے اجتناب کر رہے تھے۔

25

تقریباً اُسی وقت جب لندن میں عطیہ کی پارٹی میں مہمانوں کی آمد شروع ہوئی تھی دورافتادہ ہندوستان میں سیالکوٹ میں اقبال کے بیٹے آفتاب کی آٹھویں سالگرہ کا سورج ڈھل رہا تھا۔

26

"ابا جان (شیخ عطا محمد) سے جسمانی سزا پانے میں [میرے منجھلے بھائی امتیاز] کے بعد دوسرا نمبر بھائی آفتاب کا تھا،" عطا محمد کے بڑے لڑکے اعجاز احمد کا بیان ہے۔ "وہ لڑکپن میں بیحد شریر تھے اور اُن کی پٹائی زیادہ تر اُن کی شرارتوں کی وجہ سے ہوتی تھی جو بعض اوقات خطرناک قسم کی ہوتی تھیں۔ ایک دن ہمارے مکان کی بڑی ڈیوڑھی میں کچھ چھوٹی لڑکیاں گیند سے کھیل رہی تھیں۔ کونے میں ہماری گائے بندھی تھی۔ جس لڑکی کی پشت گائے کی طرف تھی بھائی آفتاب نے چپکے سے اُس کی چوٹی گائے کی دُم سے باندھ دی۔ گائے نے دُم جو ہلائی تو [اپنی] آزادی میں رکاوٹ کے احساس سے دولتیاں جھاڑنے لگی۔ اُس کے ساتھ دُم سے بندھی بیچاری لڑکی پٹخنیاں کھانے لگی۔ شکر ہے دو ایک پٹخنیوں کے بعد اُس کی چوٹی کا پراندہ جو اُون کا تھا اِس کھینچا تانی میں ٹوٹ گیا اور لڑکی کی جان بچ گئی۔"

27

لندن، ۲۷ جون ۱۹۰۷، عطیہ کی ڈائری:

''اقبال آئے اور مجھے اپنے مکان پر لے گئے جو ایک جرمن خاتون مس شولی کے زیر انتظام ہے۔ بہت عمدہ اور رنئے نئے [کذا: نئی نئی] قسم کے کھانے پکائے تھے۔ یہ بہت ہوشیار خاتون ہے۔

''اقبال کا علمی مقالہ مکمل ہو چکا ہے۔ اُنہوں نے شروع سے اخیر تک اپنی تحقیقات کا خزانہ سنایا۔ میری رائے پوچھی تو میں نے چند باتیں کہیں جنہیں انہوں نے قلمبند کر لیا۔ اس کے بعد ہم امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ جلسہ میں گئے جہاں شہزادیاں بھی آئی تھیں۔ اقبال نے حسبِ عادت خوب فقرے کسے۔ جو سنتا ہنس پڑتا۔ الغرض جب واپس ہونے لگے تو کہا، 'مسرت بخش تضیع اوقات'۔

''سوسائٹی میں اقبال کے بارے میں یہ شہرہ ہے کہ وہ لندن میں سب سے تیز طبیعت رکھنے والے ہندوستانی ہیں۔''

دو روز بعد عطیہ لیڈی ایلیٹس کی فیشن ایبل پارٹی میں پہنچیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں اقبال بھی موجود تھے۔ وہ اقبال سے مصروفِ گفتگو تھیں کہ مس سروجنی داس جو سفر میں عطیہ کے ساتھ رہی تھیں اور جن سے عطیہ ناخوش تھیں زیورات سے لدی پھندی اقبال کی طرف بڑھیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا، ''میں صرف آپ سے ملنے یہاں آئی ہوں۔''

اقبال نے برجستہ جواب دیا، ''یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ اگر میں زندہ اس کمرے سے زندہ باہر نکل سکا تو مجھے تعجب ہوگا۔''

28

عطیہ فیضی کا بیان ہے کہ اقبال نے اپنے جرمن امتحان کے لیے دُنیا کی تاریخ لکھی تھی جو ۴ جولائی کو مکمل ہوئی اور اُنہوں نے عطیہ کو سنائی۔

اِس تحریر کا کوئی اور تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عطیہ کی یادداشت نے اُنہیں دھوکہ دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ۴ جولائی کو اگر اقبال نے عطیہ کو کوئی مسودہ پڑھ کر سنایا ہو تو وہ ان کے فلسفۂ عجم والے مقالے کا کوئی حصہ ہی رہا ہو۔

عطیہ کہتی ہیں کہ جب انہوں نے بعض تاریخی واقعات کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے تو اقبال نے کہا، ''ہر شخص اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے واقعاتِ عالم پر نگاہ ڈالتا ہے اور میں بھی [ایک] مخصوص روشنی میں دنیا کی تاریخ کو دیکھتا ہوں۔''

29

عبدالقادر وطن واپسی کے بعد لاہور میں وکالت کرنے کی بجائے دہلی چلے آئے تھے اور اس کے ساتھ ہی مخزن بھی اب دہلی سے نکلنے لگا تھا۔ وہاں مخزن کی ادارت کا کچھ کام ایک نئے آدمی نے اپنے ذمے لے لیا۔

یہ اردو کے ادیب راشدالخیری تھے جن کی عمر انتالیس برس تھی۔ شیخ عبدالقادر سے ان کے کافی روابط ہو گئے۔

30

۱۳ سے ۱۵ جولائی کے لیے اقبال نے تجویز کیا کہ عطیہ روزانہ شام ۵ سے ۷ بجے تک ان کے مکان پر فلسفے کے مطالعہ کے لیے آئیں۔

''دُوسروں سے بحث کرتے ہوئے ایک نئی دنیا آپ کے سامنے آجائے گی،'' اقبال کہتے تھے۔ ''درحقیقت اِس طرح سکھانے سے میں خود سیکھتا ہوں۔'' اِن مباحث میں ایک اور صاحب بھی شریک ہوتے تھے جو جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے تھے۔

اقبال بڑی گرمجوشی سے تمام جرمن علوم وفنون کی تائید کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر علم کے کسی شعبے میں استعداد بڑھانی ہو تو جرمنی کو اپنی منزل سمجھنا چاہیے، اور وہ چاہتے

تھے کہ عطیہ بھی جرمنی چلیں یا بعد میں ہی وہاں آ جائیں۔[۱۲]

31

پروفیسر آرنلڈ کچھ مہینوں کے لیے مصر جا رہے تھے۔لندن یونیورسٹی میں اُنہوں نے اپنی جگہ اقبال کو نامزد کیا اور طے پایا کہ اقبال نومبر کے آغاز تک جرمنی سے واپس آ جائیں گے تا کہ آرنلڈ کی جگہ لیکچر دے سکیں۔

یوں اُن کے پاس پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی میں قیام کرنے کو صرف چند ماہ تھے۔ آرنلڈ جرمن پروفیسروں سے خط و کتابت کر رہے تھے تا کہ اقبال کو اسی مختصر عرصے میں ڈگری مل جائے۔

32

لندن،۱۶ جولائی ۱۹۰۷ء عطیہ کی ڈائری:

''آج اقبال نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا پولیٹکل اکانومی کا نسخہ مجھے دیا۔ کتنے مہربان ہیں! اور وہ علمی مقالہ بھی مجھے بخشا جس کے لکھنے پر انہیں بی اے کی ڈگری عطا ہوئی۔عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ اقبال بہت ہی فاضل اور تیز فہم اسکالر ہیں۔ اِس مقالے کا ترجمہ جرمن زبان میں ہو رہا ہے۔''[۱۳]

یہ اقبال اور عطیہ فیضی کی علمی صحبتوں کا اختتام تھا۔ایک دو روز میں اقبال کو جرمنی روانہ ہونا تھا۔

33

یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ کیا اقبال اُس وقت تک دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے؟

اگر ایسا تھا بھی تو اِس بات کا امکان بہت کم ہے کہ اُنہوں نے عطیہ فیضی کو اپنی شریکِ زندگی بنانے کے بارے میں سوچا ہوگا۔عطیہ کے مزاج کی آزادی اقبال کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی۔

اُس زمانے کی کم از کم ایک نظم میں یہ خیال بہت واضح نظر آتا ہے کہ کیا دُنیا میں کوئی ہے بھی جس کے ساتھ وہ باقی تمام زندگی گزارنے پر تیار ہو سکیں؟

جلوۂ حُسن

جلوۂ حسن کہ ہر تارِ نفس کا مضراب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
یعنی جو آگ تاثر کو لگا دیتا ہے
اور دِل کو شرر آباد بنا دیتا ہے
اَبدی بنتا ہے یہ عالمِ فانی جس سے
ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بگریباں ہونا
منظرِ عالمِ حاضر سے گریزاں ہونا
دِلِ سفلی کو ملی عرش مقامی جس سے
عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے
دورۂ عصر کی ہستی کو مٹاتا ہے خیال
ہر گھڑی ایک نیا دہر بناتا ہے خیال
آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں؟
خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟[14]

34

دل سے نکلنے والی بات اثر رکھتی ہے۔ خدا نے اس شکایت کا جواب یوں دیا کہ جرمنی میں اقبال کی ملاقات ایما سے کروادی۔

باب ٦

نامعلوم دُنیا

جولائی ۱۹۰۷ء سے جولائی ۱۹۰۸ء تک

پہلا حصہ

1

جرمن مفکر ایک عرصے سے دنیا کے ذہنی افق پر چھائے ہوئے تھے مگر اس قوم کی سیاسی عظمت کی تاریخ تیس چالیس سال سے زیادہ نہ تھی جب مردِ آہن بسمارک نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اکٹھا کر کے ایک طاقتور قوم بنائی تھی اور قیصر ولیم اُس کا شہنشاہ بنا تھا۔ موجودہ شہنشاہ قیصر ولیم ثانی اُس کا پوتا اور انگلستان کی آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نواسا تھا۔

جرمنی میں دستوری شہنشاہیت تھی مگر انگریزوں کے برعکس اس قوم کی اصل زندگی جمہوریت سے وابستہ نہ تھی۔ جرمن سیاست کا بنیادی اصول جرمنی پر ناز کرنا۔ جرمنی کیا تھا؟ جرمن شہنشاہیت، جرمن فوج اور کسی حد تک زمیندار طبقے کے قدامت پسند مقاصد جنہیں تاریخ کی آگ نے آنچ دے کر ایک قوم کا خمیر تیار کر دیا تھا۔

جرمنی کی قومی زندگی کا ترجمان وہ نغمہ تھا جسے پچھلی صدی کے شاعر ہوفمین نے لکھا تھا اور جس کا پہلا مصرعہ اُن دنوں قوم پرستوں کی زبان پر تھا، 'جرمنی، جرمنی سب سے پہلے':

Deutschland, Deutschland über Alles

2

ایملی ایماو یگے ناست خوبصورت اور باوقار تھیں۔ گہری نیلی آنکھیں، سیاہ بال، پانچ

فٹ سات انچ قد اور غیر معمولی ذہانت! اُس زمانے میں بھی جبکہ عورتوں نے ابھی یونیورسٹی جانا شروع نہیں کیا تھا ایما جرمن زبان اور ادب پر خاصا عبور رکھتی تھیں۔

وہ ۲۸ اگست ۱۸۷۹ء کو جرمنی کے قصبے ہائیل برون میں پیدا ہوئی تھیں۔ جولائی ۱۹۰۷ء میں ان کی عمر اٹھائیس برس ہونے والی تھی۔ ان کی والدہ سوفی سات برس پہلے وفات پا چکی تھیں اور اب ان کی ہم نام ایما کی بڑی بہن ان کی یاد دلاتی تھیں۔ والد اڈولف کی عمر تریسٹھ برس تھی اور اب خاندان کی سربراہی ان کے سب سے بڑے لڑکے کارل کرتے تھے جو اٹلی میں آباد تھے۔ ان کا شکر کا کاروبار تھا۔ ان کے علاوہ ایما کے دو بڑے اور دو چھوٹے بھائی تھے۔

ایما اپنے گھر والوں سے دُور ہائیڈل برگ میں رہتی تھیں۔ ان کا قیام ۵۸ نیون ہائمر لینڈ سٹراسے پر واقع ایک عمارت میں تھا جہاں غیر ملکی طالب علم آ کر ٹھہرتے تھے اور ایما بعض دوسری خواتین کے ساتھ انہیں جرمن زبان کی تعلیم دیتی تھیں۔ یہ عمارت پروفیسر شیرر صاحب کی ملکیت تھی جو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتے تھے۔ اُنہوں نے اس کا نام پینسیون شیرر رکھا تھا جسے ہندوستانی طلبہ شیرر منزل کہتے تھے۔[1]

3

اقبال غالباً ۲۰ جولائی کے قریب اُس ملک میں پہنچے جہاں غالب کا ہم نوا دفن تھا اور شاید سب سے پہلے عطیہ فیضی کو خط لکھا۔

۲۱ جولائی کو انہوں نے میونخ کی لڈوگ میکسی ملین یونورسٹی میں اپنے داخلے کی درخواست جمع کروائی۔ فلسفہ کو اپنا خاص مضمون اور عربی اور انگریزی لسانیات کو ثانوی مضامین کے طور پر درج کیا۔ پروفیسر ہومل، ہرٹلنگ اور لپز کے نام ریفرنس کے طور پر درج کیے جن کے پاس وہ آرنلڈ کی طرف سے کوئی خصوصی خط لے گئے ہوں گے۔

اگلے روز گریجوئشن فیس ۲۶۰ مارک جمع کروائی۔ شاید مقالے کی کاپی بھی جمع کروائی

ہو۔ طے ہوا کہ تین ماہ بعد زبانی امتحان جرمن زبان میں ہوگا[۲] چنانچہ کسی پروفیسر رین کی قابل اور خوبصورت لڑکی سے جرمن زبان کے کچھ سبق لیے۔[۳]

4

خیال ہے کہ اقبال کچھ دن کے لیے برلن بھی گئے اور وہاں کی اسٹیٹ لائبریری میں کم سے کم تین عربی مخطوطوں کا جائزہ لیا جو اُن کے موضوع سے متعلق تھے۔[۴]

5

۲۳ جولائی کو لندن میں ایک علمی مذاکرے میں اقبال کی نظمیں گائی گئیں اور کچھ طلبہ نے مخزن کے خطوط اور مضامین سنائے جن میں کہا گیا تھا کہ تمام شمالی ہندوستان کے گلی کوچوں میں اقبال کی نظمیں گائی جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے ہندوستانی قومیت کا وہ احساس پیدا ہو گیا ہے جو پہلے موجود نہیں تھا۔

''سارا ہال اقبال کی نظموں سے گونج اٹھا،'' عطیہ فیضی لکھتی ہیں۔ ''جب ذرا جوش ٹھنڈا ہوا تو میں نے وہ خط نکالا جو اقبال نے مجھے جرمنی سے بھیجا تھا۔ یہ جرمن زبان میں تحریر کیا گیا تھا اور جب وہ پڑھا جا چکا تو سب نے یہ کہہ کر اُس کی تعریف کی کہ وہ روانی کا بہترین نمونہ ہے۔''

6

آرنلڈ نے عطیہ کو اپنے گھر مدعو کیا تھا جو ومبلڈن میں تھا۔ ۲ اگست کو عطیہ وہاں گئیں۔ آرنلڈ کی چھوٹی سی بچی نینسی بھی موجود تھی اور ایک جرمن خاتون مس اسٹریٹن، جنہوں نے جرمنی کی بہت تعریف کی۔

آرنلڈ نے کہا کہ اقبال کی خواہش ہے کہ عطیہ جرمنی جائیں اور اُن کی رائے میں بھی یہ مناسب ہوگا۔ وہاں زیادہ تر اقبال کی ذہانت کا تذکرہ رہا اور آرنلڈ نے کہا، ''اگرچہ وہ

میرے شاگرد ہیں مگر میں خود بھی اُن سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔"

یہ کہ کر اُنہوں نے عطیہ سے اقبال کا وہ خط مانگ لیا جو انہوں نے جرمنی سے عطیہ کو لکھا تھا۔ آرنلڈ کی خواہش تھی کہ وہ اِسے اپنے نوادرات کے ساتھ رکھ سکیں۔ علم الاقتصاد اور مقالے کے مسودات، جو اقبال نے روانگی سے پہلے عطیہ کو دیے تھے، وہ بھی آرنلڈ کے پاس ہی رہ گئے۔

7

اقبال نے عطیہ کو ایک اور خط لکھا جس میں اُن کتابوں کی فہرست بھیجی جو انہوں نے جرمنی میں عطیہ کے لیے جمع کی تھیں۔ ساتھ ہی اُن مختلف شہروں اور عجائب خانوں کے نام بھی لکھے جو وہ عطیہ کو دکھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے تاکید کی کہ عطیہ ہائیڈل برگ ضرور آئیں جہاں وہ خود بھی جرمن زبان سیکھنے کے لیے قیام کر رہے تھے۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

نظم: وصال٥

۱۶ اگست کو یہ خط عطیہ کو ملا اور انہوں نے لکھا کہ وہ اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی کے ساتھ ہائیڈل برگ آ رہی ہیں اور ۱۹ تاریخ کو لندن سے روانہ ہوں گی۔

8

ہائیڈل برگ میں اقبال شیر منزل میں ٹھہرے۔

ایما اور اُن کی پہلی ملاقات کا کوئی احوال محفوظ نہیں مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ اُس زمانے میں اقبال نے گوئٹے کا فاؤسٹ ایما کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر پڑھا۔٦ اقبال بعد میں گوئٹے کو انگریزی اور جرمن میں Geothe لکھتے تھے جبکہ درست Goethe ہے۔ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ غلط املا شروع ہی سے اُن کے ہاتھ پر چڑھ گئے ہوں۔

فاؤسٹ کے علاوہ اقبال جرمن زبان میں مشرقی ادب کی تحریک سے بھی واقف ہوئے۔

9

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب انگلستان میں ورڈز ورتھ اور کولرج رومانوی تحریک کی بنیاد رکھ رہے تھے جرمن شعرا مشرقی ادب کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ گوئٹے نے تو جرمن میں باقاعدہ غزلیں لکھ ڈالیں جن میں زلفِ گرہ گیر اور تیرِ مژگاں جیسے استعارے موجود تھے۔ اقبال کو یہ معلوم کر کے یقیناً بہت خوشی ہوئی ہو گی کہ گوئٹے میں بھی حافظ کی رُوح حلول کرتی تھی۔ اُس نے فارسی سے متاثر اپنی منظومات کے مجموعے کو دیوانِ مغرب کا نام دیا تھا۔

اقبال نے دیوانِ مغرب ایما کے ساتھ بیٹھ کر کھولا ہوگا اور دیوان کے حصوں پر نظر پڑتے ہی طبیعت باغ باغ ہوئی ہو گی۔ مغنی نامہ، ساقی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ وغیرہ وغیرہ۔ جیسے اُن کا اپنا مجموعۂ کلام ہو۔

10

ایک رات تاروں نے چاند سے کہا کہ وہ چمک چمک کر تھک گئے ہیں مگر آسمان پر وہی منظر ہیں اور راستہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ آخر کب یہ سفر ختم ہوگا؟

کہنے لگا چاند، ہم نشینو
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اِس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

نظم: چاند اور تارے[۷]

11

گم شدہ دستانہ

رکھا تھا میز پر ابھی ہم نے اُتار کر
تُو نے نظر بچا کے ہماری اُڑا لیا
آنکھوں میں ہے تری جو تبسم شریر سا

مگر پھر اقبال نے نظم ادھوری چھوڑ دی۔[۸]

12

شیخ عبدالقادر اور آرنلڈ کی خوش قسمتی تھی کہ اقبال کو دوبارہ شاعری کی طرف متوجہ کرنے کا سہرا پہلے ہی اُن کے سر بندھ چکا تھا ورنہ اگر اقبال نے شعر نہ کہنے کا ارادہ بھی کر لیا ہوتا تو شاید جرمن ادب اور ایما کے اثر میں اُن سے شعر کہے بغیر رہا نہ گیا ہوتا۔

اُن دنوں اُنہوں نے جو نظمیں لکھیں وہ اُردو ادب کی بہترین رومانی نظمیں ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved. ©2002-20..

حسن و عشق

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر
نُورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نُور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طُور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہیں دل میرا
تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں
حسن کی برق ہے تُو، عشق کا حاصل ہوں میں
تُو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری
شامِ غربت ہوں اگر میں تو شفق تُو میری
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے
تیری تصویر سے پیدا میری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا، عشق ہے کامل میرا
ہے مرے باغِ سخن کے لیے تُو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تُو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری اُمیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسُودۂ منزل میرا[1]

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

13

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اور ایما شادی کرنا چاہتے تھے مگر ایما نے آخری فیصلہ گھر والوں کی مرضی پر چھوڑا جن سے وہ بہت جلد بات کرنے والی تھیں۔ اقبال دوسری شادی سے پہلے ہندوستان واپس جا کر اپنے والد صاحب اور بڑے بھائی کو صورت حال سمجھانا چاہتے ہوں گے تا کہ جتنی صلح صفائی سے ممکن ہو کریم بی کو اپنی زندگی سے علیحدہ کریں۔ بظاہر کوئی رکاوٹ نظر نہ آتی تھی۔

اس مرحلہ پر لکھی گئی نظموں میں نوجوانی کے شفاف جذبات کا احساس پایا جاتا ہے جب خوشی، خوشی جیسی ہوتی ہے اور خواہش، خواہش جیسی۔

14

کیا شرارا چمک اُٹھا مری خاکستر میں
سوز سے اپنے نفس آپ جلا جاتا ہے
فکر کے مری جبیں پر ہوئے آثار نمود...

اگلا مصرعہ موزوں نہیں ہو سکا مگر خیالات کا تسلسل جاری رہا۔[10]

کچھ متانت سی ہوئی میری روش میں پیدا
دل سے وہ نقش لڑکپن کا مٹا جاتا ہے
لطف ملتا نہیں کچھ اگلے تماشاؤں میں
اب کوئی اور جنوں دل کو ہوا جاتا ہے
جس طرح نیند کی لذّت میں کھلونا رنگیں
طفلکِ خفتہ کے ہاتھوں سے گرا جاتا ہے
آ گیا خوابِ محبت میں یونہی ہوش مجھے
ہو گئے کھیل لڑکپن کے فراموش مجھے

15

جرمن خواتین کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ اُن میں مشرقیت زیادہ ہوتی ہے۔ ''انگریز عورت میں وہ نسائیت اور بے ساختگی نہیں جو جرمن عورت میں ہے،'' اقبال کا کہنا تھا۔ ''جرمن عورت ایشائی عورت سے ملتی جلتی ہے۔ اِس میں محبت کی گرمی ہے۔ انگریز عورت میں یہ گرمی نہیں۔ انگریز عورت گھریلو زندگی اور اس کی بندشوں کی اُس طرح شیدا نہیں جس طرح جرمن عورت ہے۔''[۱۱]

16

محفلِ قدرت میں ہر طرف محبت پھیلی نظر آتی تھی۔ صبح کا رنگین رخسار دیکھ کر کلی اپنا سنہری سینہ کھول دیتی ہے گویا صبح کے میخانے میں یہ سورج کے جام سے اپنے محبوب کے جلوے کی شراب پی رہی ہو۔

اگر کوئی ایسا ہی محبوب انسان کو میسر ہو جائے تو کیا ہو!

میرے خورشید! کبھی تُو بھی اُٹھا اپنی نقاب
بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بے تاب
تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں
عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دُوں

نظم: کلی[۱۲]

17

گوئٹے اپنی محبوبہ کرسچیانہ سے شادی کیے بغیر اٹھارہ سال اُس کے ساتھ رہا۔ ویمر کے معاشرے میں شادی مذہبی فریضے کی بجائے سماجی معاہدہ ہی سمجھی جاتی تھی مگر پھر بھی

یہ معاہدہ اہم ہوتا تھا چنانچہ گوئٹے کا طرزِ زندگی سب کو الجھن میں مبتلا کرتا تھا۔ معاشرے کی پرواہ کرنا البتہ گوئٹے کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔

مگر پھر ۱۴ اکتوبر ۱۸۰۶ء کو نپولین کے سپاہی جرمنوں کو شکست دے کر ویمر میں گھس آئے اور چند سپاہیوں نے گوئٹے کے مکان پر بھی ہلّہ بول دیا۔عظیم شاعر سپاہیوں کے مقابلے میں بہت بُودا نکلا اور قریب تھا کہ اُس کی پٹائی کر کے گھر کا تمام سامان لُوٹ لیا جاتا جب کرسچیانہ اپنی پرواہ نہ کرتے ہوئے سپاہیوں کے سامنے آ گئی۔

اب گوئٹے کو یہ گوارا نہ ہوا کہ جس عورت نے اُسے بچایا ہے وہ اُسے معاشرے میں بیوی کا درجہ نہ دلوائے۔پانچ دن بعد شادی ہوئی تو دُلہا کی عمر ستاون برس اور دلہن کی اکتالیس برس تھی۔وہ ایک دوسرے سے پانچ بچے پیدا کر چکے تھے۔

اِس شادی پر اُتنے ہی اعتراض ہوئے جتنے اس کے نہ ہونے پر ہو رہے تھے مگر چند ماہ بعد گوئٹے کا ایک دوست آ کر اُس سے ملا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ساری رنگ رلیاں ختم ہو چکی تھیں۔

18

۱۹ اگست کو پیر کے دن عطیہ اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی اور ہندوستانی طلبہ کے گروپ کے ساتھ لندن سے روانہ ہوئیں اور دوسرے دن سہ پہر ۵ بجے ہائیڈل برگ پہنچ گئیں۔

اقبال، وِیگے ناست اور سینےشل استقبال کرنے والوں میں موجود تھے۔راستے میں اقبال نے عطیہ سے کہا، ''جو کام مجھے کرنا ہے وہ اب مکمل ہو جائے گا۔''

شیر منزل کے باغ میں ہندوستانی طلبہ کو دعوت دی گئی۔عجیب بات ہے کہ عطیہ ہمیشہ شیر منزل کو یونیورسٹی کا ہاسٹل سمجھتی رہیں اور وِیگے ناست کو اقبال کی پروفیسر خیال کیا۔ممکن ہے یہ معلومات اقبال ہی نے فراہم کی ہوں کیونکہ اُنہیں مذاق کرنے کی عادت تھی۔

''جو کچھ وہاں کہا جاتا اقبال اُسے نہایت گہری توجہ اور انکساری کے ساتھ سُنتے تھے،''

عطیہ لکھتی ہیں۔ ''اور واقعہ یہ ہے کہ وہ سننے میں اس قدر محو ہو جایا کرتے تھے کہ جب سبق ختم ہو جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔

''یہاں ان کا طرزِ عمل لندن کے طرزِ عمل سے کس قدر مختلف تھا۔ معلوم ہوتا ہے جرمنی ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور وہ ان تمام درختوں سے جن کے پاس سے وہ گزرتے تھے اور اُس گھاس سے جس پر وہ چلتے تھے علم حاصل کر رہے ہیں...

''کبھی کبھی جب اقبال کے جواب صحیح نہ ہوتے تو فرالائن سینے شَل ایسی نرمی سے اُن کی اصلاح کر دیتیں کہ اقبال اسکول کے بچے کی طرح اپنی انگلیوں کے ناخن کاٹنے لگ جاتے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ انہوں نے وہ بات کیوں نہ کہی جو انہیں کہنی چاہیے تھی...

''میں تعجب کرنے لگتی تھی کہ جو کچھ میں نے لندن میں دیکھا وہ صحیح بھی تھا یا نہیں۔''

19

اگلے دن سیر و تفریح کا آغاز ہوا۔

قہوہ خانہ، دریائے نیکر کے کنارے چہل قدمی اور ایک بلند چوٹی سے وادی کا نظارہ۔ ایما نے مغربی اوپیرا گایا جس میں اقبال نے اُن کا ساتھ دینا چاہا مگر مغربی موسیقی سے واقف نہ تھے۔ بے سُرے معلوم ہوئے۔ شاید اُنہی کی دلجوئی کے لیے ایما نے اُنہیں بتائے بغیر اُس رات عطیہ سے ایک ہندوستانی گیت یا اس کے چند بول سیکھ لیے۔

مگر اگلی صبح اقبال نے ایک عجیب حرکت کی۔ جب گاڑی نکلنے کا وقت قریب آ گیا تو خادمہ چلاتی ہوئی عطیہ کے پاس آئی اور ان سے کہا کہ معلوم نہیں پروفیسر صاحب کو کیا ہو گیا ہے!

''دُور سے دیکھا کہ ایک بتی جل رہی ہے اور اقبال ایک ہاتھ سر پر رکھے ہوئے بیٹھے ہیں، آنکھیں کھلی ہیں اور دو چار کتابیں میز پر پڑی ہیں،'' عطیہ کا بیان ہے۔ ''جب ذرا زور سے اُنہیں پکارا تو بھی جواب ندارد... خیر، میں آہستہ آہستہ گئی، ان کے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر انہیں جھنجھوڑا اور اقبال، اقبال کہہ کر پکارا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہاں ہیں، پھر کچھ یاد کر کے کہا۔ 'میں عالمِ بالا میں چلا گیا تھا!' میں نے اُردو میں ڈانٹا کہ آپ کے لیے ٹرین ٹھہر نہیں سکتی۔ خیر، خوب مسکراتے ہوئے باہر آئے اور ہم سب روانہ ہو کر کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد نائن ہائم پہنچے..."

تین چار میل کی چڑھائی چڑھ کر قافلہ ایک ہوٹل میں تازہ دم ہوا تو عطیہ نے اقبال کو الگ لے جا کر پوچھا، "یہ کیا شعبدہ بازی تھی؟"

انہوں نے جواب دیا، "میں رات کو کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں میرا خیال میرے جسم سے الگ ہو گیا اور میں عالمِ بالا میں چلا گیا۔ وہاں بھی میری حالت پریشان تھی۔ پھر آپ نے مجھے جگا دیا۔"

کھانے کی میز تک پہنچتے پہنچتے اقبال معمول کے مطابق ہنسی مذاق کرنے لگے تھے۔ کھانے کے بعد سب نے رنگ برنگے پوسٹ کارڈ اپنے جاننے والوں کو روانہ کیے۔ اقبال نے بھی تین کارڈ بھیجے۔ دوسری جگہوں کے علاوہ گرانڈ ڈیوک آف بیس کے دیہاتی مکان کی سیر بھی ہوئی۔

پہاڑوں پر سب نے پھول توڑ توڑ کر اس کے تاج بنائے اور ایما نے اچانک ہندی میں گانا شروع کر دیا:

گجرا نچن والی نادان
یہ تیر انخرا!

پھر ان سب نے اپنے اپنے پھولوں کے تاج اقبال کے سر پر رکھتے ہوئے کہا: "ہم آپ کو معلوم اور نا معلوم دنیا کی بادشاہت کا تاج پہناتے ہیں!"

20

تعجب ہے کہ عطیہ نے اقبال کو وہ گئے نا ست کی بجائے ہینئے شل کی طرف متوجہ پایا۔

لاہور میں اقبال اپنے دوستوں سے مزاحاً کہا کرتے تھے کہ جس سے زیادہ محبت ہو اُس کی طرف سے غفلت برتنی چاہیے تاکہ عشق کا راز دُوسروں پر ظاہر نہ ہو۔ کیا وہ یہاں بھی اسی اصول پر کارفرما تھے یا اُنہوں نے عطیہ کو اپنے معاملات سے آگاہ بھی کیا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ عطیہ نے اپنی تحریروں میں اخلاقاً ایما کی پردہ پوشی کی ہو؟

سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ اگر خود عطیہ بھی اقبال میں دلچسپی رکھتی تھیں، جیسا کہ بعض سوانح نگاروں نے سمجھا، تو پھر اُن پر اقبال کی ایما میں دلچسپی کا کیا ردِعمل ہوا ہو گا؟

کیا اقبال کی نظم 'عاشقِ ہرجائی' اسی سوال کا جواب ہے؟ اگرچہ یہ نظم دو سال بعد کہی گئی مگر بانگِ درا ترتیب دیتے ہوئے اُنہوں نے اِسے یورپ میں کہی گئی نظموں کے درمیان رکھ دیا۔ کیا یہ اپنے دل و دماغ کی سرگزشت میں کسی بات کی طرف اشارہ ہے؟

21

شیطان کے ساتھ ڈاکٹر فاسٹس کے معاہدے کا قصہ بہت لوگوں نے لکھا تھا مگر گوئٹے نے اِسے ایک نیا انداز دیا تھا۔ اُس کا فاؤسٹ علم کے بدلے شیطان کے ہاتھ اپنی رُوح بیچتے ہوئے کہتا ہے، "اگر میں گزرتے ہوئے لمحے سے کہہ دوں کہ وہ ٹھہر جائے، وہ کس قدر حسین ہے، تو تم مجھے اپنی زنجیر میں جکڑ لینا!"

22

اقبال کی ایک رومانی نظم '...کے نام' غالباً جرمنی ہی میں لکھی گئی۔

سورج کی جدائی میں صبح پیچ و تاب کھاتی ہے، شفق کی آنکھ سے شام کے تارے کے لیے آنسو بہ رہے ہیں، دن کے قیس کو رات کی لیلیٰ کی ہوس رہتی ہے اور صبح کا ستارہ ہمیشہ کی چمک کے لیے بے چین ہے۔ قطب نما ستارہ جو ہمیشہ اپنی جگہ پر رہتا ہے وہ ستاروں کے قافلے سے کہہ رہا تھا کہ وہ جنبش کے لطف کو ترس گیا ہے مگر طواف کرنے

والوں کی محفل سے چاند کی آواز آئی کہ صبحِ ازل سے قیام ہی کے لیے تو سفر رہتا ہے:

سُوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لیے
حُسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں، بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے
رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے[۱۳]

اُردو شاعری میں خضر کوئی پسندیدہ کردار نہیں تھے۔ جس شاعری کی روایت عشق، آوارگی اور موت کی تمنا ہو اُس میں ایسے کردار کی تعریف نہیں ہو سکتی تھی جو ہزاروں سال سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھا رہا ہو اور جس کا کوئی اور مشغلہ ہی نہ ہو۔

اِس سے پہلے اقبال نے بھی اُن سے اجنبیت برتی تھی مگر اب چند خوبصورت لفظوں میں اس کردار کو عاشقوں کا دوست بنا دیا۔ آگے چل کر جو اُن کی عہد آفرین نظم کا عنوان بننے والا تھا یہ اُن کی شاعری میں اُس کا پہلا اچھا ذکر تھا۔[۱۴]

23

۲۲ اگست کی رات شاید نائن ہائم کے قریب ہوٹل ہی میں گزری۔ اگلے روز وہ سب بجلی کی ٹرین میں سوار ہو کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے جسے کونگ اسٹال یعنی بادشاہ کا قدم کہا جاتا تھا۔

وہاں بیٹھ کر اقبال ہر ایک کی شان میں کچھ اشعار اردو میں کہنے لگے۔ جب جرمن اور دوسروں نے ہندوستانیوں کو ہنستے دیکھا تو اقبال نے کہا کہ وہ آسمانی زبان میں حکم دے رہے ہیں کہ ایک طلسماتی دائرہ بنا کر فرشتوں کا نغمہ سنایا جائے۔ چنانچہ سب نے مل کر کسی

آپیرا کا ایک حصہ گایا اور بجایا۔

اس کے بعد تین میل دُور کوہ لوف گئے جو ایک زمانے میں کسی بادشاہ کے باغات کا حصہ تھا جنہیں بارہ دریوں سے سجایا گیا تھا۔ وہاں اقبال کی ظرافت پورے زوروں پر تھی۔

پونے تین بجے یہ قافلہ واپس ہائیڈل برگ روانہ ہوا اور سات بجے کے قریب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دو تین کی صفوں میں دوڑتا ہوا واپس پہنچا۔

24

اگلے روز آرام کرنے کے بعد اتوار ۲۵ اگست کو ٹرین میں سوار ہو کر ایک گھنٹہ بعد شمال کی سمت میں کسی جگہ پہنچے جہاں کسی بادشاہ نے اپنے 'باغِ فردوس' میں ہر ملک کے لیے عبادت گاہیں بنائی تھیں۔ چنانچہ یونانی دیوتاؤں کے مجسمے بھی تھے، اپالو کا مندر بھی تھا اور ایک مسجد بھی تھی۔

جب آبشار، تالاب اور پھل دار درختوں کی سیر کرنے کے بعد قافلہ مسجد میں پہنچا تو اقبال سے فرمائش کی گئی کہ وہ دیواروں پر لکھی ہوئی عربی عبارتوں کا ترجمہ کر کے سنائیں۔ دراصل یہ قرآنی آیتیں تھیں مگر اقبال نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا کہ ایک مسلمان حُور اس شرط پر بادشاہ سے شادی کرنے پر رضامند ہوئی کہ بادشاہ مسلمان ہو کر ایک مسجد بنائے جہاں ان دونوں کا نکاح ہو، چنانچہ اس طرح یہ مسجد وجود میں آئی۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے مگر کہتے بھی تو کیا کہتے۔ ہندوستانی ہنسے مگر اقبال نے کہا، ''مجھے بہت سے اندرونی حالات معلوم ہو جاتے ہیں جو آپ کو معلوم نہیں ہو سکتے۔''

اگلے روز کسی اور گاؤں کی چوٹی پر دیہاتی ناچ کا مشاہدہ کیا گیا جو سال میں ایک دفعہ ہوتا تھا۔ ایک سو لوگوں کا قافلہ ہائیڈل برگ سے ٹرین میں روانہ ہوا اور فراہیرن کے کہنے پر مضامین لکھے گئے اور تصویریں بنائی گئیں۔ اقبال اس شغل سے باز رہے اور

جب فراہیرن نے ان سے دریافت کیاتو کہنے لگے کہ اگر وہ خود لکھتے تو پھران سب کی چیزوں کے لیے منصف کیسے بن سکتے تھے۔ بہر حال عطیہ فیضی کے مضمون کوسب سے زیادہ پسند کیا گیا جسے عطیہ نے اُن کی مہمان نوازی پر محمول کیا۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے کی ٹرین سے سب میونخ روانہ ہوئے اور چھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ اقبال کا کہنا تھا کہ میونخ ''موسیقی اور شاعری کا مجسم تخیل ہے۔''

یہ عجیب بات ہے عطیہ نے اپنے آخری مضمون میں ایک پیشن پلے (passion play) کی تفصیل دی ہے مگر اُس کا ذکر اُن کی ڈائری میں ہے نہ کتاب میں۔ اُس تفصیل کے مطابق میونخ کے قریب بویرین آلپس کے پہاڑوں میں سیکڑوں دیہاتی جمع ہو کر حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے واقعے کوموسیقی اور ڈرامے میں پیش کرتے تھے اور عطیہ کے جرمنی جانے میں اِس ڈرامے کو دیکھنے کے شوق کا دخل بھی تھا۔ چنانچہ عطیہ کے ساتھ اقبال بھی وہاں پہنچے جسے بعد میں خود عطیہ نے دنیا کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پلیٹ فارم قرار دیا۔

عطیہ کے اِس مضمون کے مطابق میونخ میں قیام کے دوسرے روز پھر اقبال اُن کے ساتھ وہاں گئے مگر اس تمام عرصے میں خاموش رہے۔ آخر میں اُنہوں نے پوچھا کہ آخر گاؤں والوں کو یہ ساری مصیبت اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ چنانچہ انہیں گاؤں والوں کی کہانی سنائی گئی (عطیہ نے یہ کہانی نہیں لکھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشکل سے نکلنے کی خوشی میں گاؤں والوں نے منّت مانی تھی)۔ اقبال نے سن کر ذرا تلخی سے کہا، ''مذہب ہمیشہ بدترین خونریزی کا سرچشمہ رہا ہے۔ یہ محض منافقت اور تنگ نظری ہے۔ صلیب پر چڑھائے جانے والے کی مدد کو خدا کبھی نہیں آیا مگر Dare Devil ضرور آتا ہے!''

عطیہ کی ڈائری اور اُن کی کتاب کے مطابق میونخ میں اُن کا قیام دو دن رہا مگر اس قیام کی تفصیلات اُن کے مضمون والے بیان سے کافی مختلف ہیں۔

ڈائری اور کتاب کے مطابق ۲۷ اگست کو میونخ پہنچنے کے بعد یہ سب ایک ہوٹل میں کھانا کھا کر جلدی سے آگے بڑھے اور شاہی باغات میں پہنچے جہاں پہنچ کر اقبال نے کتابیں نکالیں اور کہا، ''اسپنوزا تو ختم ہوا، اب آپ کو لیبنیز کا نقطۂ نظر سمجھایا جائے گا۔ ہر سال تین مہینے میں آپ کے پاس آ کر رہوں گا اور نفسیات، تاریخ، اخلاقیات، شاعری اور مابعد الطبیعات کے بارے میں جرمنوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ سب پڑھاؤں گا...''

دو ڈھائی گھنٹے تک یہ سب باغ میں فلسفیانہ سبق پڑھتے رہے حتیٰ کہ شام ہوگئی۔

اگلے روز باغات، عجائب خانے اور تصویروں کی گیلریاں دیکھی گئیں۔ غالباً لڈوگ ثانی کی گیلری آف بیوٹیز میں وہنڈ کی بنائی ہوئی جزیرۂ مسرت کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر اقبال نے کہا، ''شہر میونک ہی جزیرۂ مسرت ہے جو خوبصورت تصور میں ڈوبا ہوا ہے۔''

شام کو پروفیسر رین کے مکان پر گئے جن کی حسین اور قابل بیٹی پہلے بھی اقبال کو جرمن سکھا چکی تھیں۔ اُنہوں نے اقبال کی زبان میں غلطیاں نکالنا شروع کیں تو عطیہ کو بہت مزہ آیا۔

آخر اُس دوشیزہ نے کہا، اقبال نے تین مہینے میں جتنی جرمن سیکھی ہے اتنی کوئی نہیں سیکھ سکتا تو اقبال نے جواب دیا، اگر یہ تیز اور میٹھی چھری ان کی استانی نہ ہوتی تو وہ کچھ نہ سیکھ سکتے۔ جرمن لڑکی نے پیانو پر کوئی دھن بھی سنائی۔

اگلے روز مہمانوں کو لائبریری میں عربی مخطوطے دکھا کر یہ کہنے کے بعد کہ ''مجھے یہاں عربی کا علم حاصل ہوا ہے،'' اُنہیں ریلوے اسٹیشن لائے جہاں سے وہ سب واپس ہائیڈل برگ پہنچ گئے۔

ہائیڈل برگ میں باقی استقبال کرنے والے تو ہندوستانی وضع میں گندھے ہوئے پھولوں کے ہار لائے تھے مگر ہیبنے شل عطیہ کے لیے گلاب لائی تھیں جس پر اقبال نے کہا

کہ گلاب کا پھول گلاب ہی دیتا ہے۔

اگلے روز جب وہ سب اقبال کو ساتھ لے جانے ان کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ کتابوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایما نے ان سے کہا۔ ''آج کشتی کی ریس مقرر ہے، چلنا ہوگا!''

آخر سب مل کر اُنہیں گھسیٹ کر لے گئے مگر ریس میں اقبال کی کشتی سب سے آخر میں پہنچی کیونکہ وہ اپنی کشتی میں بیٹھ کر کتاب پڑھتے رہے تھے۔

سنیچر ۳۱ اگست شاید اقبال کی زندگی کے خوشگوار ترین دنوں میں سے رہا ہوگا۔ اُس روز تقریباً ۸۰ لوگوں کا قافلہ جس میں ایما بھی شامل تھیں ٹرین میں بیٹھ کر شلوس نیکر بالشٹاین پہنچا۔

یہ مقام بہت بلندی پر واقع تھا اور راستے بھر وہ مختلف زاویوں سے دریائے نیکر کے پیچ وخم کا مشاہدہ کرتے آئے تھے۔ ہوسکتا ہے اقبال کو راستے میں خوف بھی محسوس ہوا ہو کیونکہ انہوں نے منزل پر پہنچ کر پھل پھول کے درخت دیکھے تو طنزیہ کہا، ''ہم سیب کھانے کے لیے پُل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہوئے ہیں۔''

درختوں سے پھل پھول توڑتے ہوئے یہ قافلہ پہاڑ کے دامن کی طرف روانہ ہوا۔ درخت اتنے زیادہ تھے کہ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا راستہ ایک مخروطی سرنگ نظر آتا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک مشہور اوپن ائر ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد تجویز ہوئی کہ پھولوں کے تاج پہن کر رقص کیا جائے۔

سب سے پہلے ایما کھڑی ہوئیں اور اقبال کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ اُنہیں دیکھ کر دُوسرے بھی رقص کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اقبال کے قدم بہت اوچھے پڑ رہے تھے جس پر کئی لوگ ہنسے مگر ایما اُن کے ساتھ رقص کرتی رہیں اور کچھ تصویریں بھی اکٹھی کھنچوائیں۔

اگلے دو روز میڈم شیرر کی رہنمائی میں آئر باغ کی سیر ہوئی جہاں نیچرل ہسٹری

میوزیم اور اسلحے کا عجائب خانہ تھا۔

۳ ستمبر کو عطیہ اور کچھ جرمن خواتین ورزش کر رہی تھیں اور ایما عطیہ کے گرد بازوؤں کا حلقہ کیے کھڑی تھیں جب اقبال اچانک داخل ہوئے اور ٹکٹکی باندھ کر اُنہیں دیکھنے لگے۔ میڈم شیرر نے اُنہیں ٹوکا تو برجستہ جواب دیا، ''میں اچانک سائنس دان بن گیا ہوں اور ستاروں کے جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔''

رات کے کھانے پر کوئی سنہرے بالوں والا استارہ دکھائی دیا جس کے گالوں پر رُواں تھا۔ اُنہوں نے عطیہ کو اُس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا:

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں

ہو طلائی استرا اس کے لیے

عطیہ کو اس بات پر اتنی ہنسی آئی کہ پیٹ میں بل پڑ گئے۔

اگلے روز عطیہ کو واپس جانا تھا۔ صبح چھ گھنٹے پھلوں کے باغ میں گزرے جہاں سب نے الگ الگ کھانا تیار کیا۔ اقبال نے بھی ہندوستانی کھانا تیار کیا تھا۔ آخر میں سب لوگ ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور عطیہ کو سامنے کھڑا کر کے اقبال کی رہنمائی میں گیت سنایا جسے شاید اُنہیں میں سے طیب نامی کسی ہندوستانی نے لکھا تھا:

''آخرکار ہندوستان کے نہایت درخشاں ہیرے کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ ہی گیا...''

25

عطیہ کے جانے کے بعد جرمنی میں اقبال کی نجی مصروفیات کا کوئی تفصیلی ریکارڈ موجود نہیں۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ستمبر کے شروع میں یا اکتوبر کے شروع میں جب اقبال میونخ جانے والے تھے تو ایما اپنے خاندان والوں سے ملنے ہائیل برون چلی گئیں۔ ممکن ہے وہ اُن سے اقبال کے بارے میں بات کرنے گئی ہوں۔

نظم

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں، پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا
آنکھوں میں تیری دیکھا میں نے کمال اُس کا[۱۵]

اخترِ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے
اماں مجھی کو تہِ دامنِ فلک نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر!
غمِ فنا ہے تجھے؟ گنبدِ فلک سے اتر
ٹپک بلندیِ گردوں سے ہمرہِ شبنم
مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں، محبت بہار ہے اس کی
بنا، مثالِ ابد پائیدار ہے اس کی"

28

گوئٹے نے 'Wanderers Nachtlied' کے عنوان سے دو نظمیں لکھی تھیں جن میں ایک کا ترجمہ انگریزی میں کولرج یا کسی اور شاعر نے بھی کیا تھا:

Over all the hilltops

Is peace;

In all treetops

Thou feelest

Hardly a breath;

The little birds are silent;

Wait but a while, soon

Thou too shalt rest.

چاندنی رات تھی اور اقبال دریائے نیکر کے کنارے پر تھے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے صدافروش خاموش

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2002-2006

کہسار کے سبز پوش خاموش
جنبش بیہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں دشت و کوہ و دریا
قُدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تُو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا!

تنہائی

تنہائیِ شب میں ہے حزیں کیا
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا
یہ رفعتِ آسمانِ خاموش
خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ، پیارے پیارے
یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!

قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

29

ستمبر کے مخزن میں اکبرالہ آبادی کا قطعہ شائع ہوا۔

بنائے ملت بگڑ رہی ہے، لبوں پہ ہے جان، مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں، گویا اُبھر رہے ہیں
اِدھر ہے قومِ ضعیف و مسکیں، اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود
ہیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہے ہیں، وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا ہمیں، پڑے ہیں کچھ دانہ ہائے
شیریں
اِسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں، نہ بال ہیں اب نہ پر رہے
ہیں
اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے، وہاں بھی پھیلی یہی وبا ہے
خیال میٹر کا بڑھ چلا ہے، خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے نیشن، رُکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے گم لفظ سالویشن، خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے
ہیں
جنابِ اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح
کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں، یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں[۱۸]

30

میونخ یونیورسٹی کے پروفیسر ہومل کو آرنلڈ کی طرف سے اقبال کے مقالے پر رائے موصول ہوئی۔ غالباً ہومل صاحب نے طلب کی ہوگی۔

آرنلڈ نے لکھا تھا، ''جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ پہلی کوشش ہے جو محمڈن فلسفے میں ایرانی تخیل کی روایت کے تسلسل کو دریافت کرنے اور اس طرح محمڈن فکر کے مختلف ادوار کے واضح ایرانی رنگ کو ظاہر کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ مصنف نے بہت سا ایسا مواد استعمال کیا ہے جو یورپ میں اب تک شائع نہیں ہوا تھا اور معلوم نہیں تھا اور اس کا مقالہ محمڈن فلسفہ کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔'' یہ خط ۱۲ اکتوبر کو لکھا گیا تھا۔

اُس مہینے اقبال میونخ گئے تا کہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر سکیں۔ انہوں نے مزید جرمن سیکھنے کے لیے اخبار میں اشتہار دیا اور شاید پروفیسر ہومل صاحب سے مزید ملاقات بھی کی۔

31

اکتوبر کے مخزن میں سجاد حیدر یلدرم کی تحریر 'حکایہ لیلیٰ و مجنوں' شائع ہوئی۔ لیلیٰ اور مجنوں کو جدید دور کے کردار بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ اُردو میں شاید پہلا مختصر افسانہ تھا جو کسی غیر ملکی تحریر سے ماخوذ نہیں تھا۔

32

انہی دنوں ہائیل برون سے انہیں ایما کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔

۱۶ اکتوبر کو اس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ جرمن زبان میں یہ اُن کی پہلی تحریر ہے، ''خزاں کی دھیمی اور نرم ہوا بڑی خوش گوار ہے...مگر افسوس کہ ہر حسین چیز کی طرح یہ بھی بے دوام ہے۔''[۱۹]

اُس روز شملہ میں نواب محسن الملک انتقال کر گئے۔

33

کوہسار کی رفعت سے اُترتی ہوئی ندی
دھو دھو کے چٹانوں کو گزرتی ہوئی ندی

اقبال نے نظم مکمل نہیں کی یا بعد میں بھول گئے مگر یہ تصور ساری عمر اُن کی شاعری میں آتا رہا۔

34

دنیا ایک بہت بڑا کینوس ہے جس پر فریاد کی تصویر نقش کی گئی ہے۔ ایما کے گھر والے اُن کے ہندوستان جانے پر آمادہ نہ تھے۔ کم سے کم بڑے بھائی کارل کی مخالفت اِتنی شدید تھی کہ ایما کو ہار ماننی پڑی۔

اُنہوں نے اقبال کو ایک خط لکھا اور پھاڑ دیا۔ پھر اس کی جگہ ایک اور خط لکھا جس میں پچھلے خط کے انجام کا ذکر کیا تھا۔

''آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرا خط پھاڑ ڈالیں،'' اقبال نے ۲۳ اکتوبر کو لکھا۔ ممکن ہے وہ اقبال کو پریشان نہ کرنا چاہتی ہوں مگر اب اُن کی ضد سے مجبور ہو کر تفصیل سے آگاہ کیا ہوگا۔ جواب میں اقبال نے ۲۷ اکتوبر کو جو خط لکھا اس میں یہ جملہ بھی تھا، ''مجھ میں سوچنے اور صحیح زبان لکھنے کا حوصلہ نہیں ہے...''

35

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے!
انسان کو رازجُو بنایا

راز اُس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

ہے گرمِ خرام موجِ دریا
دریا سُوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اُڑا رہی ہے
شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
تارے مستِ شرابِ تقدیر
زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر
خورشید، وہ عابدِ سحر خیز
لانے والا پیامِ ''برخیز''
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر
پیتا ہے مے شفق کا ساغر
لذّت گیرِ وجود ہر شے
سرمستِ مے نمود ہر شے

کوئی نہیں غم گسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں![۲۰]

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں
یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں

نظم: فراق[۲۱]

37

جرمن یونیورسٹیوں میں دستور تھا کہ سند کے لیے پیش ہونے والا مقالہ چھپوا کر داخل کیا جائے۔ صرف ایک یا دو جلدیں کافی نہ سمجھی جاتی تھیں بلکہ اکثر ایک خاصی بڑی تعداد طلب کی جاتی تھی تا کہ کتب خانوں اور تحقیقی مراکز کو فراہم کی جا سکے۔

اقبال نے بھی اپنا مقالہ طبع کروایا۔ انتساب ٹامس آرنلڈ کے نام تھا:

My Dear Mr. Arnold,

This little book is the first-fruit of that literary and philosophical training which I have been receiving from you for the last ten years, and as an expression of gratitude I beg to dedicate it to your name. You have always judged me liberally; I hope you will judge these pages in the same spirit.

Your affectionate pupil

Iqbal

38

۴ نومبر کو اقبال نے میونک یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اگلے روز اُنہیں لندن پہنچنا تھا۔ کوشش تھی کہ ہائیل برون کے راستے سفر کریں تا کہ ایما سے مل سکیں مگر ممکن نہ ہوا۔

وہ ایما سے ملے بغیر ہی جرمنی سے رخصت ہو گئے۔

39

۳۰ نومبر کو لاہور میں چیف کورٹ کے قریب میاں محمد شفیع کے مکان پر اجلاس ہوا جس میں پنجاب کے مختلف شہروں سے ۴۸ نمائندے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں میاں شاہ دین ہمایوںؔ نے پنجاب مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ وہ خود اس کے صدر تھے۔ نواب محمد علی قزلباش جو اُن دنوں پنجاب کی ہر مسلمان تنظیم کے سر پرست ہوا کرتے تھے دو اور رہنماؤں کے ساتھ نائب صدر، میاں محمد شفیع جنرل سیکرٹری، مولوی محبوب عالم اور شیخ عبدالعزیز جائنٹ سیکرٹری اور مرزا جلال الدین اسسٹنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ فنانشل سیکرٹری شیخ گلاب دین تھے۔

مجلسِ عاملہ میں بھی اقبال کے بہت سے دوست شامل تھے جن میں شیخ عبدالقادر، چودھری شہاب الدین، مولوی احمد دین، خواجہ کمال الدین اور مولوی انشاءَ اللہ خاں شامل تھے۔[۴۲]

میاں فضل حسین اپنی علیحدہ پنجاب مسلم لیگ بنا چکے تھے جس میں وہ خود، عبید اللہ وکیل، پیر تاج الدین بیرسٹر اور میاں حسام الدین شامل تھے۔

اب پنجاب میں دو مسلم لیگیں تھیں اور ان کا تصادم لازمی بات تھی۔

40

اقبال اب ڈاکٹر اقبال تھے۔ لندن میں ان کے ذمے ہفتے میں دو لیکچر تھے۔ ''جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر جی سکے،'' اقبال نے ۲ دسمبر کو ایما کو لکھا۔ ''براہِ کرم جلد لکھیے۔''

ایما نے بتایا کہ بڑے طوفانوں سے گزرنے کے بعد دل کا سکون حاصل ہوا ہے۔ ساتھ ہی اقبال کو اپنی دو تصویریں بھیجیں۔ اقبال کچھ بیمار تھے۔ یہ خط ملا تو اور بیمار ہو

گئے۔وہ سمجھے کہ اب ایسا خط و کتابت نہیں کرنا چاہتیں۔

41

لاہور میں علی بخش اسلامیہ کالج چھوڑ کر مشن کالج میں ملازم ہو چکا تھا۔ ایک روز مولوی میر حسن کے لڑکے سید تقی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ولایت سے شیخ صاحب (اقبال) نے پیغام بھیجا ہے کہ علی بخش کو تلاش کر کے کہا جائے کہ وہ نوکر ہو یا بیکار، اُن کا انتظار کرے۔

''میں نے کہا، میں اب ملازم ہوں،'' علی بخش کا بیان ہے۔ ''وہ (سید تقی) بولے کہ شیخ صاحب کا تاکیدی خط آیا ہے۔ جو وہ چاہتے ہیں، وہی کرو۔''[۲۳]

42

علی بخش کے گھر چوری ہوگئی تھی۔ اس نے اقبال کو خط لکھوایا اور شادی کے بارے میں بھی مشورہ مانگا۔ شاید اُسے امید تھی کہ اقبال واپس آنے والے ہوں گے اور اس کی مدد کرسکیں گے۔

لندن

۱۱ دسمبر ۱۹۰۷ء

عزیز علی بخش کو معلوم ہو کہ خط تمہارا پہنچا۔ حال معلوم ہوا۔ میرے آنے میں ابھی چھ سات ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ امید ہے کہ اس وقت تک تم فارغ نہ رہو گے اور وہ کمی جو چوری سے ہوگئی ہے اُسے پورا کر لو گے۔ مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا، اگر میں وہاں ہوتا تو اس موقع پر ضرور تمہاری مدد کرتا۔

تم نے اپنی شادی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ بہر حال انسان کو شادی سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ بیوی اور بچوں کی پرورش کے واسطے اس کے پاس سامان ہے یا نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اپنی محنت

سے بیوی کو آسودہ رکھ سکو گے تو ضرور کرلو۔ شادی کرنا عین ثواب ہے اگر بیوی آسودہ رہ سکے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہ کرسکتا ہو تو شادی کرنے سے نہ صرف اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے بلکہ ایک بے گناہ کو بھی ساتھ لے ڈوبتا ہے۔

باقی خیریت ہے۔ امید ہے تم سب خیریت سے ہو گے۔

محمد اقبال

43

اُسی برس ضلع جہلم میں جلال پور شریف کے کسی پیر حیدر شاہ کا انتقال ہوا اور کسی نے فرمائش کر کے اقبال سے تاریخ وفات کا قطعہ لکھوایا جو انہوں نے خط کے ذریعے بھیجا ہو گا۔[۴۳]

44

کراچی میں سرکاری مہمان خانے کے برابر میں ایم جیون جی کا وسیع باغ تھا۔ یہیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور نوزائیدہ مسلم لیگ کے جلسوں کے لیے کیمپ قائم کیا گیا جس میں ہر صوبے کے نمائندوں کے لیے الگ الگ قیام گاہوں کا انتظام تھا۔ ہر قیام گاہ کے وسط میں ایک بڑا شامیانہ ڈرائنگ روم کا کام دیتا تھا اور کیمپ میں تار گھر، ڈاک گھر وغیرہ کی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ ریاست خیر پور کے وزیر شیخ صادق علی میزبان تھے۔

تیرہ سو کے قریب مہمان کراچی پہنچے جن میں سے کچھ رنگون سے بھی آئے تھے۔ جب ان کے لیے جگہ کم پڑی تو سرکاری مہمان خانہ کھلوایا گیا اور تب بھی کام نہ چلا تو مدرسہ اسلامیہ کراچی میں مہمانوں کے قیام کا بندوبست ہوا۔ کچھ مہمان آغا خانی جماعت خانے میں بھی ٹھہرائے گئے۔ میاں محمد شفیع اور اُن کے بعض ساتھیوں نے ہوٹل میں قیام کیا۔ میاں فضلِ حسین کی پنجاب لیگ کی حیثیت مرکزی لیگ سے منظور نہیں ہوئی تھی مگر وہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت کراچی پہنچ گئے اور کیمبرج ہوٹل میں جا ٹھہرے۔

اِس تاریخی اجلاس کی صدارت مولانا الطاف حسین حالی کر رہے تھے۔ ''انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی کانفرنس میں تقریر کی،'' مرزا جلال الدین کہتے ہیں۔ ''اس تقریر کے جواب میں میاں شاہ دین نے ... کہا کہ حکومت کو شکایت ہے کہ قابل مسلمان نہیں ملتے۔ کیوں نہیں ملتے؟ پنجاب میں مسلمان موجود ہیں۔ دوسرے صوبوں میں بھی قابل آدمی موجود ہیں۔''تقریر نہایت زبردست تھی اور اس پر بار بار تالیاں بجیں۔ مخالف پارٹی سے علی امام کی تقریر کو بھی داد ملی اور کہتے ہیں کہ انگریز ایجوکیشنل کمشنر نے ان دونوں کا اثر لیا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد لیگ کا جلسہ ہوا جس میں میاں شاہ دین کی پنجاب مسلم لیگ کا الحاق مرکزی مسلم لیگ سے ہو گیا۔[۴۵]

45

امریکی فلسفی اور جدید نفسیات کے بانی ولیم جیمز کے لیکچرز کا مجموعہ 'پراگماٹزم' (Pragmatism) شائع ہوا۔ اس میں یہ تصور پیش کیا گیا تھا کہ خیالات کی سچائی کا بہترین فیصلہ اُن پر عمل کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے اس برس شائع ہونے والی اس کتاب کو اقبال نے کب پڑھا مگر دو برس بعد اُنہوں نے 'میلیورزم' کی اصطلاح استعمال کی جسے اسی کتاب میں فروغ ملا تھا اگرچہ یہ اصطلاح پہلے سے موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا نہ اچھی ہے نہ بری ہے مگر مجموعی طور پر بہتری کی طرف جا رہی ہے۔

اقبال کے خیال میں اسلام بھی یہی کہتا تھا۔[۴۶]

46

میاں شاہ دین ہمایوں پنجاب چیف کورٹ میں عارضی جج تھے۔ اب اُن کی حیثیت مستقل ہوگئی۔ یہ سب سے بڑا عہدہ تھا جس پر اُس زمانے میں کوئی ہندوستانی پہنچ سکتا تھا۔ باقی انگریزوں کے لیے مخصوص تھے۔

وہ پہلے مسلمان تھے جن کا اس عہدے پر تقرر ہوا تھا۔

47

میاں شاہ دین جج بن گئے تو پنجاب مسلم لیگ کی صدارت نواب فتح علی قزلباش کرنے لگے جو اُن دنوں پنجاب میں مسلمانوں کی اکثر انجمنوں کے سرپرست تھے۔

48

معرفت طامس کک اینڈ سن

لڈگیٹ سرکس

لندن ای سی

۲۰ جنوری ۰۸ء

عزیزہ من مس ویگے ناسٹ

میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں، جو آج شام مجھے موصول ہوئیں۔ یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ دونوں تصویریں بڑی خوبصورت ہیں، اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی، لیکن یہ مت باور کیجیے گا کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں بلکہ وہ میرے د- میں بھی موجود ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

شاید میرے لیے ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ پاؤں لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش

نہ کروں گا اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا۔

میں اپنی جرمن زبان بالکل بھول چکا ہوں، آپ ہی انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟ یوں ہم ایک دوسرے کی بات بہتر سمجھ سکیں گے۔ براہِ کرم جلد خط لکھیے۔ جوں ہی میری فوٹوگراف بنتی ہے، میں بھی آپ کو اپنی تصویر بھیج دوں گا۔

خدا حافظ مائی ڈیر ایما، اور ہمیشہ جانیے

آپ کا

ایس ایم اقبال

خط کو لفافے میں بند کرنے کے بعد لفافے پر دوبارہ لکھا، ''میں دونوں تصویریں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔''[۴۷]

49

لندن کی مختلف تنظیموں کی طرف سے اقبال کو لیکچر دینے کے لیے دعوت نامے ملنے لگے تھے۔ وہ 'پان اسلامک سوسائٹی' کے رکن بھی بنے اور جنوری ۱۹۰۸ء میں اس کے زیر اہتمام کیکسٹن ہال میں 'مذہبِ اسلام کے بعض پہلو' پر ایک لیکچر دیا جو اب محفوظ نہیں ہے۔[۴۸]

اُنہی دنوں جب وہ مزید لیکچروں کے لیے موضوعات منتخب کر رہے تھے ایما کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے شکایت کی تھی کہ اقبال اُنہیں خط کیوں نہیں لکھتے۔

یہ شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا کرتے اسدؔ کی طرح ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے کہ وہ خط و کتابت جاری رکھنا چاہتی ہیں۔ ''میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں،'' انہوں نے ۲۱ جنوری کو لکھا، ''اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے

معمور رہتا ہے... چنگاری سے شعلہ اُٹھتا ہے اور شعلے سے ایک بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے مگر آپ بڑی سرد مہر ہیں، غفلت شعار ہیں۔ آپ جو جی میں آئے کیجیے، میں بالکل کچھ نہ کہوں گا۔''

50

''انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ گاڑی اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا، 'آل چینج!' یعنی سب بدل جاؤ۔

''ایک روز میں حسبِ معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر چپ رہا۔ چند منٹوں کے بعد انہوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا، میں نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔

''اِس دوران اسٹیشن آ گیا اور گارڈ 'آل چینج' پکارنے لگا۔ میں نے کہا، بس یہی بدھ مذہب ہے۔'' اقبال کا اشارہ بدھ مذہب کے عقیدۂ تناسخ کی طرف تھا۔[۲۹]

51

پان اسلامک سوسائٹی کے تحت اقبال کا انگریزی میں ایک لیکچر 'Political Thought in Islam' تھا جس میں اقبال نے خلافت کے بارے میں مختلف نظریات بیان کرتے ہوئے دو اصول واضح کیے تھے۔

پہلا اصول یہ تھا کہ اسلامی ملّت، جسے انہوں نے اسلامی دولتِ مشترکہ قرار دیا، وہ

ہم خیالی کے اصول پر قائم تھی چنانچہ اس میں مکمل مساوات تھی۔

دوسرا اصول یہ تھا کہ اسلام میں ریاست اور مذہب کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے چنانچہ اسلام میں کسی پاپائیت کی گنجائش نہیں تھی۔

اس کے بعد اقبال نے خلافت اور امورِ سلطنت کے بارے میں سنی، شیعہ اور خارجی نقطۂ نظر بیان کیے جو تاریخ کے عمل سے وجود میں آئے تھے۔ اُن کے خیال میں شیعہ نقطۂ نظر غائب امام کی اطاعت کو فرض قرار دے کر ریاست اور مذہب کے درمیان علیحدگی کی ایک صورت پیش کرتا تھا کیونکہ غائب امام سے رابطہ صرف چند خاص شخصیات کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا جنہیں اس طرح چرچ جیسی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔[۲۰]

52

اُسی برس کسی وقت اقبال کا یہ لیکچر لندن کے Sociological Review میں شائع ہوا۔

53

حسن نظامی کی طرف سے کبھی کبھی خطوط مل جاتے تھے۔ وہ بمبئی گئے تو وہاں سے ایک خط اقبال کے لندن کے پتے پر لکھا۔ اس سے اقبال کو معلوم ہوا کہ انہوں نے جرمنی کے پتے پر بھی کوئی خط لکھا تھا مگر نجانے پتہ لکھتے ہوئے سلوک کی کون سی منزل پر تھے کہ خط اپنی منزل پر نہ پہنچ سکا۔

اب جو خط ملا تو اقبال نے بمبئی والے پتے پر اُس کا جواب بھیجا۔ تصوف کی رعایت سے اقبال کبھی کبھی اُنہیں اور اپنے آپ کو یک جان دو قالب قرار دیتے تھے۔

54

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کی غیر موجودگی میں انہیں ۲۰۰ روپے ماہوار سے

بڑھا کر ۲۵۰ روپے ماہوار پر ترقی دی گئی مگر چونکہ بلاتنخواہ رخصت پر تھے لہٰذا اُن کی جگہ عارضی طور پر شیخ نیاز علی اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کو ملی۔[۳۱]

۲۲ جنوری ۱۹۰۸ء کو اقبال نے پنجاب کے سرکاری اداروں کے ڈائرکٹر کے نام اپنی ملازمت سے استعفیٰ لکھ دیا۔ وہ اب پروفیسری نہیں کرنا چاہتے تھے۔[۳۲]

55

حسن نظامی نے اقبال کو رام کرشن ارسال کیا جو شاید کوئی مذہبی رسالہ تھا۔
''مسٹر آرنلڈ صاحب بہادر سے آج اس کا ذکر آیا تھا،'' اقبال نے ۱۰ فروری کو جوابی خط میں لکھا۔ ''وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کی کتاب مجھ سے لے لی۔ کہتے تھے کہ میں نے ہندوستان میں بہت کوشش کی کہ سلسلۂ نظامیہ نے جو کوشش اشاعتِ اسلام میں کی ہو اس کی کوئی تاریخی شہادت ملے مگر کامیابی نہ ہوئی، اگر آپ کے خاندان میں اس مضمون پر کوئی کتاب محفوظ چلی آتی ہو تو آگاہ کیجیے... مسٹر آرنلڈ کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کے لیے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی اور اب وقت ہے کہ ایسا کیا جائے۔ اس میں ہندوستان کیا، ساری دنیا کا بھلا ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں، راستی پر ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ دیکھنے کو دو، حقیقت میں ایک۔''

اسی خط میں اقبال نے لکھا تھا کہ اُنہوں نے انگلستان میں اسلامی تہذیب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ شاید یہ پان اسلامک سوسائٹی کے کیکسٹن ہال والے لیکچروں کی طرف اشارہ تھا۔ مزید لیکچروں کے لیے جو موضوعات منتخب کیے تھے اُن میں سید امیر علی کی رُوحِ اسلام کا اثر صاف نظر آتا تھا۔ ''ایک لیکچر ہو چکا ہے۔ دوسرا اسلامی تصوف پر فروری کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔ باقی لیکچروں کے معانی یہ ہوں گے: مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر، اسلامی جمہوریت، اسلام اور عقلِ انسانی وغیرہ...''

56

غالباً فروری ہی میں کسی وقت اقبال کو جرمنی سے میڈم شیر کا خط موصول ہوا۔ اُن کا ایک فرانسیسی طالب علم لندن میں تھا۔ دونوں نے مل کر شاید جرمن میں جواب لکھا۔

57

ہندوؤں کی انتہا پسند تنظیم آریہ سماج کی کوششوں سے راجپوتانہ اور دہلی کے اطراف کے کئی مسلمان راجپوت دوبارہ ہندو ہونے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ باقی مسلمان بہت پریشان ہوئے اور مارچ میں پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شبلی بھی گئے۔

58

اس برس کسی وقت مخزن پریس دہلی سے لالہ سری رام ایم اے کی کتاب ہزار داستان معروف بہ خم خانۂ جاوید شائع ہوئی۔ اس میں اقبال کا تذکرہ اور اُن کے اشعار کا انتخاب بھی تھا۔

''اگرچہ شیخ صاحب کا کلام ابھی خاص خاص باتوں میں کہنہ مشق اساتذہ کے درجے پر نہیں پہنچا ہے مگر جو خاص بات اس میں ہے وہ سوائے نامور اُستادوں کے اور لوگوں کو کم نصیب ہوتی ہے،'' لالہ سری رام نے لکھا تھا۔ ''آپ کے کلام میں بھرتی کے شعر کم پائے جاتے ہیں۔ کوئی شعر درد، وحدت اور اخلاق کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دُور دُور سے داد آتی ہے۔''[۴۴]

59

اُس برس میکملن نیویارک سے جارج فلرٹن کی کتاب Introduction to Philosophy شائع ہوئی۔ معلوم نہیں اس کتاب سے اقبال کا تعارف کب ہوا مگر بعد میں یہ ان کے کتابوں میں موجود تھی۔ ایک عام آدمی کس طرح سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کو

جانتا ہے، کیا چیزوں کو حسیات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے؟ آئیڈیلزم اور تنقیدی فلسفہ اس کتاب کے مباحث میں شامل تھے۔

اس برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[۳۴]

Angell, James Rowland. *Psychology: An Introductory Study to the Structure and Function of Human Consciousness*. London, Constable

Driesch, Hans. *The Science and Philosophy of the Organism: Gifford Lectures 1907* (Volumes 1-2). London, Adam and Charles, Black

Kidd Benjamin. *Principles of Western Civilization: A Sociological Study*. London, Macmillan

MacPherson, Hector. *A Century of Political Development*. Edinburgh, William Blackwood

Seignobos, Charles. *HIstory of Mediaeval Civilization*. London, T. Fisher

Wrench, G. T. *The Grammar of Life*. London, William Heinemann

اسی برس دی نیو ایج پریس لندن سے شائع ہونے والی اگسٹ فورڈ کی *Sexual Ethics* لاہور میں امراؤ سنگھ مجیٹھیا کے پاس آئی اور بعد میں کبھی اقبال کی کتابوں کے مجموعے میں شامل ہوئی۔

60

تصوف والا لیکچر ۲۶ فروری کو ہوا۔

اُس روز اقبال نے ایما کو خط بھی لکھا، ''آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟'' اقبال نے شکایت کی۔ ''مجھے اپنی بھدی جرمن زبان سے آپ کے کانوں کی توہین کرتے شرم آتی ہے۔ بہر حال میں اس خط و کتابت کو جرمن زبان سیکھنے کا ایک بہانہ سمجھتا ہوں۔ سو آپ مجھے اب تک درس دے رہی ہیں۔

''میں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں۔ اور میری تمنا ہے کہ اپنے سفر سے پیشتر آپ سے ملنے کا موقع مجھے حاصل ہو سکے۔

''میں پوری کوشش کروں گا کہ چند روز کے لیے ہائیڈل برگ آسکوں۔ لیکن اگر ممکن ہو تو کیا آپ پیرس میں مجھ سے مل سکتی ہیں؟ آپ ہائیڈل برگ کب آئیں گی؟ جناب رائنز کہاں ہیں؟ وہ مجھے بالکل خط نہیں لکھتے۔ میں دو مرتبہ انہیں لکھ چکا ہوں۔ شاید وہ بے حد مصروف ہیں۔

''آپ تمام دن کیا کرتی ہیں؟ کیا آپ مطالعہ کرتی ہیں یا سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں؟ آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے، اور ہمیشہ مجھے اُن سہانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے...''

61

شبلی مصنوعی پاؤں بنوانے دوبارہ بمبئی گئے تو عطیہ یورپ سے واپس آ چکی تھیں۔ اس دفعہ شبلی کو کئی مہینے ٹھہرنا تھا چنانچہ اُنہیں عطیہ کو ادب اور فنونِ لطیفہ کے زیادہ درس دینے کا موقع ملا۔

پاؤں بن گیا تو شبلی واپس چلے گئے مگر اب خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بعض خطوط کی تحریریں اِس قسم کی ہوتی تھیں، ''قرۃ عینی! تمہارا خط مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا...''

62

شبلی نے دو برس پہلے جو فارسی ادب کی تاریخ لکھنا شروع کی تھی اس برس اُس کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ کتاب کا نام شعرُالعجم تھا۔

63

اپریل میں اخبار زمانہ کانپور میں 'عشقِ دنیا و حبِ وطن' کے عنوان سے ایک تحریر شائع ہوئی۔ اٹلی کا رہنما مزینی جو یورپ جاتے ہوئے اقبال کو ایک شعر میں یاد آیا تھا اس کے اور اس کی محبوبہ مگڈالین کے حالات اس تحریر میں بڑے دلچسپ انداز میں بیان ہوئے تھے۔

مصنف کا نام منشی پریم چند تھا۔ یہ اُن کا پہلا مختصر افسانہ تھا۔

64

مئی میں عطیہ کو دوبارہ یورپ کا سفر درپیش آ گیا۔ شبلی نے ایک دردانگیز الوداعیہ لکھا جو عشقیہ شعر پر ختم ہوتا تھا۔

65

ہندوستان میں مسلم لیگ کے قیام کو اب قریب قریب ڈیڑھ برس ہو چکا تھا۔ مئی ۱۹۰۸ء میں لندن میں اس کی شاخ قائم ہوئی اور امیر علی کی صدارت میں کیکسٹن ہال میں افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ اقبال مجلسِ عاملہ کے رکن بنے اور اُس سب کمیٹی میں بھی شامل ہوئے جسے قواعد و ضوابط مرتب کرنے تھے۔[۳۵]

66

سید امیر علی کے ساتھ اقبال کے روابط کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں مگر اقبال کے پان اسلامک سوسائٹی والے لیکچروں میں سے ایک جو Political Thought in

Islam کے نام سے اُس برس 'سوشیالوجیکل ریویو' میں شائع ہوا، اُس پر شبلی کے ساتھ ساتھ سید امیر علی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔

اِس لیکچر میں اسلامی سیاست کے ارتقا کو زمانہ جاہلیت کے طریق انتخاب سے شروع کیا گیا تھا اور پھر سُنی طریق انتخاب، شیعہ طریقِ انتخاب اور خارجی طریقِ انتخاب کا موازنہ پیش کیا۔ سُنی طریق انتخاب کو وہ ملتِ اسلامیہ کے حق میں سب سے بہتر سمجھتے تھے۔

آخر میں ایران اور ترکی کے حالات پر تبصرہ بھی تھا جہاں کی سیاسی اصلاحات گذشتہ کئی برسوں سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ ان ممالک کے سیاسی مصلحین کے لیے جو اقبال کے الفاظ میں اپنے آپ کو 'نئی تہذیب کے پیغمبر' ظاہر کر رہے تھے، یہ مشورہ تھا کہ ''وہ اسلامی سیاسی آئین کے اصولوں کا خوب اچھی طرح مطالعہ فرمائیں...اگر اس طرح عوام پر یہ ثابت کر دیں کہ سیاسی آزادی کے وہ اُصول جو بظاہر غیر اسلامی نظر آتے ہیں دراصل بالکل اسلامی ہیں...تو وہ یقیناً عام لوگوں کو زیادہ متاثر کر سکیں گے اور اُن کو مطلوبہ سیاسی انقلاب کے لیے کوشش کرنے پر تیار پائیں گے۔''

67

۲۶ مئی کو لاہور میں مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال ہو گیا۔ ایک روز پہلے انہیں پیچش ہو گئی تھی۔

حکیم نورالدین اُن کے جانشین بنے۔

68

واپسی کا وقت قریب آ رہا تھا اور اقبال کے ذہن میں یقیناً یہ خیال تھا کہ وہ واپسی پر ایما سے دوبارہ ملاقات کرتے ہوئے جائیں گے۔ ''آج کل بہار کا موسم ہے،'' انہوں

نے ۳ جون کو ایما کے نام لکھا۔ ''سورج مسکرا رہا ہے لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے کچھ سطریں لکھیے اور آپ کا خط میری بہار ہو گا۔''

69

۹ جون کو اقبال کی ملاقات عطیہ فیضی اور اُن کی بہن نازلی سے ہوئی اور نازلی بیگم نے اقبال کا آٹوگراف لیا۔ اُن کے خاوند ہز ہائی نس نواب اسدی احمد خاں بھی ساتھ تھے:

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر

قطعے میں چار اشعار تھے اور آخری شعر فارسی میں تھا جس میں ملّت کی رہنمائی کرنے کی درخواست تھی۔

اِس موقع پر یہ دلچسپ سوال ابھرتا ہے کہ کیا عطیہ نے اقبال سے شبلی کا ذکر کیا یا اُن کے خطوط اقبال کو دکھائے؟ اقبال شاید شبلی کو اپنا ذہنی رہنما تسلیم کر چکے ہوں کیونکہ اُن کی سوچ پر شبلی کے تاریخی شعور کی چھاپ گہری ہوتی نظر آتی ہے اور کچھ عرصہ بعد اقبال بھی صوفیوں کی بجائے سپہ سالاروں اور فقیہوں کا ذکر کرنے والے تھے۔

عطیہ سے ملاقات کے اگلے روز اقبال نے ایما کو اپنی تصویر بھیج دی۔

70

''ایک دفعہ لندن میں کسی صاحب نے کسی مہمان کے اعزاز میں چند دوستوں کو ضیافت پر مدعو کیا تھا،'' اقبال کہتے ہیں۔ ''میں بھی شامل تھا۔ فراغتِ طعام کے بعد مہمانِ عزیز سے تفصیلی تعارف کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ [پتھروں کے ماہر] ہیں۔ میں نے ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی...

''چنانچہ سیر کرتے ہوئے ہم سمندر کے ساحل پر پہنچ گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اپنے مضمون کے متعلق کچھ فرمائیں۔ اُنہوں نے ساحل سے ایک چھوٹا سا سنگ پارہ اٹھا لیا اور اس کی سوانح عمری بیان کرنا شروع کر دی۔ مختصر یہ کہ ہم پندرہ دن تک روزانہ سیر کو

جاتے رہے اور وہ پتھر کے ٹکڑے کے راز بیان کرتے رہے۔''۳۶

71

فرد کسی بڑے گروہ کا حصہ ہے، یہ خیال مختلف مفکروں کے یہاں مختلف صورتیں اختیار کرتا گیا اور اس نے کمیونزم، فاشزم اور نازی ازم جیسے متنوع نظریات کو جنم دیا تھا مگر جمہوری معاشرے بھی کسی نہ کسی حد تک اِسے آزمانے والے ضرور تھے۔

اقبال کے ذہنی سفر میں وہ مقام بہت اہم ہے جب اُنہوں نے معاشرے کو ایسی بہت سی صفات دے دیں جو اسلامی تصوف میں صرف خدا کے لیے مخصوص تھیں۔'پیامِ عشق' جو اُنہوں نے یورپ میں قیام کے آخری دنوں میں کہی اِس نئی سوچ کا بھرپور اظہار تھی۔ اِس میں انہوں نے انسان کو مجازی اور قوم کو حقیقی قرار دیا تھا۔

قوم اور ملّت اُن کے یہاں ہم معانی الفاظ تھے۔ کبھی وہ اِسے معاشرہ بھی کہتے تھے مگر یہ جو کچھ بھی تھا اتنا اہم تھا کہ اپنے آپ کو اِس میں ضم کر دینا ضروری تھا۔

مشرق کی رُوح ہمیشہ سیاسی انقلابات سے ناواقف رہی تھی۔ معاشرہ بادشاہ کی ملکیت سمجھا جاتا تھا جس میں فرد کا کردار صرف اتنا تھا کہ اگر کوئی بات ناپسند ہو تو صوفی کی خانقاہ میں جا کر اپنی رُوح کی گہرائیوں میں سکون تلاش کر لے۔ اب بادشاہت ختم ہوئی تھی تو صوفی کی خانقاہ بھی برقرار نہیں رہنی چاہیے تھی بلکہ طاقت اور روحانیت کو ایک ناقابلِ تقسیم حقیقت کے طور پر دیکھنا چاہیے تھا۔

یہ حقیقت ہر دل میں موجود تھی، صرف اندازِ نگاہ درست کرنے کی ضرورت تھی۔

پیامِ عشق

سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو، میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں، تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے

تمام ساماں ہے پاس تیرے تو بھی آئینہ ساز ہو جا
دیارِ خاموش دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو
کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورتِ حرفِ راز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی
فِدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبالؔ آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

نظم میں نو اشعار تھے۔ یہ غزل کی صورت میں تھی۔[۲۷]

2

اُسی سال کسی وقت یہ خبر عالمِ اسلام میں بڑی دلچسپی سے سنی گئی کہ دمشق سے مدینہ تک ریل کی پٹری بچھانے کا منصوبہ تیار ہو گیا ہے۔ کئی مسلمان ملکوں میں چندے کی اپیلیں شروع ہو گئیں جن میں ہندوستان بھی شامل تھا۔

اقبال اپنے ادبی نصب العین کا تعین کر چکے تھے۔ ''مشرقی ادبیات اُس روح سے خالی ہیں جو انسان کے لیے اُمید، ہمّت اور جراتِ عمل کا پیغام ہوتی ہے،'' انہوں نے بعد میں اُس نصب العین کو یاد کرتے ہوئے کہا جو انہوں نے یورپ میں قیام کے دوران تشکیل دیا تھا۔ ''یورپی ادبیات اگرچہ ہمّت افروز تھیں لیکن اُن کے مقابلے کے لیے سائنس کھڑی تھی جو اُن کو افسردہ بنا رہی تھی۔ میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ... ان ادبیات میں رُوح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے۔''[۲۸]

عبدالقادر کے نام

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں[۳۹]

73

۲۷ جون کو اقبال نے ایما کے نام لندن سے آخری خط لکھا۔

۴۹ ایلشم روڈ
کینسنگٹن ویسٹ

لندن

۲۷ جون ۱۹۰۸ء

مائی ڈیر مس ایما

میں نے اپنی سی پوری کوشش کی ہے کہ جرمنی کے رستے سفر کروں لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ۳ جولائی کو لندن سے روانہ ہوں گا اور چند روز پیرس میں رکوں گا جہاں مجھے کچھ کام ہے۔

براہِ کرم فوراً لکھیے۔ میں ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے آپ کا خط پانے کا متمنی ہوں۔ میں اگلے سال یورپ واپس آنے اور آپ سے ملنے کی اُمید رکھتا ہوں۔ مت بھولیے گا کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دُوسرے سے جدا کریں گے مگر ہمارے

درمیان کبھی نہ مٹنے والا ایک تعلق رہے گا۔ میرے خیالات مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے اور اس رشتے کو مضبوط بنائیں گے۔ ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا اور یاد رکھیے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے اگرچہ وہ بہت دُور ہے۔ جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔

براہِ کرم فوراً لکھیے۔

آپ کا

ایس ایم اقبال

شاید ایما کے پچھلے خط یا کسی اور ذریعے سے کسی خفر صاحب کی بیماری کا حال معلوم ہوا تھا جو ایما اور اقبال کے باہمی شناسا رہے ہوں گے۔ چنانچہ پسِ تحریر اُس پر افسوس کیا، ''میں نے اُن سے کہا تھا کہ صحت کا خیال رکھیں۔''

74

یکم جولائی کو اقبال کو لنکنز ان سے بیرسٹری کی سند ملی۔ اُن کا رول نمبر ۵۲ تھا اور فیس پچاس پونڈ۔ اُنہوں نے اُسی روز چیف کورٹ لاہور میں بہ حیثیت وکیل رجسٹر ہونے کی درخواست بھجوادی۔[۴۰]

آٹھ نو سال پہلے قانون کے امتحان میں فیل ہونے سے جو خواب ادھورا رہ گیا تھا وہ اب پورا ہو گیا۔

75

انہی دنوں اقبال کا مقالہ لندن سے کتابی شکل میں شائع ہو گیا۔

The Development of Metaphysics in Persia

۳ جولائی کو اقبال نے کتاب کا ایک نسخہ اپنے کسی دوست ایف ڈبلیو ٹامس کو تحفتاً پیش کیا۔ اُسی روز یا پھر پانچ چھ روز بعد وہ انگلستان سے روانہ ہو گئے۔[۴۱]

جرمنی اُن کے راستے میں نہ تھا۔ وہ کبھی ایما سے دوبارہ نہ مل سکے۔

76

دو ستارے

آئے جو قِراں میں دو ستارے
کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب
انجامِ خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنا
پیغامِ فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدر
ہر ایک کی راہ ہے مقرر
ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئین جہاں کا ہے جدائی[۴۲]

باب ۷

صقلیہ

جولائی ۱۹۰۸ء

1

اقبال آبنائے برطانیہ عبور کر کے فرانس پہنچے جہاں پیرس میں شاید کچھ دن قیام کیا۔ وہاں اُنہیں کوئی ضروری کام تھا جس کی نوعیت معلوم نہیں ہو سکی۔[۱]

ممکن ہے واپسی کے سفر میں وہ فرانس کی اُسی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہوئے ہوں جہاں تین برس پہلے اُترے تھے۔ اُس وقت میں اور اب میں بہت فرق تھا۔

IqbalCyberLibrary.net All Rights Reserved ©2002-2006

2

سمندر کی سطح پر اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ پھر اندھیرے میں کچھ روشنیاں ابھریں۔ معلوم ہوا یہ سسلی تھا جسے عربوں نے صقلیہ کا نام دے کر وہاں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے تھے۔

بعض خیالات اور جذبات نے اقبال کی طبیعت پر ہجوم کیا اور ایک نظم مرتب ہو گئی۔

صقلیہ

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں!
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تُو منزل تھا، میں اُس کارواں کی گرد ہوں

رنگ، تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا، کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

نظم ۱۸ اشعار پر مشتمل تھی اور اس میں ۳ بند تھے۔[۲]

3

لاہور میں میاں محمد شفیع ایک اہم مقدمہ لڑ رہے تھے جس کی انہوں نے بھاری فیس بھی وصول کی تھی۔ اچانک انہیں حکومت کی طرف سے تار موصول ہوا کہ وہ فوراً شملہ پہنچیں۔ انہوں نے کسی اچھے وکیل کو مقدمے کی تفصیلات سمجھا کر اگلے دن کے لیے تیار کیا اور خود شملہ روانہ ہو گئے۔

وہاں ہندوستان کے مسلمانوں میں سے چار رہنماؤں کو بلایا گیا تھا جن میں علی امام بھی شامل تھے۔ حکومت کی خواہش تھی کہ مسلمان مخلوط انتخاب قبول کر لیں۔ باقی تینوں رہنما مان گئے مگر میاں محمد شفیع تیار نہ ہوئے۔

''واپس آ کر ابا جان نے بہت سے مسلمان رہنماؤں کو خط لکھے جن میں آغا خان اور سید امیر علی بھی شامل تھے جو اُس وقت انگلستان میں تھے،'' میاں محمد شفیع کی بیٹی جہان آرا کا بیان ہے جو اُس وقت بارہ برس کی تھیں۔ ''ابا جان نے اُن سب سے کہا کہ پوری کوشش کریں کہ ہندو، انگریز حکومت کو مخلوط انتخابات پر آمادہ نہ کر سکیں۔''[۳]

4

۲۵ جولائی کو اقبال کا جہاز بمبئی کے ساحل سے آ لگا۔

معلوم نہیں وہ اُس پارسی پیرِ مرد کو دوبارہ دیکھ سکے یا نہیں جس کے ہوٹل میں پچھلی دفعہ قیام کیا تھا مگر اُسی روز ریل میں سوار ہو کر دہلی روانہ ہوئے۔ وطن پرست تحریکوں کے

عروج کا زمانہ تھا۔ راستے میں کئی اسٹیشنوں پر بچے اور بڑے ان کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے اور ترانہ ہندی گا رہے تھے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

دہلی میں دوست جمع تھے۔ اقبال رات کو پہنچے۔ شاید اِس دفعہ داراشکوہ کے مزار سے ھُوالموجود کی آواز سنائی نہ دی ہو مگر نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر اگلے روز صبح سویرے دوستوں کے ساتھ ضرور حاضر ہوئے اور فاتحہ کے بعد سارا دن وہیں قیام کیا۔ قوالی بھی ہوئی اور میر نیرنگ اور مقبول احمد نظامی نے استقبالیہ نظمیں پڑھیں۔ پچھلی دفعہ اقبال نے 'التجائے مسافر' سنائی تھی چنانچہ اس دفعہ بھی دوستوں کو کسی نظم کی توقع تھی۔

اِنہوں نے صقلیہ والی نظم نکالی، شانِ نزول بتا کر سب کو سنائی اور اگلی صبح ریل گاڑی سے لاہور روانہ ہو گئے۔

باب ۸

شیطان کی خدائی

جولائی ۱۹۰۸ء سے مارچ ۱۹۱۱ء تک

پہلا حصہ

1

شیخ گلاب دین نے بھاٹی دروازے کے باغ میں شامیانہ لگوا دیا تھا اور لاہور کے خاص و عام وہاں موجود تھے حالانکہ ۲۷ جولائی پیر کا دن تھا۔ گیارہ بجے ان میں سے کچھ لوگ ریلوے اسٹیشن پہنچے اور دہلی سے آنے والی گاڑی سے اقبال کو اتارا۔

وہ جلسہ گاہ میں پہنچے تو ان کے گلے میں سونے کا ہار ڈالا گیا اور میاں محمد شفیع نے تعریف میں چند کلمات کہے۔ اس کے بعد استقبالیہ نظمیں پڑھی گئیں جن میں اس کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی کہ چند سادہ دل عقیدت مندوں کو اپنے جذبات کا اظہار کرنا تھا:

آمدِ اقبال سے جشنِ طرب گھر گھر ہوا
اوج پر آج پھر لاہور کا اختر ہوا
ڈگریاں پا کر ولایت سے تو آیا کامیاب
فلسفے میں خاص کر بیکن کا تو ہمسر ہوا[1]

بھرے مجمع میں سونے کا ہار گلے میں ڈالے اقبال کیا سوچ رہے تھے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ جب آخر میں اُن سے نظم پڑھنے کی فرمائش ہوئی تو اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ اُن کی شخصیت کا نیا رُوپ تھا جو پہلی دفعہ لاہور والوں کے سامنے آیا تھا۔

دوپہر کا کھانا اقبال نے گلاب دین کے گھر کھایا اور اگلی گاڑی سے سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔

2

مشرقی ادب میں نئی روح پھونکنے کی جو کشمکش دل میں شروع ہوئی تھی وہ جاری رہی۔ ''میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''اور میں اِس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں!''[۲]

3

اقبال کی بیٹی معراج جسے وہ نو برس کا چھوڑ گئے تھے اب بارہ برس کی تھیں۔ آفتاب دس برس کے تھے اور ممکن ہے تین برس باپ کے سائے سے محروم رہنے اور کبھی کبھی تایا کے ہاتھوں سختیاں برداشت کرنے کا کوئی اثر اُن کی طبیعت پر نظر آ رہا ہو۔

دونوں بچوں کا زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ ننھیال میں گزر رہا تھا۔ کریم بی کی عمر تینتیس برس تھی اور معلوم نہیں وہ اقبال کی واپسی سے کس قدر خوش ہوئیں مگر اقبال دوسری شادی کا پختہ ارادہ کر چکے تھے اور انگریزوں کی طرح وہ بھی ایک وقت میں ایک ہی بیوی رکھنے کے قائل تھے چنانچہ کریم بی کو طلاق دینا چاہتے ہوں گے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت انہوں نے اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے جائزہ لیتے رہے۔

شیخ عطا محمد کی طبیعت خراب رہتی تھی اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کمایا تھا اس کا ایک بڑا حصہ خود اقبال کی تعلیم پر خرچ ہوا تھا۔ باقی رقم بھی اٹھ چکی تھی۔ اُن کے بڑے لڑکے اعجاز کی عمر نو برس تھی۔ باقی لڑکے چھوٹے تھے۔

اقبال کی سب سے چھوٹی بہن زینب تو ماں باپ کے ساتھ ہی رہتی تھیں کیونکہ شوہر نے دوسری شادی کر لی تھی اور ساس نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا مگر ہوسکتا ہے کہ اس

موقع پر باقی تینوں بہنیں بھی اقبال سے ملنے آئی ہوں۔

دریائے نیکر کے کنارے اقبال نے جو خواب دیکھے تھے وہ اب ضرور مسمار ہوتے نظر آئے ہوں گے۔ ''میں اپنے بھائی کا اخلاقی قرض دار ہوں،'' انہوں نے کچھ دنوں بعد ایک خط میں لکھا۔

کیا وہ شیخ عطا محمد سے کہہ سکتے تھے کہ وہ لاہور میں وکالت کر کے اس خاندان کا بوجھ اٹھانے کی بجائے یورپ واپس جا رہے ہیں تا کہ جرمنی میں شادی کر کے آباد ہو سکیں؟

4

سیالکوٹ کی مشہور جامع مسجد دو دروازے والی میں اقبال نے ایک لیکچر دیا۔ جب کسی نے پوچھا کہ خدا کی ہستی کس طرح ثابت ہوتی ہے تو اقبال نے اس کے جواب میں اکبر الہ آبادی کا شعر پڑھا:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اِس کے بعد کہا کہ نبی ٔ کریم کو نبوت ملنے سے پہلے ہی لوگ سچا اور امانتدار کہتے تھے، جب آپؐ نے کہہ دیا کہ خدا ہے تو پھر اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ خدا کی ہستی پر سب سے بڑی دلیل نبی ٔ کریمؐ کا اپنا وجود ہے۔ [۳]

5

چند روز بعد عطا محمد لاہور چلے گئے تا کہ اقبال کے لیے دفتر کا بندوبست کر سکیں۔ انہوں نے مرزا جلال الدین سے مشورے کے بعد ضلع کچہری (ڈسٹرکٹ کورٹ) کے نزدیک چنگڑ محلّہ، موہن لال روڈ پر گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے سامنے لالہ چونی مونگا سے ایک دفتر کرائے پر لیا۔

کچھ دن بعد اقبال بھی سیالکوٹ سے اپنے کبوتر لے کر آ گئے اور دفتر کے لیے قانون

کی کچھ کتابیں اور ایک منشی حاصل کیا جس کا نام کاہن چند تھا۔ اُس نے بہت جلد اُن سے پیسوں پر جھگڑنا شروع کر دیا۔[۴]

6

اگست کے مخزن میں صقلیہ شائع ہوئی اور اتفاق سے شاید انہی دنوں ایک روسی اخبار نویس کی اس تجویز نے اسلامی ممالک میں بڑی ہلچل پیدا کی کہ مصر میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہونی چاہیے جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے شرکت کریں۔ یہ وہی بات تھی جو کئی مہینے پہلے خود اقبال کے ذہن میں آئی تھی اور جس کا انہوں نے عبدالقادر سے ذکر کیا تھا۔[۵]

محمد الدین فوق نے اپنے رسالے کشمیری میگزین کے اگست کے شمارے میں دو استقبالیہ نظموں کے ساتھ اقبال کے استقبال کی روئیداد بھی شائع کی۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری تو اقبال اپنے ساتھ لائے تھے، ایل ایل ڈی کی ڈگری فوق صاحب جذبات کی رَو میں اپنی طرف سے عطا کر گئے۔

''ملک کے فخر، اہلِ خطۂ قوم کے سرمایۂ ناز اور نیازمند فوق کے محب شیخ محمد اقبال جو اپنے وطن میں صرف پروفیسر اقبال ایم اے تھے، انگلستان اور جرمنی میں کشمیری ذہانت و طبّاعی کا سکہ بٹھا کر اور اپنی تعلیم کو کامیابی اور تعریف کے ساتھ تکمیل کر کے نہ صرف ایل ایل ڈی اور پی ایچ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی اعلیٰ علمی ڈگریاں لے کر مع الخیر اپنے وطن کو تشریف لائے ہیں...''

7

''ڈاکٹر صاحب (اقبال) ولایت سے واپس آئے تو پھر مجھے پیغام بھیجا،'' علی بخش کا بیان ہے۔ ''میں اُس وقت مشن کالج (لاہور) میں تھا۔ اُن سے ضلع کچہری میں ملا۔ فرمایا کہ ملازمت چھوڑ کر ہمارے ہاں چلے آؤ، بہت اچھے رہوگے۔ چنانچہ میں کالج کی

ملازمت چھوڑ کر پھر اُن کے پاس آ گیا۔''[۷]

8

۲۸ اگست کو واپس سیالکوٹ پہنچے تو خطوط کا انبار اُن کا منتظر تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے واپسی کی مبارکباد موصول ہوئی تھی۔ چالیس کے قریب نظمیں ہی تھیں۔ شاطر مدراسی جن کا اپنا مجموعہ شائع ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا، اُنہوں نے اقبال سے دریافت کیا تھا کہ وہ اپنا مجموعہ کب شائع کروائیں گے؟

اقبال نے اگلے روز انہیں لکھا، ''نہ مجھے اِن اوراقِ پریشاں کے جمع کرنے کی فرصت ہے نہ حقیقت میں اِن کی ضرورت ہے۔ محض دوستوں کے بہلانے کی خاطر کبھی کبھی کچھ لکھتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔ گذشتہ تین سال سے بہت کم اتفاق شعر گوئی کا ہوتا ہے اور اب تو میں پیشہ ہی کچھ اس قسم کا اختیار کرنے (کو) ہوں جس کو شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔''[۸]

کچھ اسی قسم کی بات محمد الدین فوق کے نام خط میں تحریر کی۔ انہوں نے کشمیری میگزین کے لیے اشعار کی فرمائش کی تھی۔ اقبال نے معذرت کرتے ہوئے مصروفیت کا عذر پیش کیا، ''روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے...میری آرزو ہے کہ خدا تعالیٰ اِس مہم میں میرا شاملِ حال ہو۔''

اب یہ اقبال کے بس میں نہیں رہا تھا کہ کسی بے تکلف ہم نشین کی فرمائش پر مصرعوں پر گرہیں لگانے بیٹھ جائیں۔ برسوں بعد شیخ عبدالقادر نے تحریر کیا، ''جب طبیعت خود مائلِ نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے۔ مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسبِ فرمائش وہ کچھ لکھ سکے، یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اِسی لیے جب...فرمائشوں کی بھرمار ہوئی تو انہیں اکثر فرمائشوں کی تعمیل سے انکار ہی کرنا پڑا۔''

یہ کیفیت یورپ سے واپسی کے بعد خاص طور پر سامنے آئی ورنہ پہلے کی فرمائشی

غزلیں تو بہت ہیں۔

9

غزل

عیاں ستارے، ہویدا **فلک**، زمیں پیدا
تری خدائی تو پیدا ہے، تو نہیں پیدا
وہ چیز نام ہے جس کا تڑپ محبت کی
مرے وطن میں نہیں ہے ابھی کہیں پیدا
پھر آیا دیس میں اقبالؔ بعد مدت کے
پس از سہ سال ہوا گمشدہ نگیں پیدا
کسی ادب کی جو قسمت بگڑتی ہے اقبالؔ
تو پہلے ہوتے ہیں نادان نکتہ چیں پیدا[10]

10

وہ آنکھیں جنہوں نے غالبؔ کو دیکھا تھا اب بڑھاپے سے کمزور ہو چکی تھیں۔ مولانا حالیؔ کو شاعری میں اصلاح دینا مشکل معلوم ہونے لگا تھا چنانچہ اگر کوئی درخواست کرتا تو کسی اور کے پاس بھیج دیتے تھے۔

ایک دن پٹھانکوٹ سے کسی مسلمان سرکاری ملازم کے بیٹے کا خط ملا جس کی عمر چودہ برس کے قریب تھی مگر وہ جدید شاعری کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا نام عبدالمجید سالکؔ تھا۔

حالیؔ شاید یہ خبر سن چکے تھے کہ اُن کا جانشین ولایت سے واپس آ چکا ہے چنانچہ اُنہوں نے اُسی کا نام لکھ کر بھیج دیا۔ اقبال نے کم سن شاعر کو لکھا، ”اگر آپ کی طبیعت شاعرانہ ہے تو آپ خود بخود شعر گوئی پر مجبور ہوں گے۔ باقی رہی زبان تو اس میں مَیں موزوں

اُستاد نہیں ہو سکتا۔"

11

۳ ستمبر کو سیالکوٹ میں اتنی بارش ہوئی کہ سارا شہر جل تھل ہو گیا۔ اقبال نے وطن واپسی کے بعد ایما کے نام پہلا خط اُس روز لکھا۔

انہوں نے لکھا، "میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے: ایما!"[۱۱]

12

اُس مہینے کے مخزن میں وہ نظمیں شائع ہوئیں جو اقبال کی واپسی پر کہی گئی تھیں۔

13

عطا محمد نوکری پر واپس جا چکے تھے اور جاتے ہوئے امام بی کی طرف سے نیاز بھی لے گئے تھے جو دہلی میں نظام الدین اولیاً کے مزار پر پہنچانی تھی۔ وہاں شاید فرصت نہیں ملی اور نیاز کسی اور کے ہاتھ حسن نظامی کو پہنچائی۔

حسن نظامی نے پوسٹ کارڈوں میں اقبال کا شکریہ ادا کیا اور اپنا کوئی رسالہ بھی خاص طور سے پارسل کیا اگرچہ اقبال نے عام وی پی کی فرمائش کی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ نئے قائم کیے ہوئے حلقہ نظام المشائخ میں اقبال کو اُن کی اجازت کے بغیر شامل کر لیا تھا اور اس کی اطلاع بھی دی تھی۔ اقبال اُن دنوں بیمار تھے مگر ۱۳ اکتوبر کو لکھا، "آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پوچھے مجھے شامل تصور کیجیے...مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بیتاب کر رکھا ہے، جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا، جو مجھے تنہائی میں رلاتا ہے، اس کی وجہ مجھ سے پہلے سُن لیجیے پھر جو چاہے کیجیے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ میرے ساتھ۔"[۱۲]

ایسا لگتا ہے کہ اُس وقت تک اقبال اپنے گھر والوں سے بھی کھل کر دوسری شادی کی بات نہیں کر سکے تھے۔ کریم بی کے ساتھ اُن کے اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟ کیا اقبال صرف کسی دوسری خاتون کی وجہ سے پہلی بیوی کو طلاق دینے پر تیار ہو گئے تھے؟

اِس بارے میں کوئی بات یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ خود اقبال اپنے نجی معاملات کے بارے میں کافی محتاط تھے اور اُن کے خطوط بھی اس معاملے کی تفصیلات میں رہنمائی نہیں کرتے۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کریم بی کے ساتھ رہنے کو وہ زندگی اجیرن کرنا سمجھتے تھے اور انہیں اپنے والد صاحب سے بھی شکایت تھی کہ انہوں نے اُن کے انکار کے باوجود کم عمری میں اُن کی شادی کر دی۔

شاید انہی دنوں ان کی چھوٹی بہن زینب کی ساس فوت ہو گئیں اور شوہر انہیں گھر واپس لے جانے آ گئے۔ نُور محمد کی ہمدردیاں داماد کے ساتھ تھیں مگر اقبال اِس بات پر سخت ناراض تھے کہ بہنوئی نے دوسری شادی کی اور ساس نے بہن کو گھر سے نکال دیا۔ وہ غصے سے اتنے بے قابو ہوئے کہ نور محمد کے سمجھانے پر بھی یہی کہتے رہے کہ مصالحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر نور محمد نے وہ حربہ استعمال کیا جسے وہ اقبال پر پہلے بھی کامیابی کے ساتھ آزما چکے تھے۔

''بیٹا!'' انہوں نے کہا، ''قرآن کریم میں تو والصُّلحُ خیر فرمایا گیا ہے۔''

اقبال خاموش ہو گئے۔ نور محمد بھی کچھ دیر خاموش رہے اور کچھ دیر بعد پوچھا، ''پھر کیا فیصلہ کیا جائے؟''

''وہی جو قرآن کریم کہتا ہے،'' اقبال نے کہا۔[۱۳]

14

اکتوبر کے مخزن میں شیخ عبدالقادر نے 'پیامِ عشق' سے کام چلایا۔

ممکن ہے اسے دیکھ کر اقبال کو یورپ میں گزارے ہوئے دن یاد آئے ہوں۔ چند مہینے پہلے کی بات تھی مگر اب صدیوں کا فرق محسوس ہو رہا ہوگا۔

15

اکتوبر ہی میں کسی وقت اقبال نے چیف کورٹ میں پریکٹس کی اجازت کے لیے درخواست بھی دے دی۔ علی بخش دوبارہ اُن کے پاس آچکا تھا اور گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چیف کورٹ کے رجسٹر میں اقبال کا نام بہ حیثیت وکیل درج ہوا۔ دس دن بعد حکم نامہ مل گیا۔[۱۴]

16

اقبال نے بچپن کے دوست لالو پہلوان کو بھی لاہور بلوایا اور اپنے پاس مہمان ٹھہرایا۔ ''چنانچہ میں چند روز اُن کے ساتھ رہا،'' لالو پہلوان کا بیان ہے۔ ''[اقبال] مختلف مقامات سے کبوتروں کی اعلیٰ نسلیں منگوایا کرتے تھے۔''

17

محمد دین فوق شاید اقبال کی واپسی کے وقت لاہور سے باہر تھے۔ وہ آئے تو اپنا ملاقاتی کارڈ اقبال کے ملازم کے حوالے کیا جس نے تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہا کہ فرماتے ہیں، ابھی فرصت نہیں ذرا تشریف رکھیے۔

فوق نے ملاقاتی کارڈ اِس خیال سے دیا تھا کہ اقبال شاید یورپ سے واپسی کے بعد تکلفات کے عادی ہو گئے ہوں اور سچ یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے خطوط میں جس طرح کا لب و لہجہ اختیار کیا تھا اُس کی روشنی میں فوق کا احتیاط برتنا درست بھی تھا۔ مگر ملازم کے ہاتھ جو پیغام اُنہوں نے بھجوایا وہ فوق کی توقعات سے زیادہ سرمہری پر مبنی تھا۔

چار پانچ منٹ بعد فوق کو اقبال کے پاس بھیجا گیا تو ان سے رہا نہ گیا اور اُنہوں نے پوچھ لیا، ''یا حضرت! یہ کیا!'' تب معلوم ہوا کہ اقبال نے ان کے ملاقاتی کارڈ بھیجنے کے تکلف پر اُن سے مذاق کیا تھا۔

''آپ خود سوچیں آپ نے کیا کیا؟'' اقبال نے جواب دیا، ''جب ایک بے تکلف دوست یہ تکلف کرے تو اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے ورنہ آپ کے لیے تو میں اس شعر کی صورت میں حاضر ہوں:[۱۵]

بصحنِ گلشنِ ما صورتِ بہار بیا
کشادہ دیدۂ گل بہر انتظار بیا''

فارسی شعر کا مطلب تھا، ہمارے گلشن کے صحن میں بہار کی طرح آؤ۔ پھولوں کی آنکھیں انتظار میں کھلی ہیں۔

18

شاہ دین ہمایوں کے بڑے بھائی میاں تاج الدین ایک شام میاں محمد شفیع کے گھر آئے اور کہنے لگے کہ معمولی ذاتوں کے لوگ بھی اپنے آپ کو سید اور راجپوت کہنے لگے ہیں مگر میاں شفیع نے اپنی برادری کے لیے کچھ نہیں کیا۔
میاں شفیع بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ انہیں عرب نسل کی ارائیں برادری سے متعلق ہونے پر فخر ہے اور وہ مرنے سے پہلے ضرور اس بات کا بندوبست کر جائیں گے کہ ارائیں نوجوان اپنی برادری پر فخر کیا کریں۔[۱۶]

19

للّی لاج میں تقریباً ہر شام لاہور کے روشن خیال مسلمان اہلِ علم جمع ہوتے تھے جن میں اقبال کے پرانے دوست شہاب الدین اور شیخ عبدالقادر شامل تھے۔
یورپ سے واپسی کے بعد اقبال بھی یہاں آنے لگے۔[۱۷]

20

نومبر کے مخزن میں تلوک چند محروم کی نظم 'سلام و پیام' چھپی جس میں اقبال کے

ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ جیسی نظموں کے استعاروں کو استعمال کرتے ہوئے ان سے درخواست کی گئی تھی:

اِک بار پھر سنا دے 'ہندوستاں ہمارا'
اپنی زباں میں کہہ دے رازِ نہاں ہمارا!
پھر زمزموں سے اپنے آباد اس کو کر دے
تیرے بغیر سُونا ہے گلستاں ہمارا!

اُنہی دنوں اقبال نے ایما کے نام ایک خط لکھا جس کے مضمون کا ہمیں علم نہیں کیونکہ وہ ڈاک میں گم ہو گیا۔[۱۸]

Iqbal Cyber Library.net All rights reserved. 2002-2006

21

حسن نظامی اپنے حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد متعین کر چکے تھے۔

اتفاق سے اُن کی بیوی فوت ہو چکی تھیں اور وہ دوسری شادی کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ نادانستہ اُسی طرف جا رہے ہیں جس طرف میں آپ کو لانا چاہتا ہوں،'' اقبال نے ۲۵ نومبر کو انہیں لکھا۔ ''اس بات نے مجھے جرات دلائی ہے کہ میں آپ سے رہنے سہنے کا دکھ ظاہر کروں۔ بہت کم لوگ ہیں جو ہمدردی کے ساتھ اس قصّے کو سن سکتے ہیں مگر آپ سے مجھے پوری ہمدردی کی توقع ہے۔ ابھی تک کسی دوست سے اس بات کا ذکر نہیں آیا۔ آپ سے ذکر ہو چکنے کے بعد اگر مناسب ہوا تو بعض خاص دوستوں سے اس کا تذکرہ کروں گا۔''

22

دسمبر کے مخزن میں اقبال کی چند ماہ پرانی نظم ہی شائع ہوئی، 'عبدالقادر کے نام'۔ اس کے شروع میں عبدالقادر نے لکھا، ''اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت **ملک** کی لکھی ہے تو (خدا) مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔''

دلچسپ بات یہ تھی کہ اقبال نے سعدی اور سلیمی سے محبت کے استعاروں میں وطن کی حدود سے بلند ہونے کی دعوت دی تھی مگر عبدالقادر نے وطن کی خدمت کی توفیق مانگی۔

23

۱۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ہال روڈ پر کوئن میری اسکول کا پہلا دن تھا۔ یہ لڑکیوں کے لیے لاہور میں پہلا بڑا اسکول تھا جس کی بنیاد لڑکوں کے چیف ایچی سن کالج کے خطوط پر رکھی گئی تھی۔ داخلے کا معیار اتنا سخت تھا کہ صرف اٹھارہ لڑکیاں منتخب ہو سکی تھیں جن میں پہلا نام میاں محمد شفیع کی بیٹی جہان آرا کا تھا جس کی عمر اُس وقت بارہ برس تھی۔

داخلے کے لیے صرف ذہین ہونا ہی ضروری نہیں تھا بلکہ کسی اچھے خاندان سے تعلق بھی لازمی تھا اور داخلہ کمیٹی کا سربراہ پنجاب کا گورنر خود تھا۔

پرنسپل ایک انگریز خاتون مس آنجلی تھیں جو ہندوستان میں بیس برس گزار چکی تھیں اور اس سے پہلے امرتسر کے الیگزنڈریا اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہ چکی تھیں۔[۱۹]

24

عطیہ فیضی کی والدہ فوت ہو گئیں۔ اقبال کو بھی اطلاع بھیجی گئی۔

۲۷ سے ۲۹ دسمبر تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس امرتسر میں ہونے والا تھا اور اقبال اس میں شریک ہونے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے ارادہ کیا کہ اجلاس کے بعد بمبئی جا کر عطیہ سے خود تعزیت کریں گے کیونکہ دسمبر کے اواخر سے جنوری کے اوائل تک عدالتیں بند تھیں۔[۲۰]

25

حسرت موہانی جیل میں تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے اُردوئے معلّیٰ میں ایک مضمون مصر میں انگلستان کی پالیسی کے خلاف شائع کیا تھا اور جب حکومت نے اسے

باغیانہ قرار دیا تو مضمون لکھنے والے کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ چار سال قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔

اُن کی بیگم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور خط لکھ کر ان کے حوصلے بلند کیے۔ جیل میں حسرتؔ نے جو غزلیں لکھیں اُن میں سے ایک انہی دنوں مخزن میں شائع ہوئی جس کا مطلع اُسی طرح مشہور ہو گیا جس طرح آٹھ برس پہلے ''بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں'' اُن کی پہچان بنا تھا۔

یہ غزل جو حسرتؔ کی شاعری کے نئے دَور کا آغاز تھی اس کا مطلع تھا:

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مصیبت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

26

امرتسر میں اجلاس کی صدارت کے لیے ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں آئے تھے۔ مشرقی بنگال کے وجود میں آنے کے بعد ان کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی اور اتفاق سے وہ خود بھی کشمیری تھے۔ چنانچہ کشمیری مسلمانانِ لاہور نے فیصلہ کیا کہ ایک وفد اُن سے درخواست کرے کہ وہ اس تنظیم کی سرپرستی قبول کر لیں۔

پہلے ایک وفد ملاقات کا وقت لینے گیا جس میں اقبال شامل نہیں تھے۔ وفد میں دوسرے لوگوں کے علاوہ محمد الدین فوق، مولوی احمد دین اور للّی لاج والے خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش شامل تھے۔ نواب صاحب نے سب سے مصافحہ کیا اور اگلی شام کا وقت مقرر کیا۔

اگلی شام پنجاب کے کئی شہروں سے کشمیری قوم کے نمائندوں کا ایک بڑا وفد نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ڈاکٹر محمد دین ناظر کے تیار کیے ہوئے فارسی سپاس نامے کو اقبال نے بلند آواز میں پڑھ کر سنایا: ''الحمد اللہ امروزِ ساعتِ سعید، بل روزِ عید کہ ما اہلِ خطہ از مختلف مقاماتِ صوبۂ پنجاب بخدمتِ اقدس...''

طویل سپاس نامے کا جواب انگریزی میں دیتے ہوئے نواب صاحب نے انجمن کی سرپرستی قبول کر لی۔[۲۱]

اگلے روز اقبال کانفرنس کی بحثوں میں شریک تھے جب انہیں سیالکوٹ سے تار ملا کہ عطا محمد خطرناک طور پر بیمار ہو گئے ہیں۔ اقبال کانفرنس چھوڑ کر سہ پہر کو سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔[۲۲]

27

عطا محمد موت کے دروازے پر تھے گویا خاندانی ذمہ داریاں اقبال کے دل اور دماغ پر دستک دے رہی تھیں۔

28

اقبال سیالکوٹ میں تھے جب امرتسر ہی میں ۳۰ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا جس کی صدارت کرتے ہوئے سر علی امام نے ایک زبردست خطبہ پیش کیا۔

''میں آپ کے ذہن و دل پر یہ خیال مسلط کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک عظیم قوم ہیں،'' انہوں نے کہا۔ ''ملک کے سیاسی نظام میں آپ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ آپ کا فرض ہے کہ اس ذمے داری کو جو آپ کے سپرد ہے اچھی طرح محسوس کریں۔''

ہندوستانی وطنیت کے بارے میں ان کے خیالات یہ تھے کہ ''ہم تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس ملک کے ساتھ ویسی محبت ہے جو دوسری قوموں کے دلوں میں ہے۔ ہندوستان نہ صرف اس لیے ہمارا وطن ہے کہ ہم یہاں پیدا ہوئے ہیں بلکہ ہماری صدیوں کی یادداشتیں بھی اِس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہم اِس وطن کے احترام اور محبت میں کسی دوسرے سے کم نہیں ہیں مگر جب ہم پڑھے لکھے ہندوؤں کو بندے ماترم گاتے

سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انہوں نے سیوا جی کو قومی ہیرو بنا رکھا ہے تو ہمارا دل مایوسی اور بے اطمینانی سے بھر جاتا ہے۔''

29

چند روز میں عطا محمد کی طبیعت سنبھل گئی۔

دوسرا حصہ

30

عدالت کی چھٹیاں ختم ہوئیں اور اقبال لاہور آ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ضلع کچہری کی بجائے صرف چیف کورٹ میں وکالت کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی وہ موہن لال روڈ سے اُٹھ کر انارکلی کے اُس دومنزلہ میں منتقل ہو گئے جو اس سے پہلے میاں محمد شفیع کی قیام گاہ کے طور پر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اسی میں اقبال کا قیام تھا اور اسی میں ان کا دفتر تھا۔ اوپر کوٹھے پر کبوتروں کو رکھنے کی جگہ بنائی گئی اور کاہن چند کو رخصت کر کے میاں محمد شفیع کے پرانے منشی طاہرالدین کی خدمات حاصل کیں جو مکان کے پچھلے حصے میں منتقل ہو گئے۔[۴۳]

اُس زمانے میں انارکلی کے اوپر والے چوباروں میں طوائفیں رہا کرتی تھیں۔ ''میری آنکھوں کے سامنے اب تک وہ نظارہ موجود ہے،'' ایک ہمعصر کا بیان ہے۔ ''اقبال کی بیٹھک سے انارکلی کے مقابل کے پہلو پر نگاہ کرو تو سفید کپڑا کھڑکی سے لٹکا ہوا جو کسی عورت کی جائے سکونت کی نشانی ہے اور ایک نسائی چہرہ بنا ٹھنا کھلی کھڑکی کے اندر نظر آتا ہے۔ لوہاری دروازے کے اندر چوک چکلہ' اب بھی اس نام سے پکارا جاتا ہے۔''[۴۴]

31

اقبال نے شیخ نور محمد کو خط لکھا کہ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ کم عمری میں اُن کی شادی کر دیتے خاص طور پر جبکہ اقبال نے شادی سے انکار کیا تھا۔ اب وہ بیوی کا خرچ اٹھانے پر تیار ہیں مگر اُسے ساتھ رکھ کر زندگی جہنم نہیں بنا سکتے۔

مختلف ردِّعمل سامنے آئے۔ امام بی بی بیٹے کی دوسری شادی کے حق میں تھیں مگر اُس کے یورپ جا کر آباد ہونے کے بارے میں اُن کا کیا خیال تھا یہ معلوم نہیں۔ عطا محمد اس تجویز پر خوش نہیں تھے اور اقبال کا یورپ میں آباد ہونا سب سے زیادہ انہی کے لیے فکرمندی کی بات تھی۔

میاں جی بھی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھے مگر اس کی وجہ شاید بہو سے ہمدردی ہو۔[۲۵]

32

''یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب لالہ شادی لال، مولوی شاہ دین، میاں محمد شفیع، میاں فضل حسین، لالہ لاجپت رائے، پنڈت شیو نرائن شمیم اور دیگر کئی نامور وکلا ابھی پریکٹس کے مدارج طے کر رہے تھے،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔'' اقبال بھی اسی عہد میں بار روم میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے مقدمات ...کو بڑی محنت سے تیار کرتے تھے...

''فارغ اوقات میں بار روم میں بیٹھ کر جب ظریفانہ انداز اختیار کرتے تو متعدد افراد ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ ہندوؤں میں پنڈت شیو نرائین شمیم کو اقبال سے خاص اُنس تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں خاص دلچسپی لیتا تھا۔

''اِس دوران میرے اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے ... ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم دس بجے کے قریب چیف کورٹ پہنچتے۔ مقدمات شروع ہونے تک اِدھر اُدھر کی گپ شپ چلتی اور جب کوئی مقدمہ ختم ہو جاتا تو دُوسرے کے شروع ہونے

تک پھر بار روم میں آ جاتے۔

"منشی طاہر دین کی جیب میں قینچی سگریٹ کی ڈبیا پڑی رہتی۔ ڈاکٹر صاحب سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لطائف و پر مذاق باتوں سے وقت کاٹتے..."[۲۶]

33

اُسی برس اقبال ایک قانونی رسالے Indian Cases Law Reports کے جوائنٹ سیکرٹری بھی بن گئے۔ یہ رسالہ لاً پبلشنگ پریس لاہور سے کسی ایس ڈی چودھری صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔[۲۷]

34

۴ جنوری کو اقبال نے تلوک چند محروم کو خط لکھ کر ان کے سلام و پیام کا شکریہ ادا کیا جو کئی مہینے قبل مخزن میں شائع ہوا تھا مگر شعر کہنے کی فرمائش سے معذرت کر لی:

"افسوس ہے کہ میں بوجہ مصروفیت فی الحال شعر گوئی سے محروم ہوں۔ خدا آپ کی جولانیٔ طبع کو اور زیادہ کرے۔"

35

۱۰ جنوری کو کشمیری مسلمانانِ لاہور کا اجلاس بلایا گیا جس میں اقبال بھی شریک ہوئے۔[۲۸]

36

اقبال کی ہندوستان واپسی کے بعد ایما کی طرف سے ملنے والے پہلے خط میں ایما نے لکھا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی ایک خط بھیج چکی ہیں۔ یہ خط اقبال کو نہیں ملا تھا۔

خاؤبال صاحب انتقال کر گئے تھے (شاید وہی خفر صاحب جنہیں اقبال صحت کا خیال رکھنے کو کہتے تھے)۔

اقبال نے ۱۱ جنوری کو جواب لکھا، ''یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں کبھی آپ کے خوبصورت وطن کو بھلاسکوں جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا اور براہِ کرم ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا۔شاید ہم دوبارہ جرمنی یا ہندوستان میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ کچھ عرصے بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا تصور ہے اور میری تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہو گا...مہربانی سے اپنے دوست کو مت بھولیے جو آپ کو ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہے اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔کیا یہ ممکن ہے؟ آپ بہتر جانتی ہیں۔''

37

دو دن بعد عطیہ کا خط موصول ہوا۔اُنہوں نے اقبال کو جنجیرہ آنے کی دعوت دی تھی جو بمبئی کے قریب تھا اور جہاں عطیہ کے بہنوئی نوابوں کی طرح رہتے تھے۔

اقبال نے اُن کی والدہ کی تعزیت کی اور بتایا کہ وہ امرتسر والی کانفرنس کے بعد جنجیرہ آنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے مگر بھائی کی طبیعت بگڑنے کی وجہ سے سفر ملتوی کرنا پڑا اور اب جبکہ چھٹیاں ختم ہوگئیں ہیں وہ شاید ستمبر ہی میں جنجیرہ آسکیں گے جب عدالت دوبارہ بند ہوگی۔ 'براہِ مہربانی مجھے اس دنیاداری کی وجہ سے ناپسند مت کیجیے جو یقیناً ایک حماقت ہی ہے جب ہم شاعری کے خوابستان میں ہوتے ہیں۔''

اسی خط میں اقبال نے عطیہ کو بتایا کہ ایرانی مابعد الطبیعات پر اُن کی کتاب شائع ہوگئی ہے اور وہ اُنہیں اس کا ایک نسخہ بھیجیں گے (یہ کتاب پچھلے برس شائع ہوئی تھی)۔

اُنہوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ اپنی غنائیہ نظموں کا مجموعہ شائع کروانا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں چھپے گا، جرمنی میں اس کی جلد بندی ہوگی اور ایک ہندوستانی خاتون کے نام اس کا انتساب ہوگا۔اگر یہ اُن کے اور عطیہ کے درمیان کوئی خفیہ استعارہ نہیں تھا تو بڑی حیرت کی بات ہے کیونکہ دوسروں سے وہ یہی کہ رہے تھے کہ مجموعہ شائع کروانے کا

شوق ہے نہ فرصت۔

بہر حال یہ درست ہے کہ انہی دنوں شاید زندگی میں پہلی بار انہوں نے باقاعدہ بیاض میں اپنی نظمیں جمع کرنی شروع کیں۔ انگلستان میں جس نوٹ بک میں شناساؤں کے پتے اور چند غزلیں تحریر کی تھیں اب اُن میں اُردو کی طرف سے یورپ کے زمانے کی وہ نظمیں اکٹھا کرنا شروع کیں جو کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔

سب سے پہلے وہ نظم لکھنا چاہی جو میونک میں کہی تھی مگر اُس کا صرف پہلا مصرعہ ہی یاد آسکا:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے

باقی صفحہ خالی چھوڑ دیا۔[۲۹]

38

۱۴ جنوری کو میاں شفیع نے حسن نظامی کا ذکر کیا جنہوں نے شاید اپنے حلقے کے بارے میں انہیں بھی لکھا تھا۔

اقبال نے حسن نظامی کو لکھا، ''مجھ کو بھی اپنے حلقے کے ادنیٰ ملازمین میں تصور کیجیے۔ مجھے ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو لے تو پھر عملی طور سے اس میں دلچسپی لینے کو حاضر ہوں۔''

39

۲۲ جنوری کو کشمیری مسلمانانِ لاہور کی سب کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ایک تنظیم، انجمن کشمیری مسلمانان کے نام سے قائم کی گئی۔[۳۰]

40

۲۴ جنوری کو اگلے تین برس کے لیے انجمن حمایت اسلام کی مجلس انتظامیہ کے ارکان

کا انتخاب ہوا۔ اقبال بھی رکن منتخب کیے گئے اور انجمن کے ساتھ اُن کا پرانا تعلق دوبارہ قائم ہو گیا۔

اس دوران انجمن نے کافی ترقی کی تھی۔ دو برس پہلے امیر حبیب اللہ نے کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا جس کا نقشہ میاں محمد عبداللہ نے بنایا تھا جو انجینئر تھے اور انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔ اُنہی کی نگرانی میں یہ عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ پچھلے برس طلبہ کے لیے ایک نئے ہاسٹل کی تعمیر مکمل ہوئی تھی جس کا نام ریواز ہاسٹل رکھا گیا تھا۔

41

اُس برس لوزاک لندن سے شائع ہونے والی آرتھر گلن لیونارڈ کی کتاب *Islam, Her Moral and Spiritual Value and Psychological Study* جس پر سید امیر علی نے پیش لفظ لکھا تھا، اقبال کی بیوی کریم بی بی کے بھائی شیخ غلام محمد کے پاس آئی اور کبھی اقبال کی کتابوں کے مجموعے میں شامل ہوئی۔[۴۱]

42

خواجہ رحیم بخش کے لڑکے فیروز الدین کی شادی اقبال کی بیوی کریم بی بی کی چھوٹی بہن فاطمہ بیگم سے ہو گئی۔[۴۲]

شادی کے دوران فیروز الدین کے تایا زاد بھائی خواجہ عبدالوحید سے آفتاب کی کافی دوستی ہو گئی۔ ہم عمر تھے۔[۴۳]

43

اقبال کی بیوی کریم بی بی کے چھوٹے بھائی غلام محمد شیخ تعلیم مکمل کر کے انڈین میڈیکل سروس میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کی شادی لاہور کے ایک معزز کشمیری گھرانے کی لڑکی فہمیدہ بیگم سے ہوئی۔[۴۴]

44

اقبال کے منشی نے اقبال سے پوچھے بغیر اُن کے دوست ہوشیار پور کے بیرسٹر عبدالعزیز کو کوئی نوٹ لکھ بھیجا۔ ممکن ہے اِس میں اقبال کی وکالت میں کسی قسم کی مدد کرنے کی درخواست کی ہو۔

بیرسٹر عبدالعزیز نے براہِ راست اقبال سے رابطہ کیا اور ۲۷ جنوری کو اقبال نے لکھا، ''آپ نے مجھ میں اور میرے کام میں دلچسپی لینے کا جو وعدہ کیا ہے اُس کا بہت بہت شکریہ۔ منشی نے جو نوٹ آپ کو لکھ کر بھیجا اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ یہ مناسب تھا کہ آپ نے براہِ راست اُس کو جواب نہیں دیا۔''[۲۵]

45

اقبال نے منشی کاہن چند کو ملازمت سے نکال دیا۔[۲۶]

46

وزیرِ ہند لارڈ مورلے نے ہندستان کے لیے اپنی آئینی تجاویز پیش کر دی تھیں جن میں مسلمان نمائندوں کے علیحدہ انتخاب کی بجائے پورے ہندوستان کو ایک قوم تصور کیا گیا تھا۔

مسلم لیگ کی طرف سے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور ۲۷ جنوری کو سید امیر علی کی قیادت میں لندن مسلم لیگ کا ایک وفد لارڈ مارلے سے ملا۔ لارڈ مارلے نے انہیں تسلی دلائی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور انہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ مسلمان بھی آئینی اصلاحات میں دلچسپی لے رہے ہیں ورنہ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں برطانوی حکومت کو بہت دشواری کا سامنا ہو گا۔[۲۷]

47

۵ فروری کو نواب سلیم اللہ نے کلکتہ میں وائسرائے کی کونسل میں کشمیریوں کی فوج بندی کے متعلق سوالات اُٹھائے۔ ہندوستان میں برطانوی افواج کے کمان دارِ اعلیٰ لارڈ کچنر نے جواب دیا کہ کشمیری مسلمانوں کی فوج میں بھرتی پر پابندی نہیں مگر چونکہ ان کا کوئی علیحدہ دستہ موجود نہیں لہٰذا وہ خود ہی اس طرف نہیں آتے۔

کاشت کاری کے بارے میں کہا گیا کہ مقامی حکومت اپنی مرضی سے کاشت کار قوموں کا تعین کرتی ہے۔

48

۶ فروری کو لاہور میں انجمن کشمیری مسلمانان کے عہدہ داروں کا تعین ہوا۔ اقبال جنرل سیکرٹری بنے۔[۳۸]

49

۲۴ فروری کو اقبال انجمن حمایت اسلام کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔[۳۹]

50

وائسرائے کی کونسل میں جو سوال پوچھے جاتے تھے اور ان کے جواب میں جو کچھ کہا جاتا تھا وہ متعلقہ صوبوں کو بھجوا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ نواب سلیم اللہ خاں کے پوچھے ہوئے سوال اور ان کے جواب بھی حکومتِ پنجاب کو بھیجے گئے جس نے فیصلہ کیا کہ کشمیری مسلمانوں کی باقاعدہ فہرست تیار کر کے اندازہ لگایا جائے کہ وہ زراعت پیشہ اقوام میں شامل کیے جانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ کمشنروں کو حکم جاری ہوئے اور انہوں نے فہرستیں بنانے کا کام ڈپٹی کمشنروں کے سپرد کیا۔ انہوں نے تحصیل داروں کو حکم بھیجا کہ وہ اپنی اپنی تحصیل کے اعداد و شمار کی روشنی میں چار سوالوں کے جواب تیار کر کے

بھجوائیں:

۱۔قوم کشمیری کے افراد کا عموماً کیا پیشہ ہے؟

۲۔کس قدر کشمیری ایسے ہوں گے جن کا گزارہ صرف زراعت کاری پر ہے؟

۳۔اگر وہ مالکانِ اراضی ہیں تو کب سے انہوں نے زمین حاصل کی ہے؟

۴۔کوئی کشمیری دخیل کار ہے یا نہیں؟

ایسی تحقیقات کو انگریز اپنی حکومت کا امتیاز سمجھتے تھے چنانچہ بڑی تیزی سے مکمل کی جاتی تھیں۔ انجمن کشمیری مسلمانان کے جنرل سیکرٹری کے طور پر اقبال نے بھی اس فہرست بندی میں دلچسپی لی اور ۷ مارچ کو فوق کے نام لکھا:

''تمام اہلِ خطہ کو جو آپ کے علاقے میں رہتے ہیں ان کو مفصل طور پر یہ سمجھا دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے گاؤں میں بھی فہرست کے تیار کرنے میں مدد دیں تا کہ مکمل فہرست تیار ہو اور ہماری عادل گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ کشمیری کس قدر پنجاب میں زمیندار ہیں اور زمینداری کا کام کرتے ہیں۔

''اگر آپ کو معلوم ہو کہ یہ فہرست بموجب حکم صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر تیار نہیں ہوئی تو صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں مودبانہ درخواست کریں کہ وہ ان کو بموجب حکم کے تیار کرانے کا حکم صادر فرمائیں۔

''جو نقشہ کہ تیار ہو رہا ہے اس کی ایک نقل انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے پاس جس قدر جلد ممکن ہو سکے ارسال فرمانے کی کوشش کریں...''

اُنہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ہر علاقے میں کشمیری مجلس قائم کی جائے ''کیونکہ اس طریق سے نہ صرف قوم کے افراد میں اتحاد و یگانگت کی صورت پیدا ہو گی بلکہ قومی حقوق کی حفاظت اور توسیع میں بھی سہولت ہو گی۔'' یہاں قوم سے اُن کی مراد کشمیری مسلمان تھے۔

یہ پورا طویل خط اُس دفتری زبان میں لکھا گیا تھا جسے نیم پڑھے لکھے منشیوں نے

انگریزوں کی حکومت کے دوران پروان چڑھایا تھا اور جو اقبال کے قلم سے بہت عجیب لگ رہی تھی مگر آخر میں وہی شعر جو اُنہوں نے فوق سے لندن سے واپسی کے بعد پہلی ملاقات میں پڑھا تھا یہاں لکھ کر کسی حد تک حساب بیباق کر دیا۔

51

مارچ کی ابتدا میں اقبال کو ایما کا ایک اور خط ملا مگر وہ کافی عرصہ اس کا جواب نہ دے سکے۔

52

امرتسر میں ایک علمی مجلس منروالاج کے نام سے قائم تھی جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شریک تھے اور منروا کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرتے تھے۔ مارچ کے شروع میں ان کی طرف سے کسی صاحب غلام قادر فرخ نے اقبال کو اگلے ماہ ہونے والے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔

اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے اجلاس کا حوالہ دیا جو اگلے ماہ ہو رہا تھا اور جس کی وجہ سے ان کا امرتسر آنا مشکل تھا۔ مگر ان کے خط میں اس قسم کی کوششوں سے بیزاری جھلک رہی تھی جس میں مسلمان ہندوؤں یا سکھوں کے ساتھ شریک ہوں۔ انہوں نے لکھا کہ امرتسر کے مسلمان منروالاج کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔

53

کوئی شیخ عتیق اللہ صاحب تھے جنہوں نے اقبال کو شہادت الفرقان نامی کتاب لا کر دی۔ اس کے مصنف شیخ عطاءُ اللہ تھے جن کے متعلق معلوم ہوا کہ ان کا پیشہ قانون ہے۔ کتاب میں قرآن کے الہامی کتاب ہونے کے دلائل شاید قرآن کی تالیف کے انداز سے نکالے گئے تھے۔

اقبال خود فان کریمر کی جرمن کتاب کے کچھ حصوں کو اُردو میں ترجمہ کرنے کے

بارے میں سوچ رہے تھے جس میں اس نے خالص علمی نقطۂ نگاہ سے قرآن کے جمع کیے جانے کی تاریخ کا جائزہ لیا تھا۔ کتاب مسلمانوں کے عقاید سے مطابقت نہیں رکھتی تھی مگر اقبال کا خیال تھا کہ ہندوستانی علما کو یورپی تحقیق سے واقفیت تو ہو جائے گی۔[40]

54

رات کی دلہن کے موتی چمک رہے تھے۔ آسمان کے دوسری طرف سے ایک فرشتے کی آواز آئی جو ستاروں سے کہہ رہا تھا کہ وہ نغمہ چھیڑیں جو زمین والوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کر دے۔

رات کی فضا سے خاموشی رخصت ہو گئی اور ستاروں کا گیت آسمان کی وسعت میں گونجنے لگا:

حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
یہ رسم ہے پرانی، رہتے ہیں درد والے
بے خواب مثلِ انجم راتوں کی خامشی میں
آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں اس کی رواروی میں
سمجھیں گے کب وہ ناداں آئینِ سروری کو
ناقص ہیں اب تلک جو آدابِ بندگی میں
ملت حجاز کی ہے مصروفِ فرقہ بندی
نادان لُٹ رہے ہیں سورج کی روشنی میں
بنتے بگڑتے دیکھیں ہم نے ہزاروں قومیں

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اِک بات ہے نرالی اِس بزمِ آخری میں
بارِ گلوئے ملت طوقِ وطن نہیں ہے
تازے ہیں یہ مسافر اسلوبِ راہروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

بیاض کے حاشیے میں ایک اور شعر کا اضافہ ہوا:

اِک عمر میں نہ سمجھے اُس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں[۴۱]

55

بادشاہی مسجد اور پنجاب کی دوسری اہم مساجد کی نگرانی کے لیے چالیس سال سے ایک تنظیم موجود تھی جس کا نام انجمن اسلامیہ پنجاب تھا۔

۲۶ مارچ کو برکت علی محمڈن ہال میں رئیسِ لاہور سید فضل شاہ کی صدارت میں مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا۔ اقبال انجمن کے رکن منتخب کیے گئے۔

56

امرتسر سے غلام قادر فرخ کا جواب آیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ منروالاج میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے مگر اس میں ہندوؤں کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ مسلمان خود ہی اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

۲۸ مارچ کو اقبال نے اپنے جواب میں لکھا کہ مسلمان برہموسماج اور کانگریس سے بھی متنفر رہے تھے اور اگر کسی شہر یا گاؤں میں دو اسکول ہوں جن میں سے ایک ہندوؤں

کا اور دوسرا عیسائیوں کا ہو تو مسلمان اپنے بچوں کو عیسائیوں کے اسکول میں ڈالنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش بے کار ہے اور یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کے راستے الگ الگ ہیں۔

''میں خود اِس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس **ملک** سے اٹھ جانا چاہیے اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اسی پر کاربند ہوں،'' اُنہوں نے لکھا۔ ''مگر اب میرا خیال یہ ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوبصورت ہے اور شعریت سے معمور ہے تاہم موجودہ حالت اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ [سے] ناقابلِ عمل ہے۔''[۴۲]

57

''اقبال انگلستان سے تشریف لائے تو اُن کی عظمت اُن کی جلیل القدر شاعری کی وجہ سے تھی،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''لوگ اُن کے تبحرِ علمی اور حکیمانہ ژرف نگاہی سے واقف نہ تھے لیکن کچھ عرصے بعد ایک جلسے میں جو احمدیہ جماعت کی طرف سے... کیلیاں والی سڑک (برانڈرتھ روڈ) پر منعقد ہوا، ڈاکٹر صاحب (اقبال) نے ایک پر مغز مقالے میں مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔''

اِس مقالے کی اور کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے البتہ مرزا جلال الدین کا بیان ہے کہ یہ انگریزی میں تھا اور اس کی زبان اِس قدر عالمانہ تھی کہ ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ لوگوں کے دلوں پر ''اُن کی بالغ نظری، عالمانہ استعداد اور فلسفیانہ لیاقت کا نہایت گہرا اثر ہوا اور وہ آیندہ کے لیے ایک جلیل القدر شاعر کے علاوہ ایک رفیع المرتبت عالم بھی سمجھے جانے لگے۔''[۴۳]

59

ممکن ہے یہ عبدالقادر کی صحبت کا اثر ہو کہ اقبال نے اُس بیاض میں جس میں وہ قیامِ یورپ کی نظمیں جمع کر رہے تھے کچھ صفحے خالی چھوڑ کر ایک طویل نظم مثنوی کی طرز میں لکھی جس میں اکتیس اشعار تھے۔ اس میں مدینہ کو مخاطب کر کے دہلی، بغداد اور قسطنطیہ کا ذکر کیا گیا تھا اور پھر کہا تھا کہ رسول اللہؐ سے نسبت کی وجہ سے مدینہ ان سب سے بڑھ کر ہے:

جب تلک باقی ہے تُو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اقبال نے زندگی کی طرف کھینچنے والے پیغام میں بھی ایسا موضوع منتخب کیا تھا جس میں سبھی استعارے موت سے وابستہ تھے اور نظم کے آخری اشعار کے سوا پوری دنیا ایک وسیع قبرستان معلوم ہوتی تھی۔

نظم کا نام 'بلادِ اسلامیہ' رکھا گیا۔[۴۴]

58

اپریل میں شیخ عبدالقادر دہلی سے واپس لاہور آ گئے اور چیف کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ مخزن بھی واپس لاہور آ گیا۔ اس مہینے اس میں 'بلادِ اسلامیہ' شائع ہوئی۔

اُسی ماہ کشمیری میگزین میں 'حالاتِ اقبال' کے عنوان سے مضمون اقبال کے فوٹوگراف کے ساتھ شائع ہوا۔

59

گورنمنٹ کالج میں تاریخ کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی۔ اقبال کو دعوت دی گئی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔[۴۵]

60

علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی۔ پانچ سو روپے تنخواہ تھی۔ لوگوں کو امید ہوئی کہ اقبال اسے قومی خدمت سمجھ کر فوراً حامی بھر لیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ شاہ دین ہمایوں نے بھی اقبال کو سمجھایا کہ بیرسٹری کا پیشہ ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا اور انہیں ضرور علی گڑھ کی پروفیسری قبول کرنی چاہیے تاکہ جس طرح حالی نے سرسید سے متاثر ہو کر مسدس لکھی تھی اُسی طرح اقبال بھی قوم کی کوئی ایسی ہی خدمت کر سکیں۔[۴۱]

اقبال تیار نہ ہوئے۔ اخبارات نے ان کے خلاف شکایات کا دفتر کھول دیا۔ انہی میں ان کے پرانے دوست محبوب عالم کا پیسہ اخبار بھی شامل تھا۔

اتفاق سے اقبال کے ہمزاد حسن نظامی بھی اخبارات میں سخت تنقید کا شکار ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر طوائفوں کے مجرا کرنے کے خلاف تحریک چلائی تھی اور پرانے خیالات کے بزرگ بھڑک اٹھے تھے۔

اقبال کچھ دن بیمار رہ کر بستر سے اٹھے اور حسن نظامی کا کارڈ ملا تو لکھا، "بعض لوگ آپ پر اخباروں میں حملے کرتے ہیں۔ افسوس ہے مسلمانوں میں معمولی اخلاق بھی نہ رہے۔"

61

۳ اپریل کو یونیورسٹی ہال میں پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے وائسرائے لارڈ منٹو کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس پر چالیس لوگوں کے دستخط تھے جن میں اقبال بھی شامل تھے۔[۴۲]

62

۵ اپریل کو اقبال نے انارکلی پوسٹ آفس سے ٹامس آرنلڈ کی گیارہ سالہ بچی نینسی کو ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس کی پشت پر جامع مسجد دہلی کی تصویر تھی: "یہ رہا ریاضی کا ایک

مسئلہ تمہارے لیے۔ وہ تمام مرد اور عورتیں جو دلی کی مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں ذرا اُنہیں گن کر تو دکھاؤ!... اقبال''

63

ظفروال میں دس بارہ آدمیوں نے تین کشمیریوں پر مار پیٹ کا دعویٰ دائر کیا۔ تحصیلدار نے فیصلے میں لکھا کہ بظاہر تین آدمیوں کا دس بارہ کی مار پیٹ کرنا مشکل ہے مگر چونکہ کشمیری عام طور پر مفسد اور بہادر پائے جاتے ہیں لہٰذا یہ ممکن بھی ہے۔

کسی کشمیری نے اس فیصلے کی مصدقہ نقل مسلم کشمیری کانفرنس کے دفتر میں بھیجی کہ تحصیلدار پر توہین کا مقدمہ قائم ہونا چاہیے۔ اقبال نے کہا، ''تحصیل دار نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ جو قوم بہادر ہے وہ ضرور مفسد ہے اور جو مفسد ہے وہ بہادر اور دلیر ہے۔ اس فیصلے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا کشمیریوں کی طرف سے نہیں تھی اس لیے وہ لاتفسدو فی الارض کی ذیل میں نہیں آسکتے بلکہ اُنہوں نے قومی غیرت سے کام لے کر اپنی مدافعت کی۔''

مقدمے کی تجویز منظور نہ ہوئی۔[۴۸]

64

اقبال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں لیکچر دینے والے تھے۔

خالص علمی نقطۂ نظر سے مذاہب کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ فطرت میں خوف موجود ہے اور اس خوف پر قابو پانا انسان کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ توحید اسی کا نام ہے کہ مخلوقات کا خوف دل سے نکل جائے اور انسان ایک توانائی کے سرچشمے کے طور پر اپنی ذات سے آگاہی حاصل کرے۔ انسان کسی درمیانی رابطے کے بغیر خدا سے براہِ راست تعلق قائم کرسکتا ہے کیونکہ خدا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر 'میلیو رِزم' پر مبنی ہے یعنی دنیا اچھی ہے نہ بری ہے مگر مجموعی طور پر

بہتری کی طرف جا رہی ہے۔

ایک طاقتور جسم میں طاقتور ارادے کا وجود اسلام کا اخلاقی نصب العین ہے جو کسی عظیم شخصیت کے ظہور ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہ ہو تو اسلام کے قومی مقاصد پر مبنی تعلیم کسی حد تک اِس مقصد کو سہارا دے سکتی تھی۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمان اِس اخلاقی نصب العین سے بہت دُور تھے، یا کم سے کم اقبال کی رائے یہی تھی۔

''اُمید ہے کہ میں قاری کے جذبات مجروح نہیں کریں گا اگر میں یہ کہوں کہ میں شیطان کو بھی کسی حد تک تعریف کے قابل سمجھتا ہوں،'' انہوں نے انگریزی میں لکھا۔ ''آدم، جسے وہ سچ مچ اپنے سے کمتر جانتا تھا، اُسے سجدہ کرنے سے انکار کر کے شیطان نے خودداری کے بڑے اعلیٰ احساس کا مظاہرہ کیا جو ایک ایسی خصوصیت ہے جو میرے خیال میں اُس کی روحانی بدصورتی کی تلافی کے لیے کافی ہونی چاہیے بالکل اُسی طرح جیسے مینڈک کی خوبصورت آنکھیں اُس کی جسمانی بدصورتی کی تلافی کر دیتی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے شیطان کو اس بات پر سزا نہیں دی کہ اُس نے ایک کمزور انسانیت کے باوا آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا بلکہ اس بات پر کہ اُس نے کائنات کے حاکمِ مطلق کے حکم کی پوری فرمانبرداری سے انکار کیا تھا۔''

نہیں معلوم اُس ذہنی دباؤ کا اثر تھا جس سے اقبال اُن دنوں گزر رہے تھے یا کوئی اور بات تھی کہ اس لیکچر کو لکھتے ہوئے اُن کے قلم سے کئی ایسی باتیں نکلیں جو احتیاط سے دُور تھیں اور جنہیں وہ عام حالات میں شاید اس طرح نہ کہتے: ''وقت، توانائی، مضبوطی اور طاقت، ہاں جسمانی طاقت زندگی کا قانون ہے۔ ایک طاقتور انسان کی جیب میں کچھ نہ ہو تو وہ دوسروں پر ڈاکہ ڈال سکتا ہے مگر ایک کمزور شخص؟ اُسے دنیا کی اس مستقل لڑائی کے میدان میں ایک بے حقیقت چیز کی طرح مرنا پڑتا ہے۔''

جمہوریت، اسلام کا سب سے اہم سیاسی نصب العین تھا مگر بدقسمتی سے اسلامی تاریخ میں جمہوریت صرف تیس برس قائم رہ سکی۔ جب مسلمانوں نے فتوحات کا سلسلہ شروع

کیا تو جمہوریت بھی رخصت ہوگئی کیونکہ سامراجی طاقتیں اکثر استبدادی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایشیا کو بادشاہوں کے تسلط سے آزاد کروانے کا سہرا آخر برطانوی سلطنت کے سر بندھا جو اقبال کے خیال میں صرف مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ اپنی سیاسی روح کے اعتبار سے بھی 'دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت' تھی۔

یہ ایک دلچسپ خیال تھا اور شاید کسی قدر عجیب بھی۔ مگر اسلام کے جو سیاسی اصول خود اقبال پیش کرتے تھے اُن میں سے کم از کم ایک اصول برطانوی سلطنت میں رائج نہیں تھا یعنی یہ کہ خدا کا قانون سب سے بڑھ کر ہو۔ اُن کا خیال تھا کہ کسی انسان کو خدا کے بنائے ہوئے قانون کی تشریح کرنے کی بجائے خود قانون بنانے کا اختیار دینا دوسرے تمام انسانوں کی شخصیات کی نشوونما پر برا اثر ڈالتا ہے۔

لیکچر کے آخر میں اقبال نے لکھا کہ بدقسمتی سے مسلمان ذات پات کے معاملے میں ہندوؤں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ''ہم ذات پات کے دہرے نظام سے دوچار ہیں،'' انہوں نے لکھا۔ ''ایک تو مذہبی فرقہ واریت ہے اور پھر ہندوؤں سے سیکھا ہوا یا ورثے میں پایا ہوا ذات پات کا نظام ہے (اسی طرح مفتوحہ قومیں خاموشی کے ساتھ اپنے فاتحین سے انتقام لیا کرتی ہیں)۔ میں اس منحوس مذہبی اور سماجی فرقہ بندی کی مذمت کرتا ہوں۔ میں اس کی مذمت کرتا ہوں خدا کے نام پر، انسانیت کے نام پر، موسیٰ کے نام پر، یسوع مسیح کے نام پر اور اُس کے نام پر جس کے بلند نام کے بارے میں سوچتے ہی میری رُوح کے ریشے ریشے میں جذبات کی تیز لہر دوڑ جاتی ہے، ہاں اُس کے نام پر جس نے انسانیت کو آزادی اور مساوات کا آخری پیغام سنایا۔ اسلام ایک ہے اور اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کسی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں کوئی وہابی، شیعہ، مرزائی یا سُنّی نہیں ہے۔ سچائی کی تشریحات پر ایک دوسرے سے مت الجھو کہ آج خود سچائی خطرے میں ہے!''[۴۹]

65

عطیہ فیضی سماجی کاموں میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔علی گڑھ کی پروفیسری سے اقبال کے انکار کی خبر سن کر انہیں غصہ آیا اور انہوں نے اقبال کو ملامت کی۔ یہ بھی لکھا کہ انہیں ہرگز یقین نہیں ہے کہ وہ سچ مچ تعزیت کرنے بمبئی آنا چاہتے تھے۔

شاید اسی خط میں عطیہ نے کسی میر محمد صاحب کے بارے میں دریافت کیا تھا جن کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اقبال کم سے کم جنجیرہ میں اُن کے گرلز اسکول کے لیے کوئی اُستانی تلاش کرنے میں ان کی مدد کردیں۔

66

بعض سوانح نگاروں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ عطیہ کی عمر اب ستائیس برس ہو چکی تھی لہٰذا والدہ کی وفات کے بعد بڑی بہن اور بہنوئی کو اُن کی شادی کی زیادہ فکر ہوئی ہوگی اور شاید اسی لیے عطیہ فیضی اقبال کو بار بار بمبئی کے قریب جنجیرہ آنے کی دعوت دینے لگیں کیونکہ وہاں اُن کے بہنوئی نواب کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ قیاس آرائی ہے جس کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ عطیہ کو اقبال کی ایما میں دلچسپی کا علم رہا ہو۔

حقیقت جو بھی ہو مگر اگلے دو برسوں میں وہ اقبال کی جیسی گہری دوست ثابت ہوئیں اُس کی کوئی اور مثال اقبال کی زندگی میں نہیں ملتی۔ کسی اور شخصیت کے ساتھ اقبال کی ویسی خط و کتابت موجود نہیں جیسی عطیہ فیضی سے اب شروع ہوئی۔

اِس کا آغاز عطیہ کے ملامت نامے کے جواب سے ہوا۔عطیہ کے نام باقی خطوط کی طرح انگریزی میں تھا۔[۵۰]

لاہور، ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء

مائی ڈیر مس فیضی!

آپ کے نوازش نامے کا شکریہ جو مجھے آج صبح موصول ہوا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میر محمد صاحب کون ہیں۔ آپ شاید انہیں نہیں جانتیں مگر ان کی بیگم سے واقف ہیں اور میرا خیال ہے کہ اب آپ انہیں پہچان چکی ہوں گی۔

ہاں میں نے علی گڑھ میں فلسفہ کی مسند سے انکار کر دیا ہے اور کچھ عرصہ پہلے میں نے لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی مسند قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ میں کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے میں اس ملک سے بھاگ نکلوں۔ وجہ آپ جانتی ہیں۔ مجھ پر اپنے بھائی کا ایک طرح کا اخلاقی قرض ہے جو مجھے روکتا ہے۔ میری زندگی اجیرن ہے۔ وہ میری بیوی کو مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے والد صاحب کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی طے کرنے کا کوئی حق نہیں تھا خاص طور پر جبکہ میں نے اس قسم کے کسی بندھن میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اُس کی کفالت کرنے پر بالکل تیار ہوں مگر اُسے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی اجیرن نہیں کر سکتا۔ ایک انسان کی حیثیت سے خوشی پر میرا بھی حق ہے، اگر معاشرہ یا قدرت اس سے انکار کرتے ہیں تو میں دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ واحد حل یہی ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں یا شراب میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ یہ کتابوں کے مردہ بنجر کاغذ مسرت فراہم نہیں کر سکتے۔ میری روح میں اتنی آگ موجود ہے جو انہیں جلا کر خاک کرنے کے لیے کافی ہو گی اور معاشرے کے تمام رواجوں کو بھی۔

ایک اچھے خدا نے یہ سب کچھ بنایا، آپ کہیں گی۔ ہو سکتا ہے۔ مگر اس زندگی کے حقائق کسی دوسری طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک اچھے خدا کی بجائے ایک قادرِ مطلق شیطان لم یزل پر ایمان لانا عقلی طور پر زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ براہِ کرم میری ان باتوں سے درگذر کیجیے۔ مجھے ہمدردی نہیں چاہیے۔ میں صرف اپنی روح سے بوجھ اتارنا چاہتا تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اور اسی لیے میں نے اپنے

جذبات بیان کرنے کی جسارت کی ہے۔ یہ صیغۂ راز میں ہے، براہِ مہربانی کسی کو بتائیے گا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میں نے کیوں ملازمت سے انکار کیا۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے اب تک کسی استانی کا بندوبست نہیں کر سکا ہوں۔ انجمن کے سیکرٹری نے اگلے روز مجھے بتایا ہے کہ یہاں سے کسی کا ملنا ممکن نہیں۔ اگلے روز میں نے معاشرے کے ارتقا میں مذہب کے کردار پر ایک لیکچر دیا۔ میں صرف چند نوٹس ساتھ لے گیا تھا اور معلوم نہیں میں نے جو کچھ کہا اُسے کسی نے نقل کیا یا نہیں۔ انجمن والا لیکچر انگریزی میں ہوگا: 'Islam As A Moral And Political Ideal' اگر یہ چھپا تو میں آپ کو ایک کاپی بھیج دوں گا۔ میں آبزور کے مدیر سے بھی کہہ دوں گا کہ وہ آپ کو آبزرور کی ایک کاپی بھیج دے۔

عبدالقادر بھی چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لاہور آ گئے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ میری بات پر یقین نہیں کرتیں کہ میں واقعی بمبئی آنا چاہتا تھا تاکہ آپ سے اور ہائی نیس سے مل سکوں جو مجھ پر اتنے مہربان ہیں۔ میں سچ مچ آنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہوگا، میں فی الحال کہہ نہیں سکتا۔ میرے لیے اس سے زیادہ آرام پہنچانے والی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

دو تین ہفتے قبل مجھے آپ کی دوست مس ویگے ناست کا خط موصول ہوا تھا۔ مجھے وہ لڑکی پسند ہے۔ اتنی اچھی اور سچی ہے۔ میں نے اسے اور بوڑھے فرا پروفیسر کو جواب لکھ دیا ہے۔

براہِ کرم ہائی نیس سے میرا ذکر کر دیجیے اور انہیں میری دوستی کا یقین دلائیے جو اگرچہ ان کے کسی کام کی نہیں مگر سچی اور پائیدار ہے۔

آپ کا مخلص

اقبال

67

اُسی روز انجمن حمایت اسلام کا چوبیسواں سالانہ اجلاس شروع ہوا۔

68

اگلے روز کے تیسرے جلسے میں اقبال کو میونسپل کمیٹی ملتان کے نائب صدر شیخ عبدالحق کی صدارت میں ایک لیکچر دینا تھا۔ صدر جلسہ نے انگریزی میں اقبال کا تعارف کروایا۔ حاضرین شاید اس بات سے خاصے مایوس ہوئے ہوں کہ اقبال نے کوئی نظم سنانے کی بجائے اپنا لیکچر Islam As a Moral And Political Ideal پیش کیا۔ کتنے ہی بچے تھے جنہوں نے اقبال کی فریادِ اُمت وغیرہ کے بعد ہوش سنبھالا تھا اور اپنے بزرگوں سے اقبال کی نظم خوانی کا ذکر سنتے ہوئے آنکھیں کھولی تھیں۔ اقبال اُن سب کے لیے خواب وخیال کی چیز تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب عوامی شاعر کی چھاپ مٹانا چاہتے تھے۔

اُن کے انگریزی لیکچر کا خلاصہ میاں فضل حسین نے اُردو میں پیش کیا۔[۵۱]

69

اُس روز وقت نکال کر اقبال نے شہادت الفرقان کے مصنف شیخ عطاء اللہ کو شکریے کا خط بھی لکھا۔

70

شیخ عطا محمد کا تبادلہ بمبئی کے قریب ہو گیا تھا اور وہ وہاں جانے والے تھے۔

انہی دنوں اقبال کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے زنانہ مدارس کی سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے جنجیرہ کے گرلز اسکول کی استانی کے لیے درخواست موصول ہوئی۔[۵۲]

71

عطیہ فیضی کو اقبال کا خط ملا تو وہ کچھ پریشان ہوئیں اور کچھ مایوس۔ کم از کم اقبال جیسے ذہین انسان کو اس طرح موت کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ انہوں نے لکھا کہ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو وہ بتائیں گی کہ چھوٹی چھوٹی مشکلات جو انسان کو ورثہ میں ملتی ہیں اُن پر قابو نہ پانے میں وہ کتنی حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اگر سامنے ہوتے تو وہ بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھیں۔

72

اقبال کا لیکچر آبزرور میں شائع ہو گیا۔

73

۱۶ اپریل کی رات اقبال جہنم پہنچے۔ توقع کے برعکس یہاں بہت سردی تھی۔ فرشتوں نے بتایا کہ جہنم اصل میں ٹھنڈی جگہ ہے مگر آنے والے دنیا سے اپنے ساتھ جو انگارے لاتے ہیں اُن کی وجہ سے یہ گرم ہو جاتا ہے۔

صبح ہوئی تو عطیہ فیضی کا ہمدردی نامہ موصول ہوا اور اقبال نے جہنم کی سیر کا واقعہ انہیں بتانے کے بعد لکھا، ''اِس ملک میں جہاں کوئلے کی کانیں بہت زیادہ نہیں ہیں جتنے انگارے جمع ہو سکتے ہیں میں انہیں جمع کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ عبدالقادر سے میری اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ تقریباً ہر روز چیف کورٹ کے بار روم میں، لیکن بہت عرصہ سے ہم نے آپ کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ آج کل میں دوسروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔ میری اپنی بدنصیب ذات مصیبت انگیز خیالوں کی کان بنی ہوئی ہے جو سانپ کی طرح میری رُوح کے گہرے اندھیرے سوراخوں سے باہر نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں سپیرا بن جاؤں گا اور بازاروں میں پھرا کروں گا۔ تماشہ دیکھنے والے لڑکوں کی ایک جماعت میرے پیچھے ہو گی!''

اُنہوں نے لکھا کہ انہیں مایوسی پسند نہ سمجھا جائے کیونکہ وہ اپنی تکلیف میں بڑی لذت محسوس کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو خوش سمجھنے والوں پر ہنستے ہیں۔ ''چند دن ہوئے مجھے مس ویگے ناست کا خط موصول ہوا تھا۔ جب میں انہیں خط لکھوں گا تو انہیں اُن دنوں کی یاد دلاؤں گا جب آپ جرمنی میں تھیں۔ افسوس، وہ دن جو پھر کبھی نہ آئیں گے۔ وہ آج کل اپنے گھر پر ہیں یعنی ہائیل بروِن میں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اب فرا پروفیسر کی مدد کرنے ہائیڈل برگ واپس آ گئی ہوں گی۔ میری تحریر کی خامیوں سے درگزر کریں، مجھے یاد نہیں کہ میں پہلے کیا لکھ چکا ہوں۔ ہر لمحہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اس لیے اگر آپ کو میرا یہ خط بے جوڑ اور غیر مربوط معلوم ہو تو بدحواس کو معاف کر دیں۔''

خط کا یہ حصہ کسی عجیب اُلجھاوے کا پتہ دیتا ہے۔ انہوں نے صرف آٹھ روز پہلے بھی ایما کے خط کا ذکر کیا تھا اور اب پھر اُس کا ذکر اس طرح کر رہے تھے جیسے کوئی نئی بات ہو۔ اس کے ساتھ ہی ان کا یہ کہنا کہ انہیں یاد نہیں وہ پہلے کیا کچھ لکھ چکے ہیں لہٰذا اگر تحریر بے ربط ہو تو اس بدحواس کو معاف کر دیا جائے... انگریزی میں وہ vagabond یعنی آوارہ گرد لکھنے جا رہے تھے جب vaga لکھ کر کاٹ دیا اور اس کی جگہ vagrant لکھ دیا جسے ہم نے بدحواس کہا ہے مگر اس کا صحیح ترجمہ کیا ہونا چاہیے یہ خود اقبال ہی بہتر بتا سکتے تھے۔

اقبال نے استانی کی درخواست کے بارے میں عطیہ کو بتایا اور ملازمت کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ پھر آبزرور کے دو پرچوں کے ساتھ خط پوسٹ کر دیا۔

74

۲۸ اپریل کو ترکی میں سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے محمد خامس کو خلیفہ بنایا گیا۔ جمہوری دستور نافذ ہو گیا۔

75

یکم مئی کو گورنمنٹ کالج لاہور کے فلسفے کے پروفیسر انتقال کر گئے۔

صرف دو مہینے بعد یعنی جولائی میں سالانہ امتحانات ہونے والے تھے چنانچہ اقبال نے اس شرط پر لڑکوں کو پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لی کہ کلاسیں عدالت شروع ہونے سے پہلے یعنی صبح ۶ بجے سے ۹ بجے تک ہوں گی۔ اس خدمت کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار تھی۔

لاہور میں گرمیوں میں سورج جلدی نکلتا ہے چنانچہ یہ شرط قبول کر لی گئی۔ محکمہ تعلیم کے انڈر سیکرٹری نے چیف کورٹ بار ایسوسی ایشن کے نام درخواست لکھی اور خود اقبال نے بھی ۸ مئی کو ایک رسمی درخواست داخل کروا دی۔ [۵۳]

یورپ جانے سے پہلے انہیں گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی بہت خواہش ہوا کرتی تھی مگر اب نہ وہاں آرنلڈ تھے اور نہ ہی اب وہ پہلے والے اقبال تھے۔

76

انجمن کشمیری مسلمانان چاہتی تھی کہ انگریزی افواج میں کشمیری مسلمانوں کی بھی علیحدہ رجمنٹ یا کمپنی بنائی جائے اور اس سلسلے میں سرپرست نواب سلیم اللہ خاں کی قیادت میں ایک وفد کمانڈر انچیف کے پاس بھیجنے کا پروگرام تھا۔ اس کے علاوہ زراعت پیشہ کشمیری مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لیے وائسرائے کے پاس وفد لے جانے پر غور کیا جا رہا تھا۔

۱۱ مئی کو اقبال نے اس سلسلے میں کسی مرزا افضل احمد صاحب کا خط احمد دین فوق کو اس نوٹ کے ساتھ ارسال کیا کہ اسے کمیٹی میں پیش کرنے کی تجویز آئی ہے۔

چند روز بعد کسی وقت وہ ایک اور طویل مراسلہ تحریر کر رہے تھے جسے اگلے ماہ کشمیری گزٹ میں شائع ہونا تھا۔ یہ مراسلہ انجمن کشمیری مسلمانان کے اراکین کے نام تھا اور اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ انجمن کے تیار کیے ہوئے فارم پُر کر

کے واپس ارسال کردیں تا کہ زراعت پیشہ اور فوج پیشہ کشمیری مسلمانوں کی تفصیلات اور دیگر کشمیری مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہو سکے اور کمیٹی'' اپنے بھائیوں کو کسی قسم کی امداد پہنچا سکے۔ دنیا اِس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ سب علم کے زینے ہی سے آسمانِ عروج و کمال پر پہنچی ہیں۔ آپ کو یاد رہے کہ آپ میں بھی وہ سُچے موتی اور جواہر موجود ہیں جن کی چمک دمک سے دنیا حیران اور خیرہ ہو سکتی ہے لیکن صرف جلا کی ضرورت ہے اور جلا تعلیم کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔''

خط کے آخر میں اُنہوں نے اپنے آپ کو قوم کا خادم اور بیرسٹر ایٹ لاً لکھا تھا۔

77

۷ مئی کو سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان کی منظوری سے اقبال کو مشروط طور پر گورنمنٹ کالج میں مقرر کر لیا گیا مگر اقبال نے چارج نہیں لیا۔ شاید انہوں نے باقاعدہ منظوری کے بعد چارج لینا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔

78

ہمارا جنرل سیکرٹری

نہایت خوشی کی بات ہے کہ انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور کے آنریری جنرل سیکرٹری ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے، پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاً عارضی طور پر بہ منظوری صاحب وزیرِ ہند پروفیسر فلاسفی گورنمنٹ کالج لاہور میں بہ مشاہرہ پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں آپ کو بیرسٹری کی اجازت بھی مل گئی ہے۔

کشمیری میگزین، جون ۱۹۰۹ء

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو؟
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو؟
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے!
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم، عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے!
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

"شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب (اقبال) ہائی کورٹ بند ہو جانے پر سیالکوٹ آ جایا کرتے تھے،" سید محمد ذکی کا بیان ہے۔ "کبھی کبھی باہر نکلتے تو میراں بخش عطار کی

دکان پر بیٹھتے اور وہیں دوست جمع ہو جاتے۔‘‘

ایک دفعہ اقبال نے کہا کہ رسولِ اکرمؐ نے عیسائیوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تمام الزامات سے پاک کر دیا اور پیغمبروں میں اونچا درجہ دیا۔ [۵۴]

81

’ایک حاجی مدینے کے راستے میں‘ اُس زمانے کی عجیب و غریب نظم ہے جس پر براوننگ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک مسافر کا ڈرامائی مونولاگ ہے جس کا قافلہ مکّہ سے مدینہ جاتے ہوئے لُٹ گیا اور اب وہ سوچ رہا ہے کہ آگے بڑھے یا جان بچا کر واپس کعبے کی طرف لوٹ جائے۔ دشواری یہ تھی کہ اگر وہ اپنے محبوبؐ کے روضے کی زیارت کیے بغیر خدا کے گھر کی طرف واپس لوٹ گیا تو قیامت کے روز عاشقوں کو کیا منہ دکھائے گا:

گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذّت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

خدا کے گھر کی طرف واپس جانے کو محملِ شامی کی ہمراہی کے مترادف قرار دینا اگر لاشعوری عمل تھا تو یہ اُس شکایت کا دبا دبا اظہار تھا جو کچھ عرصے سے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھی اور 'شکوہ' کی صورت میں سامنے آنے والی تھی۔

82

اقبال نے اُن اعتراضات کو نظم کرنا شروع کیا جو اُن کے جاننے والے اُن کی شخصیت پر کرتے رہتے تھے:

ہے کوئی مجموعۂ اضداد اے اقبال تُو
جلوہ پیرا انجمن میں ہو کے پھر تنہا بھی ہے
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا

زینتِ گلشن بھی ہے، رونقِ صحرا بھی ہے
ہم نشیں تاروں کا ہے تُو رفعتِ پرواز میں
اے فلک پیا، قدم تیرا زمیں فرسا بھی ہے
عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
مثلِ بوئے گل لباسِ رنگ سے عریاں ہے تُو
ہے تو حکمت آفریں لیکن تجھے سودا بھی ہے

نظم کے اِس حصے کو کئی بار کاٹا گیا اور کئی بار اس کی اصلاح ہوئی، ترمیم اور اضافے ہوئے۔۵۵

اب وہ اعتراضات کا جواب دینا چاہتے تھے مگر یہ جواب اُن کے پچھلے جواب سے بڑھ کر ہو چنانچہ رک گئے۔

83

عطیہ فیضی نے شکایت کی کہ اقبال اُن کی خواہشات کا احترام نہیں کر رہے اور اُن دنوں کو بھی بھول گئے ہیں جب وہ ساتھ بیٹھ کر عطیہ کو پڑھایا کرتے تھے ورنہ وہ شاید زیادہ محتاط ہوتے۔ افسوس کہ انہیں ابھی تک وہ مقام نہیں ملا تھا جس کے وہ کم سے کم شمالی ہند میں ضرور حق دار تھے۔

''میں نے اپنے منصوبے نہیں بدلے ہیں،'' اقبال نے ۷ اجولائی کو جواب میں لکھا تھا۔ ''میری خاموشی سے آپ کو کچھ اور نہیں سمجھنا چاہیے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ [جنجیرہ کا سفر] ہفت خواں عبور کرنے سے کم نہیں...اور میں تو عام طور پر کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنے کے بعد اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ مجھے جس طرف بھی لے جائیں۔

”آپ خود واقف نہیں ہیں کہ آپ نے میرے ساتھ کیا بھلائی کی ہے۔ میں اس سے آگاہ ہوں مگر بیان نہیں کر سکتا لہٰذا اس بات کو رہنے دیجیے۔ جو بات بیان نہیں کی جاسکتی اسے بیان کرنا میرے لیے بیکار سا ہوگا اور آپ ماننے پر تیار بھی نہیں ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی شکایات (جنہیں آپ کا معمولی کہنا درست نہیں) کیا میں انہیں جان سکتا ہوں؟

”یقیناً ہر شخص اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچنے کا منتظر ہے اور میں بھی بے تاب ہوں کیونکہ میں اپنے خالق سے ملنا اور یہ مطالبہ کرنا چاہوں گا کہ وہ میرے ذہن کی معقول تشریح کرے۔ جسے کرنا، میرے خیال میں، اُس کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا، آپ کو اس کی شکایت نہ ہونی چاہیے۔ کئی سال ہوئے میں نے یہ شعر کہا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

”بہت سے لوگوں نے میرے بارے میں ایسی ہی باتیں کہی ہیں اور کبھی کبھی میں خود بھی تنہائی میں اپنے آپ پر ہنستا ہوں۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں ایسے بیانات کا آخری بار جواب دے دوں۔ شائع ہونے پر آپ اُسے مخزن میں دیکھیں گی۔ لوگ جو کچھ میرے متعلق خیال کرتے ہیں اُسے میں نے نظم کر دیا ہے۔ ابھی جواب کی تصدیق ہونا باقی ہے۔“

عطیہ فیضی کے اس افسوس پر کہ اقبال کی قدر و منزلت ویسی نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہیے تھی اقبال نے لکھا کہ دنیا عام طور پر صرف انہیں کی قدر کرتی ہے جو اس کے رسم و رواج کے مطابق چلتے ہیں اور اُنہیں اس سطح تک گرنا گوارا نہیں۔ ان کا موقف وہی ہے جسے انہوں نے بہت عرصہ پہلے ایک شعر میں ادا کیا تھا:

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار

''پبلک کے بہت سے پیروں والے عفریت کو اپنے احترام کا فضلہ دوسروں پر گرانے دیجیے جو مذہب اور اخلاق کے بارے میں جھوٹے رواجوں کی پیروی کر سکتے ہیں، میں ان باتوں کا احترام نہیں کر سکتا جو انسانی دماغ کی فطری آزادی کو دباتی ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو ان کے سامنے جھکا سکتا ہوں۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے زمانے کے لوگوں نے بالکل احترام نہیں کیا اور میں اگرچہ شاعری میں ان کے برابر نہیں مگر اس معاملے میں مجھے اُن کی رفاقت ضرور حاصل ہے۔''

اقبال نے لکھا کہ اُنہیں بالکل یاد نہیں کہ انہوں نے عطیہ کو کبھی پڑھایا ہو۔ انہوں نے افلاطون کے فلسفے سے عطیہ کو صرف متعارف کروایا تھا۔ عطیہ کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ ان کی خواہشات کا احترام نہیں کر رہے کیونکہ ان کی تو ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ وہ ان کی خواہشات کو سمجھنے کی کوشش کریں جہاں تک ممکن ہو انہیں خوش کر سکیں، ''مگر بعض اوقات ایسی چیزیں میرے اختیار سے باہر ہو جاتی ہیں اور فطری قوت مجھے کسی اور طرف لے جاتی ہے۔''

اقبال یہ بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ عطیہ کے خیال میں وہ کس معاملے میں زیادہ محتاط ہوتے اگر انہیں احساس ہوتا۔ ''براہِ مہربانی وضاحت کیجیے... میں ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے آپ خوش ہوں۔ دنیا میری پرستش نہیں کر سکتی نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری پرستش کی جائے۔ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ میں پرستش کا مرکز نہیں بن سکتا، میرے رگ و ریشے میں تو پرستش کرنے کا رجحان اتنا گہرا ہے۔ ہاں، میری روح کی گہرائی میں جو خیالات ہیں اگر وہ دنیا پر ظاہر ہر جائیں اور میرے دل میں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں اگر وہ کبھی ظاہر ہو جائیں مجھے یقین ہے کہ دنیا میری موت کے بعد ایک دن میری پرستش ضرور کرے گی۔ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور اپنے آنسوؤں سے مجھے خراجِ تحسین پیش کرے گی۔'' گویا پھر وہی موت کی بات تھی جس کا اندھیرا ان دنوں

اقبال کے ذہن کے افق پر چھایا ہوا تھا۔

پروفیسری کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ اگرچہ خود ان کا رجحان بھی اسی طرف ہے مگر وہ ہر چیز کو مالی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔

اقبال نے عطیہ سے میونک والی نظم کی نقل بھی مانگی تھی مگر شاید عطیہ نے اُنہیں اُس وقت تک کوئی خط نہیں لکھا جب تک اگلے برس اقبال نے خود اُن سے خط و کتابت دوبارہ شروع نہیں کی۔

84

جولائی کے ہندوستان ریویو (الہ آباد) میں اقبال کے انجمن حمایت اسلام والے لیکچر کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ اسی ماہ مخزن میں ان کی نظم 'ستارہ' شائع ہوئی۔

85

اقبال نے اُس نظم کو مکمل کرنے کی کوشش کی جس میں اپنے اوپر اعتراض کرنے والوں کے بیانات شامل تھے۔ دوسرے حصے یعنی اپنے دفاع میں کئی اشعار لکھے:

سیکڑوں کیفیتیں ہیں ہر کیفیت اقبال اور

اس مصرع سے تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد بہت دنوں تک شاعری کی طرف توجہ دینے کا وقت نہ ملا۔

86

۲۰ جولائی کو اقبال نے جرمن میں ایما کے اُس خط کا جواب دیا جو انہیں مارچ میں موصول ہوا تھا۔ خط کے شروع میں ہوفمین کے ترانے کا مصرع لکھا، ''جرمنی سب سے پہلے!''

''آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے لکھا۔ مجھے آپ کا خط پا کر ہمیشہ بہت مسرت

ہوتی ہے اور میں بے چینی سے اس وقت کا منتظر ہوں جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا۔ براہِ کرم مجھے ہمیشہ ہمیشہ لکھتی رہیے۔ مجھے جرمنی بہت پسند ہے۔ اس نے میرے خیالات پر بہت اثر کیا ہے اور میں جرمنی میں اپنا قیام کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ میں یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں اور خود کو بڑا غمگین پاتا ہوں۔ ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں، ایک عظیم قوت ہے جو ہماری زندگیوں کو منظم کرتی ہے۔ محترمہ پروفیسر صاحبہ، جناب پروفیسر صاحب، اور تمام خواتین وحضرات کو میں ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ آہ وہ دن جب میں جرمنی میں تھا!

''مس فیضی بمبئی میں ہیں۔ اُن کی والدہ انتقال کر گئی ہیں اور وہ بہت غمزدہ ہیں مگر اب کچھ بہتر ہیں۔ بعض اوقات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں اور میرے دل میں یورپ، خاص طور پر جرمنی، کو دیکھنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ براہِ کرم مجھے اپنے دل میں اور اپنی یادوں میں ایک چھوٹی سی جگہ دیجیے گا۔ آپ کا دوست، ایس ایم اقبال...''

87

اگست میں ہندوستان ریویو (الہ آباد) میں اقبال کے انجمن حمایت اسلام والے لیکچر کی دوسری قسط شائع ہوئی۔ اسی ماہ مخزن میں اُن کی نظم 'دوستارے' بھی شائع ہوئی۔

88

اقبال اور عطیہ فیضی کی دوستی کی کہانی میں ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ عطیہ فیضی لاہور آنے والی تھیں مگر انہوں نے اقبال کو اپنے آنے کی کوئی خبر نہ دی۔ اقبال کو دوسروں کی زبانی معلوم ہوا تو دل کو ٹھیس سی لگی۔ عطیہ نے لاہور میں بھی اقبال سے ملاقات کی کوئی کوشش نہیں کی اور شاید اقبال خود ہی ان سے مل بیٹھے یا پھر اتفاقاً دونوں کی ملاقات ہو گئی۔

اس واقعے کی کوئی وضاحت موجود نہیں اور صرف بعد کے ایک خط میں ذرا سا اشارہ

ملتا ہے مگر اُس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ واقعہ کب پیش آیا۔ ممکن ہے عطیہ فیضی اقبال کے جنجیرہ نہ آنے کی وجہ سے ان سے ناراض ہوں کیونکہ اس سے پہلے اقبال ان کی والدہ کی تعزیت کے لیے بھی نہ آ سکے تھے۔ عطیہ کے نقطۂ نظر سے اقبال کے پاس صرف معذرتیں تھیں اور عملاً وہ عطیہ فیضی کو کسی قسم کی اہمیت دینے میں ناکام رہے تھے۔ [۵۱]

89

کچھ عرصہ پہلے اقبال نے خواب میں جہنم کا جو منظر دیکھا تھا اور عطیہ فیضی کو خط میں بیان کیا تھا اُسے نظم کر دیا۔ عنوان رکھا 'سیرِ فلک'۔

اُس وقت اُنہیں اندازہ نہیں رہا ہو گا کہ آسمانوں کی سیر کا موضوع بہت پھیل کر آخرکار اُن کے سب سے بڑے شاہکار کا عنوان بنے گا۔

90

مرزا جلال الدین کی کوٹھی چیمبرلین روڈ پر تھی جو انارکلی سے قریب تھی چنانچہ اقبال کا اُن کے یہاں آنا جانا بڑھ گیا۔

اقبال کبھی کبھی ہائی کورٹ سے اپنی گھوڑا گاڑی پوربی سائیس کے ساتھ واپس بھجوا کر مرزا جلال الدین کی گاڑی ہی میں اُن کے دفتر چلے جاتے تھے اور دیر گئے تک ان کے ساتھ رہتے تھے یا بعض اوقات رات ان کے گھر گزار کر صبح واپس جاتے تھے۔

اب نواب ذوالفقار علی خاں بھی ان دوستوں میں شامل ہو گئے اور بلاناغہ کبھی نواب صاحب کے گھر اور کبھی مرزا صاحب کے گھر محفلیں جمنے لگیں۔ اُن دنوں پنجاب کے مسلمانوں کا رہنما بننے کے لیے میاں محمد شفیع کی نواب ذوالفقار کے ساتھ کشمکش چل رہی تھی۔ وہ ان تینوں دوستوں کو ازراہِ مذاق trio (اصحابِ ثلاثہ) کہتے تھے۔

اِن دوستوں میں میاں شاہنواز کا بھی اضافہ ہوا اور اُن کے وقت کا اکثر حصہ بھی

یہیں گزرنے لگا۔ جوگندر سنگھ اور امراؤ سنگھ شیر گل بھی شامل ہو گئے۔ جوگندر سنگھ کو اقبال 'جوگی' کہتے تھے۔[51]

''میرے ہاں اکثر شام کے وقت محفلِ سرود برپا ہوا کرتی تھی،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے، ''جب اقبال سے میری ملاقات ہوئی تو اُن پر بھی اِس مجلس کا حال کھلا۔ اُدھر میں نے بھی مولوی احمد دین سے اُن کی داستان سن لی تھی۔ دونوں طرف سے کشش تھی اور پہلی ہی صحبت میں ہم سمجھ گئے...

''چنانچہ اقبال کی شمولیت کے بعد ان صحبتوں کی تعداد اور دلکشی میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا... بعض اوقات اقبال پر ایک معنی خیز سکوت سا چھا جاتا اور وہ یوں دکھائی دینے لگتے کہ گویا کسی اور ہی دنیا میں چلے گئے ہیں۔ پھر وہ یکلخت یوں چونک پڑتے گویا نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ اس حالت کے ظاہر ہوتے ہی سمجھ جاتے کہ ان کے دل پر کوئی وجدانی کیفیت طاری ہے اور وہ شعر کی فکر میں ہیں۔

''یہ کئی مرتبہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جب اقبال کا دل کسی جذبے سے متاثر ہوتا تو وہ گردوپیش کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے۔ بہرکیف ان نشاط افزا صحبتوں میں اقبال کی ظرافت پرور طبیعت اپنے زوروں پر نظر آتی اور ان کی زبان سے ایسے ایسے لطیف فقرے چست ہوتے اور ایسی دلفریب پھبتیاں نکلتیں کہ سننے والے پھڑک اٹھتے، مگر ان کے مذاق میں واہیات باتوں اور بیہودہ گفتار کا کوئی دخل نہ ہوتا۔''

جب کبھی اقبال مرزا جلال الدین کے گھر رات گزارتے تو مرزا صاحب دیکھتے کہ اقبال صبح اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور پھر خوش الحانی سے دیر تک قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ ''اُن کی تلاوت سن کر بڑا لطف آتا تھا اور ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے، ''پھر چائے پی کر وہ اپنے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔''[52]

91

مرزا جلال الدین کا نوکر ستار بجانے کا ماہر تھا اور مسدس حالی بھی سناتا تھا۔ اقبال اُس کے ساتھ بیٹھ کر ستار بجانے کی مشق بھی کرتے تھے اور مسدس بھی سنا کرتے تھے اور اس کے علاوہ جو گانے والیاں آتی تھیں وہ بھی کبھی کبھی نعت پڑھتی تھیں۔

یہ تو نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان محفلوں میں صرف حالی کی شاعری اور نعتیں پڑھی جاتی تھیں مگر یہ محفلیں اندر سبھا کا اکھاڑا بھی نہیں تھیں۔ اُس زمانے کے فیشن کے مطابق اچھا وقت گزارنے کا انتظام تھا۔

92

''میاں شفیع کی آرزو تھی کہ [پنجاب مسلم لیگ کے] صدر بن جائیں،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اور ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ وغیرہ نے کوشش کی کہ ڈاکٹر اقبال کو صدر بنایا جائے۔'' اقبال نے اپنی جگہ نواب ذوالفقار علی خاں کا نام پیش کیا جس پر برکت علی محمڈن ہال میں کامیاب جلسہ ہوا۔

میاں محمد شفیع نے میاں شاہ دین سے شکایت کی۔

''میاں شاہ دین نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ اور شفیع گہرے دوست ہیں۔ پھر جھگڑا کیوں؟'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''میں نے کہا کہ یہ میاں صاحب کی غلطی ہے، میں اُن کا مخالف نہیں ہوں، لیکن نواب ذوالفقار علی خاں اور ڈاکٹر اقبال کا بھی دوست ہوں۔ میاں صاحب بولے کہ میری گاڑی میں بیٹھیے، ابھی میاں شفیع صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔'' راستے میں میاں شاہ دین نے کہا کہ میاں محمد شفیع کمزور ہیں اور دوستوں پر بھروسہ نہیں رکھتے۔

کوٹھی لے جا کر انہوں نے مرزا جلال الدین اور میاں محمد شفیع کو گلے ملوایا اور پھر کہا، ''ڈاکٹر اقبال کو لے کر میرے پاس آیئے۔''

مرزا جلال الدین نے جواب دیا، ''ہم نواب ذوالفقار علی خاں کو چھوڑ نہیں سکتے۔''[60]

93

اگست کی ابتدا میں حسن نظامی کی طرف سے کوئی رسالہ موصول ہوا۔انہوں نے بھی اقبال کو بھولنے کا الزام دیا۔

''میں فراموش کار نہیں ہوں،'' اقبال نے ۲ اگست کو لکھا۔'' البتہ اگر آپ کو یہ خطاب دیا جائے تو مناسب ہو گا۔ پنجاب میں نظامی مشہور ہوں اور آپ خبر نہیں لیتے۔''

94

محمد دین فوق جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے اس مہینے اپنے مجموعۂ کلام کے پروف لے کر اقبال کے پاس آئے۔ سارا کلام سنہ وار ترتیب دیا تھا اور ہر نظم سے پہلے مختصر الفاظ میں اس کی شانِ نزول بیان کی تھی۔

اُن کے اصرار پر اقبال نے کمالِ نضرِ فوق تاریخ نکالی اور چھ مصرعوں میں نظم کر دی۔[۵۸]

95

۱۱ستمبر کو پیسہ اخبار میں اعلان شائع ہوا کہ پنجاب مسلم لیگ کا اجلاس ۲۱ سے ۲۳ اکتوبر تک منعقد ہو گا۔میاں محمد شفیع اور شیخ عبدالقادر کے علاوہ اقبال بھی سیاسی موضوعات پر اظہارِ خیال کریں گے۔[۵۹]

96

۱۹ اکتوبر کو گورنمنٹ کالج کے کسی پروفیسر ایم سعید نے ڈبلیو اسٹینلے جیونز کی کتاب *Elementary Lessons in Logic Deductive and Inductive* خریدی یا بہر حال اس پر دستخط کیے۔ بعد میں یہ کتاب اقبال کی کتابوں کے مجموعے میں پہنچی مگر تفصیل معلوم نہیں۔[۶۰]

97

۱۲ اکتوبر کو اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر کے طور پر عارضی چارج لے لیا۔

اس زمانے میں آرٹس کے ہر سینئر پروفیسر کو بی اے کے طلبہ کو انگریزی بھی پڑھانی ہوتی تھی۔ چنانچہ بی ایس سی کے طلبہ کو پی جی ہیمرٹن کی *Human Intercourse* اور ہیل کی مرتب کی ہوئی *Longer English Poems* پڑھانا بھی اقبال کے فرائض میں داخل تھا۔ اِن طلبہ میں اقبال کے کالج کے زمانے کے دوست فضل حسین کے چھوٹے بھائی افضل حسین بھی شامل تھے۔

اس کے علاوہ ہفتے میں دو پیریڈ ایف اے کے طلبہ کی انگریزی کے بھی انہیں لینے تھے۔ اِن میں اقبال کے دوست میاں نظام الدین کے لڑکے میاں اسلم بھی تھے جنہوں نے اُسی برس میٹرک کیا تھا۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے اور خوشی محمد ناظر سے اصلاح لیتے تھے۔[۹۱]

98

۱۷ اکتوبر کو شبلی جنجیرہ میں عطیہ فیضی کے گھر ایک ہفتہ گزارنے کے بعد بمبئی پہنچے اور جنجیرہ کی ''صحبت ہائے رنگیں'' کو یاد کر کے ایک قطعہ لکھا جس کا آخری شعر بہت مشہور ہوا:

اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

99

اقبال کی عادت تھی کہ کلاس روم میں داخل ہو کر تختۂ سیاہ کے اُس رُخ کو جو پہلے سے طلبہ کی طرف ہوتا اُلٹا دیتے اور دوسرے رُخ کو استعمال کرتے۔ اگر کوئی پچھلے گھنٹے

کے نوٹس نہ لکھ سکا ہوتا تو اس کا نقصان نہیں ہوتا تھا۔

کلاس میں اقبال سب سے پہلے حاضری لیتے تھے اور اس کے بعد انگریزی نظم کا ایک بند بڑی خوبصورتی اور صفائی سے پڑھتے اور تختۂ سیاہ پر لکھتے جاتے تھے۔ اُس کے مختلف حصوں کے ہم معنی اردو اور فارسی کے اشعار اور کبھی کبھی عربی کا کوئی شعر بھی لکھ دیتے۔ پہلے ان تمام اشعار کی تشریح اس طرح کرتے تھے کہ اُن کی فنی خوبیوں پر بھی روشنی پڑتی تھی اور اس کے بعد اصل انگریزی نظم کے بند کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اشعار کو اس طرح موازنہ کر کے پڑھانے کا طریقہ انہوں نے اپنے اُستاد مولوی میر حسن سے لیا تھا۔ اُن کے ایک شاگرد محمد علی قصوری کا کہنا ہے کہ ''ڈاکٹر صاحب (اقبال) مختلف نظموں کی تشریح اس طرح کرتے تھے کہ انگریز شاعر ہمارے مشرقی شاعروں سے بہت قریب معلوم ہوتے تھے۔''

طلبہ لیکچر کے ضروری نکات نوٹ کرتے جاتے تھے، خاص طور پر تختۂ سیاہ پر لکھی ہوئی چیزیں تو ضرور اُن کی نوٹ بک میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ لیکچر تمام انگریزی میں ہوتا تھا مگر الفاظ کی ادائیگی میں اقبال پنجابی طلبہ کی سہولت کا خیال رکھتے تھے۔

عام طور پر وہ ایک پیریڈ میں ایک بند سے زیادہ نہ پڑھاتے تھے اور اپنا موضوع ختم کرتے ہی کلاس روم سے چلے جاتے تھے خواہ ابھی پینتالیس منٹ کا پیریڈ ختم ہونے میں دس پندرہ منٹ باقی ہی کیوں نہ ہوں۔

''وہ اس زمانے میں ایک قومی شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر ابھر رہے تھے اس لیے طلبہ ان کا بہت احترام کرتے تھے،'' میاں اسلم کا بیان ہے۔ ''دورانِ تدریس وہ ہمیشہ سنجیدہ اور پروقار رہتے تھے۔ بعض اساتذہ کے طریق کار کے برعکس صرف اپنے موضوع ہی سے تعلق رکھتے، اِدھر اُدھر کی باتیں اُنہوں نے کبھی نہیں کیں اور نہ کبھی ٹرخانے کی کوشش کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ تیاری کر کے آتے تھے۔''

وہ طلبہ سے سبق بھی نہیں سنتے تھے اور نہ ہی اُن سے بلند آواز میں کتاب پڑھوانے

کے قائل تھے بلکہ ہمیشہ خود ہی پڑھ کر سناتے تھے۔ ہفتہ وار یا ماہانہ آزمائشی پرچہ بھی نہیں لیتے تھے۔

ایف اے کے طلبہ کو اقبال کے علاوہ پروفیسر گلبرٹ بھی انگریزی پڑھاتے تھے اور اگرچہ والٹر اسکاٹ کا ناول *Ivan hoe* اور رومن معاشرت کے بارے میں ایک کتاب اُن کے ذمے تھی مگر پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طلبہ اُکتا جاتے تھے۔ اس کے برعکس اقبال کی کلاس میں حاضری سب سے زیادہ ہوتی تھی۔

100

''اقبال نے ہیملٹن کے تصورات کو ذاتی تجربات سے مثالیں دے کر ہمیں سمجھایا،'' افضل حسین کا بیان ہے۔ ''انہوں نے انسانی روابط میں کئی ایسی غلط فہمیوں کی مثالیں دیں جو اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ مختلف معاشروں میں لوگ چیزوں کو مختلف انداز میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔'' اس سلسلے میں اقبال نے اپنے یورپ کے زمانے کے اس دوست کی مثال بھی دی جس کی انگریز دوست اُس سے ناراض ہوگئی تھی۔

''ہیل کی *Longer English Poems* پڑھاتے ہوئے اقبال کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی،'' افضل حسین کا بیان ہے۔ ''اقبال جیسے مرتبے کے شاعر کو کسی نظم کی خوبیوں پر بات کرتے ہوئے اور اُن معانی کی وضاحت کرتے ہوئے سننا جو شاعر کے ذہن میں تھے بہت مزے کا تجربہ تھا۔''

101

اقبال کا اصل مضمون فلسفہ تھا جس کی تدریس کے بارے میں ایک طالب علم خادم محی الدین کا بیان ہے کہ وہ ''اس کے ادق نکات ایسی وضاحت سے بیان فرماتے کہ مضمون آئینہ ہو جاتا تھا۔ چونکہ پروفیسر بریٹ کی طرح برق رفتار نہ تھے اور ہماری ذہنیت سے واقف تھے اس لیے میں ان کے لیکچروں کا بیشتر حصہ کلاس ہی میں قلمبند کر لیتا تھا۔ گھر جا

کر ہر لیکچر کے نوٹ دوبارہ صاف کر کے لکھ لیتا۔'' ۱۲

102

بعض شاگرد اقبال کے گھر آ کر اُن سے علمی باتیں دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان میں محمد علی قصوری اور میاں اسلم بھی شامل تھے۔ ''انگریز شاعروں میں سے ڈاکٹر صاحب ورڈزورتھ، شیلے اور کیٹس کو بہت پسند کرتے تھے،'' محمد علی قصوری کا بیان ہے۔

سید محمد علی جعفری اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ مذہبی خیالات رکھنے والے شیعہ عالم تھے۔ وہ اقبال اور طلبہ کا میل جول پسند نہیں کرتے تھے۔ ''جو تبادلۂ خیالات ہوتا، آزادانہ اور بے تکلف ہوتا،'' جعفری صاحب کا بیان ہے۔ ''میرا خیال تھا کہ طلبہ سے اس قسم کی گفتگو نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے اُن سے کہہ بھی دیا۔'' ۱۳

103

۲۱ سے ۲۳ اکتوبر پنجاب مسلم لیگ کے جس اجلاس کا اعلان ہوا تھا معلوم نہیں وہ ہوا یا نہیں۔

104

وائسرائے اور وزیرِ ہند کی تجاویز بالآخر مکمل ہو کر اور برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہو کر نومبر ۱۹۰۹ء میں سامنے آ گئیں اور عوام میں منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے مشہور ہوئیں۔

کانگریس کو سخت مایوسی ہوئی۔ وائسرائے اور گورنروں کی کونسلوں کے ارکان منتخب تو کیے جائیں گے مگر صرف سوال اٹھانے کا اختیار رکھیں گے جیسا کہ پرانے دستور میں تھا۔ حقیقی اختیارات انتظامی کونسل کے پاس تھے جسے وائسرائے اپنی مرضی سے چنتا تھا اور وہاں صرف ایک ہندوستانی کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ لارڈ مارلے کا کہنا تھا کہ

ویسے ہندوستانی اس قابل بھی نہیں ہیں۔

جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔

''جس روز اصلاحات کا اعلان ہوا کیا میں ابا جان کی اُس روز کی خوشی کبھی بھول سکتی ہوں؟'' میاں محمد شفیع کی بیٹی جہان آرا کہتی ہیں۔ ''اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور انہوں نے کہا، برِصغیر میں مسلمان قوم کا علیحدہ وجود ہمیشہ کے لیے تسلیم ہو گیا ہے اور میں خدا تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے ہماری کوششوں کو کامیاب کیا۔''

کانگریس کی طرف سے مخلوط انتخاب پر تنقید جاری تھی اور بمبئی کے بیرسٹر جناح اس میں مخالفت میں پیش پیش تھے۔

105

گورنر کی قانون ساز کونسل منتخب ہونے والی تھی چنانچہ لاہور کے مسلمانوں میں بھی ہلچل مچی۔

پنجاب میں مسلمانوں کے صرف دو ہی بڑے رہنما تھے، میاں محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خاں۔ ان دونوں کی کشمکش مشہور تھی مگر اتفاق سے انہی دنوں سر بہرام خاں مزاری بلوچ لاہور آئے تو انہوں نے یہ فیصلہ کروایا کہ آپس میں مقابلہ کر کے اپنی قوتیں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ایک دفعہ میاں صاحب منتخب ہو جائیں اور اگلی دفعہ نواب صاحب کو موقع دیا جائے۔ دونوں مان گئے اور اس طرح گورنر کی کونسل کے لیے مسلمانوں کی طرف سے میاں محمد شفیع کا نام پیش ہوا۔

106

نواب ذوالفقار علی خاں کو مہاراجہ پٹیالہ نے اپنی ریاست کا وزیر اعظم بنا لیا اور وہ وہاں چلے گئے۔ پھر اپنے گہرے دوست جوگندر سنگھ کو بھی بلوا لیا جو ریاست کے ہوم منسٹر بن گئے۔[۹۴]

107

مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ کبھی کبھی لاہور آ کر کشمیر ہاؤس میں قیام کرتے تھے۔ فوق کشمیری مسلمانوں کا ایک وفد لے کر اُن کے پاس جانے والے تھے۔ انہوں نے اقبال سے بھی درخواست کی مگر اقبال نے انکار کر دیا۔

''جو مہاراجہ دن کے بارہ بجے سے پہلے کسی مسلمان کا منہ دیکھنا گوارا نہیں کرتا میں کسی وقت بھی اُس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا،'' اُنہوں نے کہا۔ ''غضب خدا کا ایک ایسا شخص جس کے شہر جموں کا نام صبح ہی صبح لینا نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو تک منحوس سمجھتے ہیں، اُس منحوس شہر کا رہنے والا مسلمان کو منحوس سمجھ کر اُس کی شکل سے نفرت کرتا ہے!''

فوق نے سمجھانا چاہا کہ بارہ بجے سے پہلے مہاراجہ اشنان، پوجا پاٹ اور حقہ پینے میں مصروف ہوتے ہیں اور ان کے وزیر بھی بارہ بجے سے پہلے اُن سے نہیں مل پاتے مگر اقبال جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

ملاقات کا وقت آٹھ بجے شام تھا۔ فوق اور وفد کے باقی ارکان کشمیر ہاؤس پہنچے جہاں ایک چھوٹے سے خیمے میں انتظار کرنے کے بعد رات نو بجے سب کو بڑے کمرے میں بلایا گیا۔ کمرے میں انگیٹھی جل رہی تھی اور مہاراجہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وفد فرش پر بیٹھ گیا اور مہاراجہ نے ان کی معروضات کے جواب میں کہا، ''دیوان صاحب آپ سے گفتگو کر چکے ہیں، وہ آپ کی باتوں کا خیال رکھیں گے۔ سرکار کو خود بھی خیال ہے۔''

اس کے بعد خاموشی ہوگئی اور سب سلام کر کے چلے آئے۔[۱۵]

108

شبلی نعمانی کی شعرُ العجم کی دوسری جلد اس سال کے آخر میں شائع ہوگئی۔

109

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کی رات محمد حسین آزاد لاہور میں انتقال کر گئے۔ ہر طرف خبر پھیل گئی۔

اگلے روز محرم کی دس تاریخ تھی چنانچہ جنازہ ۲۴ جنوری کو اٹھا۔

تاریخِ وفات اُس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا''

110

ایک روز اقبال کمرۂ جماعت میں داخل ہوئے اور عادت کے مطابق تختۂ سیاہ کو پلٹایا تو دوسری طرف ٹینی سن کی نظم 'And We Kissed Again With Tears' کا اُردو ترجمہ لکھا ہوا تھا:

پہنچے جب گور پر اِس طور سے دونوں باہم

اقبال نے سنجیدگی سے انگریزی میں پوچھا، ''یہ کس نے لکھا ہے؟''

میاں اسلم نے کھڑے ہو کر انگریزی ہی میں ادب سے جواب دیا، ''سر، یہ میں نے لکھا ہے۔''

اقبال مزید کچھ کہے بغیر سبق پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

111

۲۰ فروری کو انجمن حمایت اسلام کے گریجویٹ ارکان کے انتخاب کے لیے جنرل کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ اقبال، جو ۱۹۱۲ء تک کے لیے مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہو چکے تھے اب جنرل کونسل کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

۲۵ فروری کو وائسرائے کی کونسل میں بمبئی کے بیرسٹر جناح کی شخصیت کھل کر سامنے آ گئی۔ اُس روز انہیں پہلی دفعہ وائسرائے کی کونسل میں بولنے کا موقع ملا تھا اور وہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے بیگار لینے کی پالیسی پر اعتراض کرتے ہوئے اُسے سخت بے رحم اور ظالمانہ قرار دے رہے تھے جب لارڈ منٹو نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں جھڑک دیا کہ جنوبی افریقہ کی حکومت بہر حال ایک دوست حکومت ہے اور وائسرائے اپنی کونسل میں اُس کے لیے اس قسم کے الفاظ سننا پسند نہیں کریں گے چنانچہ مسٹر جناح کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ لفظ ''ظالمانہ'' کو واپس لے لیں۔

جناح نے انتہائی سرد لہجے میں وائسرائے کو جواب دیا، ''جنابِ والا! میں تو اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرنا پسند کروں گا مگر میں اِس کونسل کے ضابطوں سے واقف ہوں اور میں ذرّہ برابر بھی اُن سے باہر نہیں نکلا ہوں۔'' سب نے دیکھا کہ وائسرائے سناٹے میں آ گیا ہے۔

اس کے بعد بیرسٹر جناح نے قانونِ وقف کے بارے میں سوال اٹھایا۔ اسلامی شریعت میں یہ اصول تھا کہ اگر کوئی مسلمان چاہے تو مرتے ہوئے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ مذہبی کاموں کے لیے وقف کر جائے۔ یہ حصہ ٹیکس سے مستثنیٰ اور ناقابلِ فروخت ہو گا۔ بیس بائیس برس پہلے انگریز حکومت نے ایک قانون بنایا تھا جس کی وجہ سے یہ اصول معطل ہو گیا تھا۔

''کیا حکومت مسلمانوں کی خواہشات کے برعکس پریوی کونسل کے پاس کیے ہوئے قانونِ وقف اور خصوصاً وقف علی الاولاد سے متعلق قانون بنانا تجویز کرتی ہے؟'' جناح نے پوچھا۔

وائسرائے کے انگریز لاء ممبر ایڈورڈ تھامسن نے کہا کہ فی الحال حکومت مناسب نہیں سمجھتی کہ پریوی کونسل جو برطانوی عدالتی نظام کا سب سے اونچا ادارہ ہے اُس کے

فیصلوں کو مسترد کرنے کے لیے کوئی قانون بنایا جائے۔

113

اس برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو بھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[۱۴]

Cumont, Franz. *The Mysteries of Mithra* (Translated by Thomas J. McCormack from French). Chicago, Open Court Publishing Co.

Dewe, J. A. *Psychology of Politics and History*. New York, Longmans Green

Dopp, Katherine Elizabeth. *The Place of Industries in Elementary Education*. Chicago, University Press

Ghulam Ahmed Mirza of Qadian. *The Teachings of Islam: A Solution of five fundamental religious problems from the Muslim point of view*. London, Luzac

Haqqani, Muhammad Abdul Haqq. *An Introduction to the Commentary on the Holy Quran (being an English translation of "Al Bayan")*. Calcutta, Thaker, Spink

Justus. *Prologemena to Theism*. New York, Andrew H. Kellogg

Titchner, Edward Bradford. *A Textbook of Psychology*. New York, Macmillan

گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مسٹر کھوسلہ طلبہ کو ترجے کی مشق کرواتے تھے۔ عام طور پر متعصب سمجھے جاتے تھے کیونکہ چُن چُن کر ایسے اقتباسات لاتے تھے جن میں اسلامی تاریخ کی مقبول شخصیتوں کی توہین ہوتی ہو یا کسی اور طرح مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہو۔

ایک روز میاں اسلم نے کلاس میں کھڑے ہو کر کھوسلہ صاحب سے کہا:

"Sir, how long will you abuse our conscience?"

کھوسلہ صاحب نے غضبناک ہو کر کہا، "Get out!"

اِس پر تمام طلبہ کلاس رُوم سے نکل کر باہر لان پر بیٹھ گئے۔ بائیکاٹ دو دن جاری رہا۔ خواجہ صادق اور کچھ دوسرے سرکردہ طلبہ اقبال کے پاس بھی پہنچے۔ اُنہوں نے طلبہ کے مذہبی جذبے کی تعریف کرنے کے بعد اُنہیں بائیکاٹ ختم کرنے کا مشورہ دیا۔

تیسرے دن کالج کے پرنسپل مسٹر رابسن نے طلبہ کو اکٹھا کیا۔ اُن کے کچھ کہنے سے پہلے میاں اسلم نے صفائی پیش کرنی چاہی:

"Sir, I beg to say..."

رابسن صاحب نے، جو اپنی سخت گیری کے لیے مشہور تھے، میاں اسلم کی بات کاٹ دی اور کہا۔

"I give you one hour, otherwise I will expell you."

طلبہ واپس کلاس روم میں پہنچ گئے اور مسٹر کھوسلہ نے دل آزار اقتباسات منتخب کرنے ترک کر دیے۔

115

کاہن چند اقبال سے اپنے منشیانے کے لیے جھگڑتا رہتا تھا۔ اقبال نے اُسے ملازمت سے نکال دیا۔[۱۸]

116

اقبال حیدر آباد دکن کے سفر کا ارادہ کر چکے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نظام محبوب علی خاں کی عجیب وغریب شخصیت اقبال کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ اُن کے پاس جا کر انہیں تصنیف وتالیف کے سلسلے میں اپنے مستقبل کے عزائم سے واقف کریں اور مسلمانوں کی بیداری میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔[۱۹]

نواب صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ جو مشغلہ ہاتھ آ جائے اُس میں دل لگاتے ہوئے دن اور رات کی پرواہ نہیں کرتے۔ دکن کے پرانے لوگوں میں ولی مشہور تھے اور کہا جاتا تھا کہ بے حد فیاض واقع ہوئے ہیں۔ داغ دہلوی کو اپنا استاد بنایا تو سارے جہان کے تفکرات سے آزاد کر دیا۔ مولانا گرامی بھی انہی کے دربار سے وابستہ تھے اور اپنی مخبوط الحواسی کے باوجود اچھا خاصا انعام حاصل کرتے تھے۔

حیدر آباد کی دو اہم شخصیات جن سے اقبال کا غائبانہ تعارف رہا ہوگا، وہ سر اکبر حیدری اور مہاراجہ کشن پرشاد تھے۔ اکبر حیدری کچھ روز پہلے تک ریاست میں فنانس کے معتمد رہے تھے اور اب عدالت وامورِ عامہ کا محکمہ چلا رہے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد مشہور مغل ماہرِ اقتصادیات راجہ ٹوڈرمل کے خاندان سے تھے اور حیدر آباد میں مدار المہام تھے۔

اس سفر کے لیے اقبال کو گورنمنٹ کالج سے دس روز کی عام چھٹی (casual leave) مل گئی جو ۱۹ مارچ سے شروع ہوتی تھی۔

117

مارچ میں رسالہ الناظر لکھنؤ میں شبلی کی کتاب علم الکلام پر تنقیدی مضامین کے

سلسلے کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ لکھنے والے نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا اور صرف 'طالبِ علم' کا قلمی نام اختیار کیا تھا۔

تنقید میں شبلی نعمانی کے بعض دعووں کو رد کیا گیا تھا۔ جن مغربی مصنفین کے افکار پر شبلی نے اعتراض کیے تھے اُن میں سے بعض کے بارے میں ثابت کیا گیا تھا کہ اُن کا وجود ہی نہیں ہے اور شبلی نے مغربی زبانوں سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی تحریروں کا براہِ راست مطالعہ کرنے کی بجائے عربی کے ایک خلاصے پر اکتفا کیا تھا جس میں بہت سی معلومات غلط تھیں۔

118

۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر نے اقبال کو فیلو مقرر کیا۔ اُن کے علاوہ چار دوسرے لوگ بھی نامزد ہوئے تھے جن میں شیخ عبدالقادر اور محمد عبدالعزیز (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) شامل تھے۔ سچ یہ ہے کہ تعلیمی میدان میں اقبال کی بہت قدر ہو رہی تھی اور اسی زمانے میں انہیں پیشکش ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں مستقل طور پر شعبۂ فلسفہ کے صدر بن جائیں۔ یہ اعزاز بہت کم ہندوستانیوں کے نصیب میں آتا تھا اور صرف چھ برس پہلے اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے کی تمنا کرنے والے اقبال کی نظر سے دیکھتے تو حیرت کا مقام تھا کہ اتنے کم عرصے میں ایسی ترقی ہو جائے۔

اقبال نے دوستوں سے مشورہ کیا مگر شاید اُنہی دوستوں سے جن سے مرضی کے مطابق مشورہ ملنے کی امید تھی۔

''ہم سب نے یہی رائے دی کہ سرکاری ملازمت میں اوّل تو قوتِ عمل کے سلب ہونے کا احتمال ہے، دوسرے محکمہ تعلیم میں وسعت کے امکانات بہت محدود ہیں،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''چنانچہ اگر سرکاری ملازمت ہی پر نگاہ ہو تو وکالت ہی کیوں نہ کی جائے جس میں ترقی کے جملہ مدارج میں جج کا عہدہ بھی ہے۔''

119

"معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے مسلمان ممبر کے سوال کو سمجھا ہی نہیں ورنہ وہ ایسا جواب نہ دیتی"، لاہور کے پیسہ اخبار نے ۱۴ مارچ کے شمارے میں لکھا۔ "مسلمانوں کی خواہش جس کا اظہار مسٹر جناح نے کیا ہے یہ ہے کہ پریوی کونسل نے مسلمانوں کے قانون وقف علی الاولاد کو غلط سمجھا اس لیے جو فیصلہ صادر کیا وہ اسلام کے خلاف ہے۔ پس اس فیصلے کو مسترد کیا جائے تا کہ آیندہ معاملات پر اس کا کوئی اثر نہ پڑ سکے۔"۱۳

120

حیدرآباد جانے کا وقت قریب آ رہا تھا مگر گرامی کی طرف سے وقت پر خط کا جواب ملنے کی توقع خود اقبال کی اپنی مشہور زمانہ کاہلی کا جواب تھی، چنانچہ ۱۱ مارچ کو اقبال نے دوبارہ خط لکھا اور پھر شاید جواب سے محروم ہی جمعہ ۱۹ مارچ یا اس سے اگلے روز لاہور سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

تین چار دن کا سفر تھا۔ حیدرآباد میں مسٹر اور مسز اکبر حیدری نے عطیہ فیضی کی سفارش کی وجہ سے ان کی خوب میزبانی کی اور اقبال کا قیام بھی شاید انہی کے گھر رہا۔

"میں وہاں سب بڑے لوگوں سے ملا اور بہت سوں نے مجھے اپنے یہاں مدعو بھی کیا تھا"، اقبال نے بعد میں لکھا۔ ان میں سب سے اہم مہاراجہ کشن پرشاد تھے جو نظام حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے اور خود بھی شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے اقبال کو کسی قسم کا تعریفی رقعہ دیا اور اپنے اشعار پڑھ کر سنائے۔ یہ ان دونوں کے درمیان ایک تعلق کی ابتدا تھی جو مدتوں جاری رہا۔

مسز اکبر حیدری، بقول اقبال "عربی اسپرٹ" رکھتی تھیں اور نہایت دانشمند خاتون تھیں۔ مسٹر حیدری کے متعلق اقبال سمجھتے تھے کہ وہ کوئی خشک مزاج آدمی ہوں گے جنہیں صرف اعداد و شمار سے دلچسپی ہو گی مگر ان سے ملنے پر معلوم ہوا کہ "قدرت نے

انہیں ایک نہایت نفیس تخیل اور بہت ہی نازک دل عطا کیا ہے۔'' اقبال کا خیال تھا کہ آرنلڈ کے گھرانے کی طرح ان دونوں کا گھرانہ بھی حقیقی خوشیوں کا نمونہ تھا۔

مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملاقات ہوئی۔ سات بیویوں میں سے چار مسلمان تھیں جن میں سے ایک کی محبت میں ختنہ بھی کروالیا تھا۔ اپنے بارے میں کہتے تھے کہ مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی ہیں۔ ان کا شعر تھا:

شاد کا مذہب شاد ہی جانے
آزادی آزاد ہی جانے

بعد میں یہ اقبال پر خاص طور پر مہربان ہوئے۔ ممکن ہے اس تعلق کی ابتدا حیدرآباد کے اِس سفر میں ہوئی ہو۔

یہ سب کچھ تھا لیکن اگر اقبال یہ سوچ کر آئے تھے کہ میر محبوب علی خاں سے کوئی ڈھنگ کی بات کر سکیں گے تو اب ان کی خوش فہمی دُور ہو گئی ہو گی۔ حیدرآباد ایک زوال آمادہ معاشرہ تھا۔ انگریزوں کی حکومت بری یا بھلی جیسی بھی تھی اُس نے ہندوستان والوں کو جگا دیا تھا مگر ریاستوں میں ابھی تک ہر روز نئے لطیفے ہوتے رہتے تھے۔

ایک روز گرامی دربار میں پہنچے تو ازار بند لٹک رہا تھا۔ نظام نے اسے گستاخی قرار دیا تو پیش کار نے چپکے سے عرض کی کہ گرامی کی بہن کی شادی ہونے والی ہے اور پنجاب میں لڑکیوں کو جہیز میں خالص سونا دینے کا رواج ہے یہ بیچارہ اِسی فکر میں ہوش کھو بیٹھا ہے۔ حضور نظام نے فوراً پانچ سیر سونا عنایت کر دیا۔ گرامی کو پیش کار سے سارا ماجرا معلوم ہوا تو دوستوں سے کہنے لگے، ''ابھی تو ازار بند لٹک ہی رہا تھا کہ پانچ سیر سونا ملا۔ اگر کہیں کھل جاتا تو دس سیر ملتا!''

خود حضور نظام کا یہ عالم تھا کہ کھڑے ہیں تو گھنٹوں کھڑے ہیں، شکار پر نکلے ہیں تو واپس آنے کا نام نہیں لے رہے۔ اِس ماحول میں اگر اقبال انہیں اٹھارویں صدی کا کوئی جرمن نواب سمجھ کر چلے آئے تھے تو ضرور اُن کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہو گا۔

لکھنوی شاعر نظم طباطبائی بھی اُن دنوں حضور نظام کی ملازمت میں تھے جن کی 'گورِ غریباں' اُن دنوں بہت مشہور تھی۔ یہ تھامس گرے کی اُسی مشہور نظم An Elegy Written in A Country Graveyard کا ترجمہ تھی جس کے چند اشعار کو اقبال نے بھی کسی زمانے میں اپنی پہلی عوامی نظم 'نالۂ یتیم' میں ترجمہ کیا تھا۔

اقبال نے ملاقات کی خواہش کی تو سر اکبر حیدری نے نائب صدر محاسب عبدالرزاق راشد کے ذریعے نظم کو بلوایا اور اشعار سنوائے۔

121

حیدرآباد میں اقبال جلیل مانک پوری کے گھر بھی گئے جہاں دہلی کے عمر رسیدہ شاعر راقم الدولہ ظہیر دہلوی بھی بیٹھے تھے۔ زمانے کے تبرکات میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اپنے ہوش و حواس میں دیکھا تھا بلکہ اس کا روزنامچہ بھی لکھا تھا۔ قصائد کا ایک دیوان رکھتے تھے۔

انہوں نے اقبال سے فرمائش کی مگر اقبال نے عرض کی، ''یا حضرت! جب تک میں پہلے آپ کی زبان سے شعر نہ سن لوں گا اپنا شعر ہرگز نہ سناؤں گا۔'' ظہیر نے جو اشعار سنائے اُن میں سے یہ اقبال کی یادداشت میں محفوظ رہ گیا:

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو[۴۲]

122

حیدرآباد کے سفر میں تین نظموں کی بنیاد بھی پڑی۔ ان میں سے پہلی ایک مختصر نظم تھی جسے اُن صفحوں میں جواب تک یورپ والی نظموں کے لیے خالی پڑے تھے، لکھ کر اس کا عنوان 'صبح' رکھا۔

دوسری نظم مہاراجہ کشن پرشاد کا قصیدہ تھی۔

تیسری نظم کی آمد یوں ہوئی کہ ایک رات مسٹر حیدری اقبال کو حیدرآباد کے مشہور قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کے قبرستان لے گئے جنہوں نے مغلوں سے پہلے یہاں بڑی آب وتاب سے حکومت کی تھی۔ ان کے مقبروں پر پراسرار گنبد بنے ہوئے تھے۔

''رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اِس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا،'' اقبال نے بعد میں لکھا۔

وہیں ایک پرتاثیر نظم کی داغ بیل پڑ گئی جس میں تھامس گرے کی نظم کے علاوہ شاید سوائن برن کی The Garden of Proserpine کا رنگ بھی جھلک رہا تھا اور جسے اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کے قصیدے کے لیے کچھ صفحے خالی چھوڑ کر اپنی بیاض میں شروع کردیا:

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
یعنی دھندلا سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

یہاں سے انہوں نے عطیہ فیضی کو خط بھی لکھا کہ وہ جنجیرہ نہیں آسکیں گے (یا کم از کم بعد میں یہی عذر پیش کیا کہ خط لکھا تھا) مگر یہ عطیہ کو ملا نہیں۔

اِس دوران اُنہیں عطیہ کے بہنوئی جنجیرہ کے نواب کی طرف سے جنجیرہ آنے کا دعوت نامہ ملا جس کے جواب میں اقبال نے عطیہ کو ایک اور خط لکھا اور کالج کھلنے کا عذر پیش کیا۔

123

چونکہ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور اقبال سیدھے لاہور جانے کی بجائے اورنگزیب کے مزار کی زیارت کرتے ہوئے جانا چاہتے تھے لہٰذا بیاض کے کچھ خالی صفحات پر سفر کی

تفصیلات اور گاڑیوں کے اوقات وغیرہ لکھ کر، گھنٹوں اور منٹوں کا حساب لگا کر بڑی محنت سے اس اضافی سفر کی گنجائش نکالی اور ۲۳ تاریخ کو حیدر آباد سے روانہ ہو گئے۔

نظام اُن سے ملاقات کا وقت نہیں نکال سکے تھے۔

124

عطا محمد ملٹری ورکس کے بمبئی ڈسٹرکٹ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے دیولالی چھاؤنی میں مقیم تھے۔ اقبال کے حیدر آباد میں قیام کے دوران یا واپسی کے سفر میں کسی مقام پر وہ بھی آ ملے۔

اورنگ آباد میں اقبال نے اورنگزیب عالمگیر کے مزار کی زیارت کی جس نے مغل سلطنت کی ساری دولت حیدر آباد کے مسلمان فرمانرواؤں کی طاقت ختم کرنے میں صرف کر دی تھی اور بالآخر اسی سرزمین کے سپرد ہوا تھا۔

اقبال کے ذہن میں اورنگزیب کی اس تاریخی تصویر سے زیادہ وہ تصور تھا جو شبلی نعمانی نے پیش کیا تھا جس کے مطابق وہ ہندوستان میں آخری بڑا مسلمان بادشاہ تھا۔

شیخ عطا محمد مزار کے احاطے سے باہر کھڑے رہے کیونکہ اُن کی ڈاڑھی شرعی نہیں تھی۔ صرف اقبال اندر گئے اور جس دل نے چند برس پہلے داراشکوہ کی قبر سے ہوالموجود کی آواز سنی تھی اب اورنگزیب کے مزار سے ذرا مختلف قسم کی آوازیں سن کر لاہور واپس آ گیا۔

''اُسے ہندوستان میں مسلمان قومیت کا بانی سمجھا جانا چاہیے،'' اقبال نے کچھ عرصے بعد لکھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں ایک دن میری بات سے اتفاق کریں گی۔''۲۳

125

اقبال ۲۹ مارچ کو لاہور واپس پہنچ کر سیدھے کالج چلے گئے اور وہاں سے کچہری۔ گھر

پہنچے تو معلوم ہوا کہ عطیہ فیضی کا ایک خط پہلے سے ان کے نام آیا ہوا ہے۔ اس میں انہیں سخت برا بھلا کہا گیا تھا۔ اُنہوں نے احتیاطاً عطیہ کے بہنوئی کو الگ سے معذرت کا تار بھیج دیا اور شاید بہت دیر تک عطیہ کے خط کا مناسب جواب سوچتے رہے۔

اگلے روز اقبال نے عطیہ کو اپنا طویل معذرت نامہ لکھا۔

عطیہ کی شکایت بہت سخت تھی مگر اقبال اس کا احساس نہیں کر سکے۔ سر اکبر حیدری عطیہ کے رشتہ دار تھے اور اُن کے سامنے عطیہ کے بہنوئی کا دعوت نامہ ملنے کے باوجود اقبال کے جنجیرہ نہ آنے سے عطیہ کی خاصی سبکی ہوئی ہو گی۔

اقبال نے عذر پیش کیا کہ کالج کی رخصت میں جنجیرہ کے سفر کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اُنہیں اورنگزیب کے مزار کی زیارت بھی کرنا تھی۔ یہ گویا دِل جلے کو مزید جلانے والی بات تھی اور شاید اِسی لیے اقبال نے جلدی سے وضاحت بھی کر دی کہ، ''میں اُن کے بارے میں ایک نظم لکھنے والا ہوں کہ ایسی ہلا دینے والی چیز اردو کے قارئین نے آج تک نہ پڑھی ہو گی۔''

اس کے علاوہ اپنے بارے میں وہی وضاحتیں تھیں جو عطیہ فیضی اُن سے ہمیشہ سنتی آئی تھیں: ''میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرے تعلقات میں بڑی گہرائی اور گرم جوشی ہوتی ہے مگر دنیا یہی سمجھتی ہے کہ میں ایک بے حس انسان ہوں... براہِ مہربانی نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو یقین دلایئے کہ میں ہمیشہ ان سے عقیدت رکھتا ہوں... میں تو ایک ایسا معمہ ہوں جسے میرے علاوہ سب جانتے ہیں: وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں!... اگر کبھی وقت آیا تو میں یقیناً آپ کو دکھا دوں گا کہ میں اپنے دوستوں سے کتنی گہری محبت کرتا ہوں اور میرے دل میں کتنے گہرے جذبات اُن سب کے لیے موجود ہیں۔''

لاہور ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء

مخدوم و مکرم جناب وحشت

دیوانِ وحشت کی ایک کاپی جو آپ نے از راہِ عنایت ارسال فرمائی موصول ہوئی، شکریہ قبول کیجیے۔ میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں۔ دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابلِ داد ہیں۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے اور یہ بات آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

والسّلام

نیازمند

محمد اقبال

127

اٹلی کے صوبے نیپلز سے کسی بیرونس کا خط اقبال کے نام آیا۔ اُس نے اقبال کی کچھ نظمیں انگریزی ترجمے کے ساتھ مانگی تھیں مگر اقبال اپنی شاعری میں دلچسپی محسوس نہیں کر رہے تھے۔[۳۳]

128

اقبال کا معذرت نامہ پڑھ کر عطیہ کی برداشت جواب دے گئی۔ اُنہوں نے اقبال کی میونک والی نظم کی نقل ارسال کر دی جو اقبال نے پچھلے برس مانگی تھی مگر لکھا کہ وہ سخت جھوٹے ہیں۔ کہاں معاشرے سے بغاوت کی باتیں اور کہاں حیدر آباد کے نواب کی مصاحبت اختیار کرنے کے لیے یہ بھاگ دوڑ، جن درباروں کی کہانیاں سن کر ہی گھن آتی ہے اُن کا حصہ بننے کے لیے ایسی جدوجہد!

عطیہ نے اُنہیں خود غرض اور وعدہ فراموش قرار دیا جنہیں اتنا بھی احساس نہیں تھا کہ نواب جنجیرہ جو عطیہ کو اقبال پر اتھارٹی سمجھتے ہیں اُن کی نظر میں اقبال کی اس بے اعتنائی سے خود عطیہ کی پوزیشن کس قدر خراب ہوئی ہوگی۔

اب اقبال کو محسوس ہوا کہ وہ عطیہ کے پچھلے خط سے اُن کے غصے کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے۔

۱۷ اپریل کو اُنہوں نے ایک اور معذرت نامہ لکھا مگر یہ بھی لکھا کہ لاہور میں کچھ لوگ اقبال کو بھی عطیہ پر اتھارٹی سمجھتے ہیں اور اس لیے اقبال کو بھی بہت افسوس ہوا تھا جب عطیہ نے اپنے لاہور آنے کی اطلاع انہیں نہیں دی تھی۔ اقبال نے لکھا کہ آمنے سامنے بیٹھ کر وضاحتیں پیش کرنا ضروری ہے ورنہ شکایتیں بڑھتی رہیں گی چنانچہ وہ ضرور ملاقات کے لیے وقت نکالیں گے۔

''میرا خیال ہے مجھے اب اپنا خط ختم کرنا چاہیے،'' اُنہوں نے آخر میں لکھا، ''میں نے آپ کو کافی زحمت دی ہے۔ اب رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں، میں دن بھر کام کرنے کے بعد بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا ہوں اور اداس دل کے ساتھ بستر پر آرام کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کی ساری جھڑکیوں کا بہت بہت شکریہ!''

اِس کے بعد شاید سوا ایک برس تک دونوں کے درمیان کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔

129

عطیہ کی بھیجی ہوئی نقل کی مدد سے اقبال نے نظم وصال اپنی بیاض میں شامل کر لی۔ ۷۵

130

قصیدہ لکھنے کا سلسلہ عرب سے شروع ہوا تھا اور ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تھا۔ اقبال نے عربی اور فارسی کے قصیدوں کا مطالعہ کیا تھا اور اردو شاعروں کا کلام بھی اُن کی نظر سے گزرا تھا۔ خود اُنہوں نے چھ سال پہلے ایک قصیدہ نواب بہاولپور کے

دربار کے موقع پر لکھا تھا۔ اب نواب حیدر آباد کی شان میں جو نظم کہی وہ شاید اُن کا دوسرا قصیدہ تھا۔

روایت کے مطابق پہلے مناظرِ قدرت کی تعریف میں اپنی نظم 'صبح' شامل کی۔ اُس کے بعد اپنے حالات پیش کیے اور پھر اس طرح نواب صاحب کی تعریف کی کہ اُس میں مہاراجہ کشن پرشاد کے شکریے کا موقع بھی نکل آیا۔

یہ قصیدہ اُردو کے عام قصیدوں کی نسبت عرب شعرا کی روایت کی بہتر عکاسی کرتا تھا۔ بعض اشعار اقبال کے عام معیار سے گرے ہوئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ اُنہوں نے عرب شاعری کے ایک ایسے انداز کی پیروی کی تھی جو اُردو زبان کی شعریت سے میل نہ کھاتا تھا، مثال کے طور پر وہ حصہ کافی عامیانہ سا لگتا ہے جہاں پنجاب کی بلبلیں شاعر سے شکایت کر رہی ہیں کہ وہ اتنے دن کہاں غائب رہا اور اُس کے جواب میں شاعر بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسی سرزمین میں پہنچ گیا تھا جس کے بادشاہ کی طاقت اور رعب ایران کے پرانے شہنشاہوں کے برابر ہے اور جس کے وزیرِاعظم کی بخشش کے سامنے موتی لٹانے والا سمندر بھی شرما جاتا ہے۔ نظام حیدر آباد بے چارے اپنا ملک انگریز کے پاس گروی رکھے بیٹھے تھے اور وزیرِ اعظم کشن پرشاد ملازم تھے مگر قصیدے کو حقیقت نگاری سے واسطہ نہیں ہوتا۔

مجموعی طور پر یہ اچھا قصیدہ تھا۔ اِس کا عنوان 'شکریہ' تھا اور مکمل ہونے پر اقبال نے مخزن کے حوالے کر دیا۔

گورستانِ شاہی والی نظم بھی اپریل یا مئی میں کسی وقت مکمل ہو کر مخزن کے سپرد ہوئی۔

131

طبیعت دوبارہ شاعری کی طرف مائل ہوئی تو وہ نظم جس میں اپنے بارے میں اعتراضات اور اُن کا جواب لکھا ہوا تھا اور جو مدت سے ادھوری پڑی تھی اب صاف ہو

گئی۔

نظم کا دوسرا حصہ بیاض میں یوں درج ہوا:

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھکو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

ہیں ہزاروں اس کے پہلو رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں

پھر لکھا:

سیکڑوں کیفیتیں، ہر کیفیت کی شان اور
کیا خبر تجھکو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

مگر پھر اسے کاٹ کر آگے بڑھے:

آرزو ہر کیفیت کو اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نگاہ
حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

بے نیازی سے ہے ثابت میری خلقت کا نیاز
یعنی خوئے جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں

موجبِ تسکیں تماشائے شرارِ جستہٗ
ہو نہیں سکتا کہ دل برق آشنا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

تو ذرا میری نظر کی جلوہ آشامی تو دیکھ
طُور شرما جائے ایسا حوصلہ رکھتا ہوں میں
جستجو کُل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حُسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں
زندگی اُلفت کی دردانجامیوں سے ہے مری
عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں
سچ اگر پوچھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا
دل میں ہر دم اِک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں
مجھکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصوّر سے گلہ رکھتا ہوں میں
محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حُسن
پھر تخیل، آہ! کیوں لا انتہا رکھتا ہوں میں

مگر دوسرے مصرعے میں یوں ترمیم کر دی:

پھر تخیل کس لیے لاانتہا رکھتا ہوں میں

آخری شعر فارسی میں تھا کہ دریا کی لہر کی طرح ہمیشہ جستجو میں رہتا ہوں اور اپنے ہی کاندھوں پر ٹوٹتا ہوں:

ہرزہ می سازم شکستِ خویش بر دوشم چو موج
یعنی در راہِ طلب ہم وازہ من کوشم چو موج

اِس شعر کو کاٹ کر قریب قریب یہی مفہوم اِس طرح ادا کیا:

در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما
موجِ بحریم و شکستِ خویش بر دوشیم ما

اُنہی دنوں یا بعد میں کبھی نظم کے حاشیے میں اشعار پر نمبر ڈال کر اُن کی ترتیب میں تبدیلی کی یعنی دوسرا شعر تیسرے نمبر پر اور تیسرا شعر اُس سے پہلے۔[47]

132

ایک روز جوگندر نے اقبال سے ذکر کیا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی صوفیہ جنداں جو عام طور پر راجکماری بامبا کہلاتی ہیں اور جن کی اقامت گاہ جیل روڈ پر واقع ہے وہ اُن سے ملنا چاہتی ہیں۔

مرزا جلال الدین، جوگندر اور اقبال مقررہ وقت پر کوٹھی پر جا پہنچے جہاں راجکماری نے اقبال کے لحاظ میں پہلے سے حقہ تیار کروا رکھا تھا۔ درختوں کے گھنے جھنڈ کے نیچے سب بیٹھ گئے تو وہ خود اُٹھیں اور برآمدے سے حقہ لا کر اقبال کے سامنے رکھ دیا۔ اُن کی فرمائش پر اقبال نے ایک اردو نظم بھی سنائی مگر وہ انگلینڈ میں پلی بڑھی تھیں اور اردو سے اتنی واقف نہ تھیں کہ اقبال کا کلام سمجھ لیتیں چنانچہ جوگندر سنگھ ترجمہ کر کے اُسے بتاتے گئے۔ بعد میں اقبال نے مرزا جلال الدین سے کہا، ''دیکھیے مرزا صاحب! ہمیں رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے حقہ پلایا!''

کچھ روز بعد معلوم ہوا کہ راجکماری کی کوئی سہیلی آئی ہوئی ہیں جن کا تعلق ہنگری سے ہے۔ ان کا نام میری انٹوئنٹ گوٹسمین ہے اور وہ بھی اقبال سے ملاقات کی خواہش مند ہیں۔ جوگندر سنگھ ان دنوں شہر میں موجود نہیں تھے چنانچہ اقبال اور مرزا جلال الدین اُن کے بغیر ہی چلے گئے۔

اِس کے کچھ روز بعد انہیں شالامار باغ میں چائے کی دعوت پر مدعو کیا گیا جہاں راجکماری اور مس گوٹسمین کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون موجود تھیں جن کی گود میں بلّی

تھی۔

مس گوسمین نے باغ سے پھول توڑ کر اقبال کی خدمت میں پیش کیا اور اقبال نے ایک نظم لکھ دی کہ مجھے اِس پھول پر رشک آتا ہے جسے اُس مستِ ناز نے پسند کیا اور اس طرح یہ اپنی شاخ کی جدائی برداشت کر کے اُس نازنیں کے وصال تک پہنچا مگر افسوس کہ میرا کنول جس کی اہلِ نظر لوگوں میں بڑی اہمیت ہے اور جس پر میری جوانی کے گلشن کو فخر ہے اُس کی مراد کبھی پوری نہ ہوئی اور وہ کسی کے رنگیں دامن تک نہ پہنچ سکا:"

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اِسے
فسردہ رکھتا ہے گل چیں کا انتظار اِسے

غالباً گھر واپس آ کر ایک اور نظم کی فکر ہوئی اور بیاض کھل گئی۔ بلّی سے مخاطب ہو کر کہا جا رہا تھا کہ تمہیں اِس طرح کن انکھیوں سے دیکھنا کس نے سکھایا ہے، کس نے تمہیں بتایا ہے کہ محبت کا آغاز اسی طرح ہوا کرتا ہے!

نظم کے اشعار لکھ لکھ کر کاٹے گئے اور بالآخر پوری نظم کاٹ کر اگلے دو صفحوں پر دوبارہ لکھی گئی:

...کی گود میں بلی دیکھ کر

تجھ کو دُزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے
رمز آغازِ محبت کی بتا دی کس نے
دیکھتی ہے کبھی اُن کو کبھی شرماتی ہے
کبھی اٹھتی ہے کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے
ہر ادا سے تری پیدا ہے محبت کیسی
نیلی آنکھوں سے ٹپکتی ہے ذکاوت کیسی
آنکھ تیری صفتِ آئینہ حیران ہے کیا

نُورِ آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا؟
مارتی ہے اُنھیں پہنچوں سے عجب ناز ہے یہ
چھیڑ ہے، غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ
شوخ تُو ہو گی تو گودی سے اُتاریں گے تجھے
گر گیا پھول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے!
نیلگوں آنکھ تری کس کی تمنائی ہے
آہ! کیا تُو بھی اسی چیز کی سودائی ہے
خاص انسان سے کچھ حُسن کا احساس نہیں
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
شیشۂ دہر میں مانندِ مَئے ناب ہے عشق
رُوحِ خورشید ہے خُونِ رگِ مہتاب ہے عشق
دلِ ہر ذرّہ میں پوشیدہ کسک ہے اِس کی
نُور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اِس کی
کہیں سامانِ مسرت، کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے، کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

نظم کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے ''شوخ تو ہوگی'' والے شعر کے دونوں مصرعوں کے نیچے لکیریں کھینچی گئیں گویا یہ پہلے بند کا آخری شعر ہوگا۔ آخری شعر کے دونوں مصرعوں کے نیچے بھی لکیریں کھینچ کر اُسے دوسرے بند کا آخری شعر بنایا۔

اشعار کی ترتیب تبدیل کرنے کے لیے اُن کے حاشیے میں نمبر ڈالے۔ تیسرا شعر دوسرے نمبر پر اور دوسرا شعر اُس کے بعد قرار پایا۔

133

مس گوٹسمین والی نظم سردار امراؤ سنگھ نے انگریزی میں ترجمہ کی۔[۴۸]

134

''ورڈز ورتھ کی مشہور نظم Ode to Immortality کی جیسی شرح ڈاکٹر صاحب نے کی تھی اُس کا خوشگوار نقش اب تک میرے ذہن پر مرتسم ہے،'' اقبال کے شاگرد محمد علی قصوری کا بیان ہے۔

135

مجموعۂ کلام مرتب کرنے کا خیال ایک بار پھر آیا اور شاید اِس لیے تاکہ کسی سے انتساب کیا جا سکے کیونکہ بیاض میں "Dedication to..." کا حوصلہ افزا عنوان ڈال کر مشقِ سخن ہو رہی تھی۔ پہلے سات اشعار لکھ کر کاٹے اور پھر دوسرے صفحے پر کوئی ساڑھے گیارہ اشعار تسلی بخش نکل آئے:[۴۹]

گلستاں بن کر مہک اٹھا دلِ پرخوں مرا

خاتمۂ کلام یہ تھا:

عشق لیکن دردِ محرومی سے پاتا ہے کمال
ہجرِ لیلیٰ سے ہوا آوارہ تر مجنوں مرا

136

انجمن حمایت اسلام دم توڑتی نظر آ رہی تھی۔ وطن اخبار والے مولوی انشاء اللہ خاں جن کے لیے اقبال نے لندن کے سفر کے حالات لکھ کر بھیجے تھے انجمن کے خلاف کئی مقدمات دائر کیے بیٹھے تھے چنانچہ اس دفعہ سالانہ اجلاس میں اقبال نے اپنی کوئی تحریر نہیں پڑھی۔

۲۲ اپریل کو نواب فتح علی خان قزلباش کے دولت کدے پر انجمن سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ اکٹھے ہوئے جن میں اقبال بھی شامل تھے۔ فیصلہ ہوا کہ سات اصحاب کا ایک ثالثی بورڈ مقرر کیا جائے جس میں دونوں طرف سے تین تین لوگ شامل ہوں اور نواب فتح علی قزلباش اس کے صدر مقرر کیے جائیں۔ اس بورڈ میں اقبال بھی شامل تھے۔ ۸۰

137

طویل انگریزی نظموں کا انتخاب جو اقبال گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے اس کی آخری نظم شیلے کی Adonais تھی جو اُس نے کیٹس کی وفات پر لکھی تھی۔ کم نظر نقادوں نے کیٹس کی ایک طویل نظم پر اتنی بے سروپا تنقید کی تھی کہ وہ خون تھوک تھوک کر مر گیا تھا۔

شیلے نے نظم کا آغاز ایک یونانی شعر سے کیا تھا جسے افلاطون سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا، ''تم زندوں کے درمیان ایک چمکتے ہوئے ستارے تھے مگر اب جب تمہاری روشنی یہاں دکھائی نہیں دیتی تو تم اگلی دنیا کا وہ ستارہ بن گئے ہو جس کی روشنی مرے ہوؤں کو نئے جلوے فراہم کرتی ہے۔''

نظم کے شروع میں کیٹس کے جنازے کا فرضی منظر تھا جس میں موسمِ بہار سے لے کر چرند پرند، دیویاں اور بڑے بڑے شاعر سبھی آنسو بہانے جمع ہو رہے تھے۔ آخر میں نظم کا لہجہ بدل جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ کیٹس مرا نہیں ہے بلکہ اُن لوگوں میں داخل ہو گیا ہے جنہیں اب کبھی موت نہیں آئے گی۔

نظم میں پچپن بند تھے اور شاید سبھی نصاب میں شامل تھے۔ اقبال نے اِسے پڑھاتے ہوئے مشرقی شاعری میں سے اس کی ملتی جلتی مثالیں ضرور تلاش کی ہوں گی مگر اُن کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں۔

138

Adonais by P. B. Shelley

Stanza LV

The breath whose might I have invoked in song
Descends on me; my spirit's bark is driven,
Far from the shore, far from the trembling throng
Whose sails were never to the tempest given;
The massy earth and sphered skies are riven!
I am borne darkly, fearfully, afar;
Whilst, burning through the inmost veil of Heaven,
The soul of Adonais, like a star,
Beacons from the abode where Eternals are.

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. 2002-2006

139

علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں لیکچر دینا بڑا اعزاز تھا۔

یہ معلوم نہیں کہ وہاں لیکچر دینے کی دعوت اقبال کو اُس برس کس وقت موصول ہوئی مگر لیکچر دسمبر میں تھا۔ ممکن ہے کہ اسی لیکچر کی تیاری کے لیے اقبال نے وہ نوٹ بک رکھنا شروع کر دی ہو جس کے سرورق پر ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کی تاریخ لکھی تھی اور جس میں وہ اگلے کئی ماہ تک اپنے خیالات نوٹ کرتے رہے۔

اُنہوں نے اس کے سرورق پر Stray Thoughts لکھا مگر پھر اُسے کاٹ کر Stray Reflections کر دیا۔ تمام خیالات انگریزی میں درج ہوئے کیونکہ اقبال فلسفیانہ خیالات کا اظہار انگریزی میں بہتر کر سکتے تھے۔

''فن ایک مقدس جھوٹ ہے،'' اقبال نے لکھا۔ اُن کے نزدیک کسی نظم کی عظمت

اُس کی منطقی سچائی میں نہیں بلکہ اُس کے حسن میں ہوتی تھی۔ گولڈاسمتھ کی نظم 'Deserted Village' میں کئی تاریخی غلطیاں تھیں مگر نظم کی مقبولیت میں کمی نہ آئی تھی۔ ایک عظیم روح کی حسین تخلیق کے سامنے پہنچ کر ہی ہمیں اپنی شخصیت کی خامیوں کا اندازہ ہوسکتا تھا۔

''گوئٹے کے تخیل کی بیکرانی سے واقف ہونے پر ہی میں اپنے تخیل کی تنگی سے آگاہ ہوسکا،'' انہوں نے لکھا۔ گوئٹے نے ایک معمولی کہانی میں تمام انسانیت کا مجموعی تجربہ سمو دیا تھا اور یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے بے ترتیب مادے میں سے خوبصورت کائنات تشکیل دے دی جائے۔

انسان کو سمجھ دے کر فطرت نے گویا اپنے آپ پر تنقید کا دروازہ کھول دیا تھا![81]

140

''خیرات دینے والا دراصل محتاج کی نہیں بلکہ خیرات نہ دینے والے کی مدد کرتا ہے،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''جو کچھ محتاج کو دیا جاتا ہے وہ دراصل ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو غریبوں کو کچھ نہیں دیتے۔ اس طرح خیرات نہ دینے والا دوسروں کی مدد کرنے سے بدستور بے نیاز رہتا ہے اور خیرات دینے والا اس کا بدلہ چکاتا ہے۔''[82]

141

نجی محفلوں میں اقبال کے دوست اُن سے پوچھتے کہ کیا وہ خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ کہتے کہ خدا، وجود اور ایمان کا مفہوم بیان کرو۔

''میں جرح کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سوال پوچھنے والے بھی ان الفاظ کی تعریفوں سے اُتنے ہی ناواقف ہیں جتنا میں ہوں،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا اور پھر ایک مکالمہ درج کیا۔

دل: یہ بالکل یقینی بات ہے کہ خدا وجود رکھتا ہے۔

عقل: مگر میرے عزیز، 'وجود' تو میری اصطلاحوں میں سے ہے اور تمہیں اس کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔

دل: یہ تو اور بھی اچھا ہے، میری ارسطو![۸۳]

142

مئی میں کسی وقت محمد دین فوق اپنے دوست وجاہت جھنجھانوی کو ساتھ لے کر اقبال کے پاس آئے۔ دونوں نے غزلیں کہی تھیں۔ فوق کی غزل کا مطلع تھا:

مصدرِ	فکر	و	پریشانی	ہوں	میں
مرجعِ	تشویش	و	حیرانی	ہوں	میں

ان کا خیال تھا کہ یہ غزل صوفیانہ رنگ میں ہے۔ وجاہت کی غزل دوسرے رنگ میں تھی۔ یہ دونوں اپنا کلام سنا رہے تھے کہ منشی طاہر دین کسی موکل کی آمد کی اطلاع لے کر پہنچ گئے۔ اقبال نے کہا کہ اسے بٹھایا جائے کیونکہ وہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس سے ملیں گے۔ فوق اور وجاہت نے حیرت ظاہر کی تو اقبال نے کہا، ''موکل اگر میرا ہی نام سن کر آیا ہے تو کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔'' اس کے بعد ایک فارسی غزل سنائی جو انہی دنوں کہی تھی۔[۸۴]

143

خودنمائی انسانی فطرت کا عجیب پہلو تھا۔ ہمارے کسی تصور پر دوسرے بھی یقین رکھنے لگیں تو خود ہمارا یقین بڑھ جاتا ہے۔ ہاسپٹل اسسٹنٹ کو اسسٹنٹ سرجن کہہ دیں تو شاید وہ خوش ہو جائے چاہے اس کی تنخواہ میں اضافہ نہ ہو۔

''اس تلخ نفسیات دانی کے لیے مجھے معاف کرنا، مگر تم اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور اب اپنے گھر سے دُور پردیس میں قسمت آزمانا چاہتے ہو،'' اقبال نے خیالات کی

نوٹ بک میں شاید اپنے آپ کو مخاطب کر کے لکھا۔ ''بات یہ نہیں کہ نا کامی نے تمہیں کوئی نیا حوصلہ دیا ہو بلکہ بات یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے منہ چھپانا چاہتے ہو جنہوں نے تمہیں نا کام ہوتے دیکھا ہے۔''۸۵

144

فوق اقبال سے ملنے آئے۔ اقبال کتابوں کی الماری میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ فوق نے پوچھا تو کہا، ''انگوری شراب کی ایک بوتل رکھی تھی۔ کل شمس العلماً مفتی عبداللہ ٹونکی آئے تھے۔ دیکھ رہا ہوں کہیں وہ نہ لے گئے ہوں۔''۸۶

عام خیال یہی ہے کہ اقبال شراب نہیں پیتے تھے مگر اپنی رندی کی تشہیر کرنے میں انہیں مزہ آتا تھا۔

145

میاں شاہ دین ہمایوں کے گھر دعوت تھی۔ انگریزوں کے لیے علیحدہ کمرے میں شراب کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اقبال اور مرزا جلال الدین پہنچے تو میاں شاہ دین نے ہنس کر کہا، ''تم لوگوں کے لیے الگ انتظام کر رکھا ہے۔'' اقبال نے جواب دیا، ''میاں صاحب! ہم نے آپ سے دو باتیں سیکھی ہیں۔ ایک چھپ کر پینا، دُوسرے کسی کو چندہ نہ دینا۔''۸۷

146

۶ مئی کو لندن میں شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم فوت ہو گئے۔

147

سائنسدان بزمِ فطرت میں خدا کو تلاش کرتا تھا اور سر سید نے بھی اسی جذبے کو فروغ دیا تھا۔ صوفی کہتا تھا کہ خدا کو اپنے آپ میں پایا جا سکتا ہے مگر جدید مسلم فکر میں اقبال

شاید پہلے دانشور تھے جنہوں نے خدا کو سمجھنے کے لیے تاریخ کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس خیال کا بیج قرآن ہی میں موجود تھا جس میں پچھلی قوموں کے حالات سے نصیحت حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اقبال تاریخ کو ایک بہت بڑا گراموفون سمجھتے تھے جس میں پچھلی قوموں کی آوازیں محفوظ تھیں مگر اُن کے نزدیک تاریخ ایک طرح کی اطلاقی اخلاقیات تھی۔ اخلاقیات فلسفے کی ایک شاخ کے طور پر زبانی جمع خرچ سے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا چاہتی تھی مگر کسی قوم کا عمل ہی ثابت کرتا تھا کہ وہ دراصل کس بات کو صحیح اور کس بات کو غلط تسلیم کرتی ہے۔ اگر ایک شخص طوائف سے شادی کرتا ہے تو گویا اس کے نزدیک اس قسم کے تعلقات جائز ہیں لیکن اگر یہی بات الفاظ میں کہہ دی جائے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ نیٹشے کا قصور صرف اتنا تھا کہ یورپی اقوام جن اصولوں پر عمل کر رہی تھیں اُس نے اُنہیں الفاظ میں بیان کر کے اُن کے سامنے رکھ دیا جس کی وجہ سے لوگ ناراض ہو گئے اور اُسے دین و مذہب کا دشمن قرار دے دیا۔

عیسائیت نے خدا کو محبت سمجھا تھا اور اسلام نے قوت۔ تاریخ کی طرف دیکھیں تو خدا محبت سے زیادہ قوت کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ جیت اکثر طاقتور کی ہوتی تھی اور طاقت کے بغیر خوبی بھی خامی بن جاتی تھی۔ سیاسی اقتدار سے محرومی کا ہندوستانی مسلمانوں کے کردار پر یہ اثر ہوا تھا کہ شاید ساری اسلامی دنیا میں اِتنی کمینگی کہیں اور دکھائی نہ دیتی ہو جتنی ہندوستانی مسلمانوں کے کردار میں نظر آتی تھی۔ کم سے کم اقبال کا یہی خیال تھا۔

شاید وہ انسانی تاریخ کے اتار چڑھاؤ کو ہیگل کے تصورات کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ ''ہیگل کا نظامِ فلسفہ نثر میں رزمیہ شاعری ہے،'' انہوں نے خیالات کی نوٹ بک میں درج کیا۔[۸۸]

148

ہیلی کا دُم دار ستارہ جو ہمیشہ پچھتر برس بعد نمودار ہوتا تھا ایک دفعہ پھر آنے والا تھا۔

۱۴ مئی کو صبح چار بجے اقبال نے اُسے آسمان پر دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے بے پناہ وسعت اُن کے مختصر وجود میں سمٹ آئی ہو۔ پھر خیال آیا کہ جب یہ ستارہ دوبارہ ظاہر ہو گا تو وہ دنیا میں نہیں ہوں گے۔ صرف اپنے پوتے کی آنکھ سے وہ اِسے دوبارہ دیکھ سکتے تھے۔

ایک لمحے کو ہر خواہش مر گئی۔۸۹

149

گورنمنٹ کالج میں فطری شاعری کے لیے بھی انعام مقرر تھا۔ منصفین میں اقبال بھی شامل تھے۔ اُس برس کے مقابلے میں اُنہوں نے میاں اسلم کی نظم 'وسطِ ایشیا' کو اول انعام دیا۔

نظم میں میاں اسلم کے استاد خوشی محمد ناظرؔ کا انداز صاف جھلک رہا تھا جو دس برس پہلے اقبال اور ناظر دونوں کے یہاں مشترک تھا۔

150

قدرت کے کاروبار میں ہر قوم کے ذمے کوئی مخصوص ذمہ داری تھی۔ جرمن قوم کا رُوحانی نصب العین گوئٹے کے فاؤسٹ میں بائبل سے کہیں بہتر متعین ہوتا تھا کیونکہ اس قوم کی فطرت انسانی علم کو جمع کرنے کے لیے بہت مناسب تھی اگر چہ اب کاروبار کی طرف توجہ دے کر وہ ایک وسیع سلطنت تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ کامیاب ہو جاتے مگر اپنے اصل مقصد سے ضرور ہٹ جاتے۔

سیاسی اقتدار اور طاقت سے محروم ہو کر مسلمان کسی اور خدمت کے قابل نہیں رہے تھے مگر دنیا کی تمام قوموں میں سے صرف وہی خدا کی مطلق توحید پر گواہی دینے کے

قابل تھے۔

''دنیا کی اکثر قومیں ہمیں عصبیت (fanaticism) کا طعنہ دیتی ہیں،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''میں تو یہ کہوں گا کہ ہماری عصبیت درست ہے۔ بیالوجی کی زبان میں عصبیت دراصل انفرادیت کے اصول کی اجتماعی صورت ہے۔'' اس لحاظ سے عصبیت زندگی کے لیے ضروری تھی اور اگر دیکھا جائے تو یورپین بھی اس میں پیچھے نہیں تھے۔ کسی انگریز کے سامنے اس کے مذہب پر تنقید کریں اور وہ خاموش رہے گا کیونکہ اس کی قومی زندگی کا انحصار اس کے مذہب پر نہیں ہے بلکہ وطن پر ہے۔ ذرا اُس کے وطن اور قومی سیاست پر تنقید کریں تو اُس کی عصبیت فوراً سامنے آجائے گی۔

جس طرح دوسری قوموں نے جن میں بدقسمتی سے ہندو بھی شامل تھے، وطنیت کے اصول کو اپنی قومی شناخت بنایا تھا مسلمان ایسا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اُن کی قومی زندگی توحید پر گواہی دینے سے وابستہ تھی۔ خود رسول اللہؐ نے اپنے شہر سے ہجرت کر کے ایک اجنبی شہر کو اپنا وطن بنایا۔

نئی سوچ میں وطن کا تصور ایک بُت سے کم نہ تھا۔ اِس کی مثال خود اقبال کی پانچ چھ برس پہلے کی 'نیا شوالہ' جیسی نظموں میں موجود تھی۔

''حب الوطنی کے اکثر ترانے میری اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ حب الوطنی ایک مادی شے کو خدائی کا درجہ دینے کی کوشش ہے،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔[10]

151

مرزا جلال الدین نے کہ دیکھا کہ کبھی کبھی اقبال موسیقی کی محفل کے دوران اپنی کسی نظم کی بنیاد رکھ دیتے تھے۔

''گانا جاری رہتا کہ اقبال کا قلب جذبات سے متاثر ہونے لگتا،'' مرزا جلال الدین کہتے ہیں، ''اور ایک دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے جس کے ساتھ ساتھ اپنے

داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے۔ اس کیفیت کے آشکار ہوتے ہی اربابِ نشاط کو فی الفور گانے سے روک دیا جاتا... سازندے جو اقبال کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے، نہایت مدھم سُروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے تھے جس کے ساتھ وہ اپنی مخصوص لے میں اپنے اشعار پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کی آواز سازوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے کچھ ایسی دل نواز ہو جاتی کہ ایک سماں بندھ جاتا...'' شیخ عبدالقادر نے تو مرزا جلال الدین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان اشعار کو محفوظ کر لیا کریں مگر مرزا صاحب اس مشورے پر عمل نہ کر سکے۔

ایک ایسے ہی موقع پر جب اقبال اپنے اطراف سے بے خبر اپنے آپ میں کھوئے بیٹھے تھے اُن کا دھیان شاید اپنے اُس ترانے کی طرف گیا جس کی وجہ سے بچہ بچہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کہتا سنائی دیتا تھا۔ اقبال کی زبان سے اُسی لے میں ایک نیا شعر ادا ہونے لگا اور ساز اس کے مطابق بجنے لگے:

دُنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

152

موسیقی کی محفل کے بعد اقبال نے مزید اشعار لکھے:[۱۱]

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
کافی نہیں ہے ہم کو وحدت عرب عجم کی
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

گیارہ اشعار کی نظم ہوئی مگر وہ پہلے شعر سے مطمئن نہیں تھے۔ کوئی اور زوردار شعر ہونا چاہیے:

مشعل جلا دی ہم نے تاریکیٔ جہاں میں

مگر اس کا دوسرا مصرعہ نہ ہو سکا۔ آخر نظم کے نیچے الگ سے دو اشعار لکھے:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
اے موجِ دجلہ تُو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

153

کوئی انجمن شبابِ اسلام تھی۔ اس کا اجلاس ہوا تو اقبال نے وہاں یہ نیا ترانہ سنایا۔

154

یہ ترانہ جو اقبال کا ترانہ کہلایا، اُس زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں اُسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی شناخت بن گیا جس طرح اس سے پہلے ترانۂ ہندی ہندوستان کی شناخت بنا تھا۔

اس کا ذہنی جغرافیہ صقلیہ، بلادِ اسلامیہ یا گورستانِ شاہی وغیرہ سے بڑا مختلف تھا۔ وہاں مایوسی تھی اور گزری ہوئی تاریخ کی راکھ سے ہلکی ہلکی آنچ اٹھ رہی تھی مگر یہاں صرف سرشاری تھی، جیسے وہ کل جو گزر چکا تھا اپنی پوری حرارت کے ساتھ شاعر کے سینے میں دوبارہ زندہ ہو گیا ہو۔

شاید پچھلے دو تین برس کے ذہنی عمل میں سچ مچ یہی ہوا تھا۔

155

روح اور مادے کی تقسیم غلط ہے۔ یہی تباہ کن سوچ ہے جس نے انسانیت کو برباد کیا

ہے، اقبال کا خیال تھا۔

''انسان بنیادی طور پر ایک توانائی ہے، طاقت ہے بلکہ طاقتوں کا مجموعہ ہے جو کئی طرح ترتیب پا سکتی ہیں،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ شخصیت انہی عناصر کی ایک مخصوص ترتیب کا نام تھا۔ موت ایک ایسا صدمہ تھا جس میں ان عناصر کے بکھر جانے کا خطرہ تھا۔ اگر یہ عناصر بکھر جائیں تو اس کا نتیجہ فنا تھا۔ چونکہ اقبال جسم اور روح کو الگ الگ تسلیم نہیں کرتے تھے لہٰذا کمزور شخصیت کی موت اُن کی نظر میں مکمل فنا تھی جس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں تھی۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا جسے کہتے تھے، وہ اقبال کے نزدیک اس بات کا نام تھا کہ ایک شخصیت اتنی مضبوط ہو جائے کہ موت سے بھی اُس کے عناصر بے ترتیب نہ ہونے پائیں۔ ایسی تمام عادتیں جو شخصیت کو کمزور کریں سب سے بڑی برائیاں تھیں مثلاً انکسار، قناعت اور غلامانہ فرمانبرداری۔ یہ موت کے بعد انسان کے زندہ رہنے کے امکانات کو کم کرتی تھیں مگر بدقسمتی سے دنیا کے اکثر مذہبی رہنما انہی عادتوں کو نیکی سمجھ بیٹھے تھے جس کی وجہ وہی روح اور جسم کی علیحدگی کا تصور تھا جس میں سے جسم برا اور روح اچھی سمجھی جاتی تھی۔

اقبال کے خیال میں بلند عزائم، فراخ دلی، دوسروں کی مدد کرنا، اپنی روایات پر جائز فخر کرنا اور طاقت وہ چیزیں تھیں جو شخصیت کو مضبوط بنا کر انسان کو مرنے کے بعد زندہ رہنے کے قابل بناتی تھیں۔ بقائے دوام یا ہمیشہ کی زندگی کسی کیفیت کا نام نہیں تھا جو دنیاوی زندگی کے بعد کسی مرحلے پر خود بخود آ جاتی ہو۔ یہ ایک عمل تھا جو اس زندگی میں بھی جاری تھا۔ مرنے کے بعد زندہ ہونا انسان کی اپنی کوشش ہی سے ممکن تھا۔

اقبال کے نزدیک اسلام کا پیغام یہی تھا جس کا مقصد انسان کی سربلندی تھا خواہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہو اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ نجی محفلوں میں اقبال اگر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو لوگ مابعد الطبیعاتی تصورات، مثلاً خدا، قیامت اور روزِ جزا

کے متعلق اُن تصورات پر اصرار کرنے لگتے جنہیں سمجھے بغیر قبول کرلیا گیا تھا۔

''مجبوراً مجھے اِن تصورات کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''میں عمل کی بات کرتا ہوں مگر وہ ہر صورت میں فلسفے کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مابعد الطبیعات سے پوری طرح جان چھڑانا مشکل ہے۔''[۶۰]

156

''انصاف ایک خزانہ ہے جس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''مگر ہمیں رحم دلی کے چور سے اِسے بچانا چاہیے۔''[۶۱]

157

''نواب ذوالفقار علی خاں صاحب جب پٹیالہ میں تھے تو ہمیں بار بار وہاں بلایا کرتے تھے،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''ایک دفعہ میں اور ڈاکٹر صاحب (اقبال) اُن سے ملنے کے لیے گئے اور دو تین دن وہاں رہے۔''[۶۲]

158

اقبال کے خیال میں عورت کا کام یہ تھا کہ وہ قومی روایات کو اپنی اولاد کے ذریعے زندہ رکھے۔ چنانچہ عورتوں اور مردوں کو ایک جیسی تعلیم نہیں دینی چاہیے تھی۔

''مسلمان لڑکی کے لیے مذہبی تعلیم کافی ہے،'' انہوں نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ اُن کے خیال میں تعلیم بذاتِ خود کوئی چیز نہیں تھی بلکہ قومی ضروریات اس بات کا فیصلہ کرتی تھیں کہ تعلیم کیسی ہونی چاہیے۔ چونکہ مسلمان قوم کی زندگی کسی وطن، برادری یا نسل سے نہیں بلکہ صرف ایک تصور یعنی توحید سے وابستہ تھی لہٰذا قومی تصورات کا باقی رہنا مسلمانوں کی زندگی تھی اور ان تصورات کا مٹ جانا اُن کی اجتماعی موت تھی۔ نئی تہذیب کے وہ نوجوان علمبردار غلطی پر تھے جو مغربی تعلیم دے کر مسلمان عورت کو پردے

سے نکالنا چاہتے تھے۔

مرد اور عورت کی فطرت مختلف تھی اور اسی لیے اسلام نے مردوں کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی تھی۔ ایک عورت سے دل بھر جائے تو دوسری کی تلاش میں نہ پہلی کو طلاق دینا پڑے اور نہ چھپ کر کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرنے پڑیں جیسا کہ مغرب میں ہو رہا تھا جہاں فرانس میں جسم فروشی کو سماجی ادارے کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا جس کا خیال رکھنا ریاست کی ذمہ داری تھی۔

مگر غیر شادی شدہ عورتوں کا وجود جسم فروشی سے بھی برا تھا۔ جن عورتوں کے پاس اولاد کی مصروفیت نہ ہو وہ سیاسی سرگرمیوں پر توجہ کرتی ہیں۔ ''وہ بچے جننے کی بجائے خیالات جننے لگتی ہیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''حال ہی میں اُنہوں نے عورتوں کے لیے ووٹ کے خیال کو جنم دیا ہے۔ جن عورتوں کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے وہ اپنے لیے سیاسی مصروفیات تلاش کر رہی ہیں، بس۔ جو معاشرہ اپنی عورتوں کو بچے پیدا کرنے اور پالنے نہیں دے سکتا اُسے انہیں کوئی اور مصروفیت دینی ہی پڑے گی۔ یورپ میں عورتوں کے لیے ووٹ کے حق کی تحریک اصل میں ووٹ نہیں بلکہ شوہر حاصل کرنے کی پکار ہے۔ میرے نزدیک یہ بیروزگاروں کے ہنگامے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔''[۹۵]

159

گورنمنٹ کالج کے تقسیم انعامات کے جلسے میں لیفٹنٹ گورنر مہمانِ خصوصی تھے۔ شہر کے معززین بھی مدعو تھے۔ اقبال اپنے ساتھ علی بخش کو لے گئے۔ تقریب میں میاں اسلم نے بھی اپنی نظم ترنم کے ساتھ پڑھی۔

اگلے روز میاں اسلم، اقبال کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ گرامی بھی آئے ہوئے ہیں۔ علی بخش نے میاں اسلم کو پہچان کر پنجابی میں کہا، ''واہ اسلم جی! راتیں تے تُسی حد کر دِتی۔''

گرامی اونچا سننے لگے تھے۔ انہوں نے علی بخش سے دریافت کیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اُس نے پچھلی رات کی تقریب اور نظم کا ذکر کیا۔ گرامی نے اسلم سے کچھ سنانے کی پنجابی میں فرمائش کی جس پر میاں اسلم اس لیے خاموش رہے کہ اپنے کالج کے اُستاد اقبال کی موجودگی میں وہ شعر پڑھنے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔ اصلاح تو خوشی محمد ناظر سے لیتے تھے۔

گرامی نے گرج کر دوبارہ تقاضا کیا تو اسلم نے اقبال کی طرف دیکھا اور اُنہوں نے اجازت دی تو اسلم نے جھجکتے ہوئے کہا:

قیس اُڑائے نہ جنوں سے جو کبھی گرد و غبار
سُرمہ پھر زیب دہِ چشمِ غزالاں نہ رہے

گرامی نے شاید ذرا چڑ کر کہا، ''ایہہ تے تیرے اُستاد دا رنگ اے، کجھ ہور سنا!'' یعنی یہ تو اقبال کا رنگ ہے، کچھ اور سناؤ۔

اسلم نے ایک اور شعر سنایا:

جس طرح بنے گزارا کر
یہ زمانہ نہیں شکایت کا

اقبال نے کہا، ''پھر پڑھو!'' جس پر اسلم نے خوشی خوشی اپنا شعر دہرایا۔ اقبال کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہا، ''اسلم! شعر مت کہا کرو۔ نثر لکھا کرو۔''

اُس وقت شاید کسی کو بھی اندازہ نہ رہا ہو کہ اس دن کے بعد میاں اسلم واقعی شاعری ترک کر دیں گے اور بالآخر ایم اسلم کے نام سے اردو کے شاید سب سے زیادہ زُود نویس اور مقبول ناول نگار بنیں گے۔

جدید ہندو کی سیاسی جدوجہد نفسیاتی مطالعے کے لائق تھی۔

اقبال کو یوں لگتا تھا جیسے سیاسی آزادی کے تصور نے جو ہندوؤں کے لیے بالکل نیا تھا، انہیں اس قدر متاثر کیا تھا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں صرف ہونے والی توانائیاں بھی اب اِسی سرگرمی میں خرچ ہو رہی تھیں۔ ''جب وہ اِس تجربے سے گزر چکے گا تب اُسے اپنے نقصان کا اندازہ ہوگا'' اقبال نے خیالات والی نوٹ بک میں تحریر کیا۔ ''وہ اِس لحاظ سے ایک نئی قوم بن چکا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو اپنے آباواجداد کے اخلاقی نصب العین سے بیگانہ پائے گا جن کے لطیف تخیلات میں ہمیشہ غمگین دل قرار پاتے رہے ہیں۔''

کبھی کبھی قومیں ایسے مقاصد کو جنم دے بیٹھتی ہیں جو آگے چل کر خود ایک نئی قوم کی تخلیق کر دیتے ہیں۔[۹]

161

قدیم زمانے کی تاریخ میں شام اکثر روم اور ایران کے درمیان میدانِ جنگ بنتا رہتا تھا۔ اقبال کا خیال تھا کہ جب کوئی چھوٹا **ملک** دو بڑی سلطنتوں کے درمیان واقع ہو تو اُسے اپنی مستقل سیاسی حیثیت استوار کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

افغانستان کا مستقبل بھی اسی اصول کا پابند نظر آتا تھا۔[۷]

162

میتھو آرنلڈ کی شاعری بڑی نپی تلی تھی مگر اقبال کو شاعری میں کسی قدر تجرید پسند تھی کیونکہ اُن کے خیال میں اس طرح جذبات پر زیادہ اثر ہوتا تھا۔ اُس نے سچ کہا تھا کہ شاعری زندگی پر تنقید ہے مگر اقبال کا خیال تھا کہ زندگی بھی شاعری پر تنقید ہے۔[۹۸]

163

سوچ کے سامنے ہمیشہ دو بنیادی راستے رہے ہیں۔ پہلا راستہ تخیل کی طرف جاتا

ہے اور افلاطون اس راستے پر سب سے بڑا رہنما گزرا ہے۔ اُس کے نزدیک اصل دنیا کہیں اور آباد تھی جہاں ہر چیز پہلے سے مکمل تھی۔ ہماری دنیا محض اُس کا نامکمل سایہ تھی۔

دوسرا راستہ حقیقت پسندی کی طرف جاتا ہے اور اس راستے پر ارسطو سے بڑا رہنما کوئی نہیں گزرا۔ اُس کے نزدیک ہر چیز نامکمل تھی مگر اپنی تکمیل کی کوشش میں مگن تھی اور اسی کوشش کا نام بڑھنا اور نشوونما پانا تھا۔

افلاطون اور ارسطو دونوں نے مسلمان مفکروں کو متاثر کیا تھا مگر اقبال بڑی تیزی سے ارسطو کے راستے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بیسویں صدی میں ہونے کی وجہ سے وہ اُس کے تصورات کو پچھلے مسلمانوں سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔

''میں ارسطو کی بہت عزت کرتا ہوں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''مگر ناشکرگزاری کی وہ جھلک جو افلاطون کے نظریۂ اعیان پر اُس کی تنقید میں نظر آتی ہے وہ اُسے پوری طرح داد دینے سے مجھے روکتی ہے۔''

ارسطو، افلاطون کا شاگرد تھا۔ اُس نے افلاطون پر جو تنقید کی تھی اُس سے اقبال کو اتفاق تھا مگر اپنے استاد کے بارے میں اُس کا اندازِ تحریر اقبال کو غیر مناسب معلوم ہوتا تھا۔

ہوسکتا ہے اُس وقت تک خود اقبال کے دل میں افلاطون کے لیے تھوڑی سی وقعت موجود رہی ہو کیونکہ گوئٹے اور اقبال کی طرح افلاطون کے بارے میں بھی فطرت فیصلہ نہیں کرسکی تھی کہ اُسے شاعر بنائے یا فلسفی۔ افلاطون نے حیرت کو تمام علوم کا سرچشمہ قرار دیا تھا جس پر اقبال کو بیدل کا فارسی شعر یاد آتا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ حیرت کے میناخانے میں بہت نزاکتیں موجود ہیں، پلک مت جھپکنا کہ کہیں تماشا خراب نہ ہو جائے!۹۹

عیسائیت سے اقبال کی بیزاری لڑکپن میں مشنری اسکول میں پڑھنے کے زمانے سے

تھی۔اب اسے نظریاتی بنیاد مل گئی۔اُن کے خیال میں انسانی سوچ میں سب سے زیادہ انقلابات لانے والی ہستیاں مہاتما بدھ، رسول اللہؐ اور کانٹ تھے جبکہ نپولین دنیائے عمل میں بے مثال تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کوئی انقلاب نہیں لا سکے تھے کیونکہ اُن کی شروع کی ہوئی تحریک بہت جلد قبل مسیح کی بت پرستی میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔''میرے نزدیک عیسائیت قدیم بت پرستی کے سامی مذہب کی زبان میں ترجمے سے زیادہ نہیں ہے،'' انہوں نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا اور پھر یہ اضافہ کیا کہ حضرت عیسیٰؑ یہودی نسل کی دو سب سے بڑی ہستیوں میں سے تھے۔ فلسفی اسپنوزا دوسری بڑی ہستی تھا۔اگر یسوع مسیح کی تعلیمات میں خدا بیٹے کی صورت میں جلوہ گر دکھائی دیتا ہے تو اسپنوزا کے یہاں خدا کائنات میں نمودار ہوتا ہے۔اس طرح اسپنوزا نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو مکمل کر دیا۔

مہاتما بدھ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں نے محبت کی حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھا تھا مگر اخلاقیات کے جوش میں زندگی کی دوسری حقیقتوں کو نظر انداز کر گئے تھے۔ اپنے دشمنوں سے محبت کرنے کا اصول جس پر دونوں کے مذاہب میں بہت زور دیا گیا ہے اُس پر چند بزرگ اپنی ذاتی زندگی میں تو عمل کر سکتے تھے مگر اس اصول پر قومی زندگی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ جاپانی بدھ مت کے پیرو تھے مگر ''جاپان اور روس کی جنگ کے نتائج بہت مختلف ہوتے اگر جاپانیوں نے اس جنگ میں اپنے مذہبی اصولوں پر عمل کیا ہوتا،'' اقبال نے لکھا۔یورپ کی ذہنی تاریخ میں عیسائیت کی اہمیت صرف اس قدر تھی کہ غم کے بغیر زندگی کی مکمل تصویر سامنے نہیں آتی اور یونانی تہذیب کا خواب دلفریب ہونے کے باوجود غم کی اہمیت سے ناواقف تھا۔عیسائیت نے یہ کمی پوری کر دی۔

عیسائیت کی طرح اسلام کو بھی بت پرستی سے واسطہ پڑا مگر جہاں عیسائیت نے بت پرستی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا، اسلام نے اپنی خالص توحید برقرار رکھی۔اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ مذہب مختلف ملکوں کے لوگوں کو ملا کر ایک ایسی قوم بنا دیتا تھا

جس میں رنگ اور نسل کا فرق باقی نہیں رہتا تھا۔[100]

165

اورنگزیب پر نظم لکھنے کی خواہش شاید ابھی تک دل میں تھی۔

''اورنگزیب کی سیاسی ذہانت بڑی مکمل تھی،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''اُس کی زندگی کا شاید واحد مقصد ہی یہ تھا کہ اِس ملک میں بسنے والی مختلف اقوام کو ایک آفاقی سلطنت میں ضم کر دے۔'' بدقسمتی سے مغل تاریخ اس قسم کے سیاسی عمل کے لیے رہنمائی نہیں کرتی تھی چنانچہ اورنگزیب یہ نہیں جانتا تھا کہ سیاسی ارتقا ایک سست عمل ہے جو کئی نسلوں میں جا کر مکمل ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی قوتِ بازو پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر کے ایک ایسی جدوجہد شروع کر دی جس کا انجام اس کی خواہش کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

انگریزوں کے پیشِ نظر بھی یہی مقصد تھا اور اُن کے پاس سیاسی تجربہ بھی تھا چنانچہ وہ کامیاب ہوئے مگر حیرت تھی کہ انگریز مورخ اورنگزیب پر تنقید کرتے تھے حالانکہ انگریزوں نے بھی ''اورنگزیب کے استعماری عزائم کی پیروی کی اور اپنے عمل سے اس کے سیاسی تصور کی تصدیق کی،'' اقبال نے لکھا۔

جس طرح لارڈ کرزن کو الزام دیا جاتا تھا کہ اُس کے تقسیمِ بنگال جیسے فیصلوں کے ردِ عمل میں ہندو قوم پرستی بڑھ گئی اُسی طرح اورنگزیب کو الزام دیا جاتا تھا کہ مرہٹہ طاقت اُس کے اسلامی اقدامات کے ردِ عمل میں سامنے آئی (اگرچہ اقبال کے خیال میں اورنگزیب کے اقدامات کی نوعیت مذہبی نہیں بلکہ ثقافتی اور سیاسی تھی)۔

اقبال سمجھتے تھے کہ مرہٹوں نے مغل سلطنت کو جو نقصان پہنچایا اس کی ذمہ داری اکبر پر عائد ہوتی ہے جو یہ بات سمجھنے میں ناکام رہا تھا کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت رعایا کی رضامندی نہیں بلکہ حکمراں طبقے کی فوجی قوت کی وجہ سے قائم ہے۔ اسی طرح انگریزوں میں سے پچھلی صدی کے وائسرائے لارڈ رپن یہ بات بھول گئے تھے۔

اُنہوں نے کانگریس کے قیام کی حوصلہ افزائی کر کے ہندوستانیوں کو ملکی سیاست میں شریک ہونے کا خواب دکھایا جس کا خمیازہ لارڈ کرزن کو بھگتنا پڑا۔

قوموں کی آزادی اور غلامی کو اقبال حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ حکمراں قومیں محکوم قوموں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں مگر تہذیب اور طاقت میں پیچھے رہ جانے والی قوموں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم کی محکومیت کے تلخ تجربے سے گزر کر دوبارہ زندگی میں آگے بڑھنے کے قابل ہوسکیں۔ میکسیکن بھی اسپینیوں کی سخت گیری جھیلنے کے بعد ہی اپنے حالات کو خود سنبھالنے کے قابل ہوئے تھے۔

تاہم تاریخ سے سبق لینے میں احتیاط کی ضرورت تھی۔ تاریخ صرف انسانی نیتوں کی تشریح تھی اور چونکہ ہمیں اپنے زمانے کے لوگوں بلکہ اپنے قریبی دوستوں اور روزانہ زندگی میں ملنے والوں کے اصل ارادوں کے بارے بھی غلطی لگ سکتی تھی لہٰذا صدیوں پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی نیتوں کا اندازہ لگانے میں تو زیادہ غلطی ہوسکتی تھی۔[۱۰]

166

مسلمانوں کی تاریخ میں خوبیاں نظر آتی تھیں۔ پہلے دن سے لے کر سولہویں صدی تک یعنی تقریباً ایک ہزار برس یہ قوم جنگ وجدل میں اور سلطنت کی تعمیر میں مصروف رہی مگر ان ہنگاموں میں بھی اسے یہ ہوش رہا کہ قدیم علمی خزانوں کو دریافت کر کے محفوظ کرے، اُن میں اضافہ کرے، ایک اچھوتے ادب کی تخلیق کرے اور سب سے بڑھ کر ایک مکمل نظامِ قانون مرتب کرے جو اقبال کے خیال میں اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی ورثہ تھا۔

اسلامی تہذیب کسی ایک ملک یا نسل کی تخلیق نہیں تھی۔ ''اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ تاریخِ اسلام کا سب سے اہم واقعہ کون سا ہے تو میں فوراً کہوں گا، ایران کی فتح!'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایران کی وجہ سے سخت کوش عربوں کو

ایرانی نفاست اور نرمی میسر آ گئی چنانچہ اسلامی تہذیب میں اِن دونوں عناصر کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔[۱۰۲]

167

اسلامی تہذیب میں ہندی مسلمانوں کا حصہ مرزا غالب کی فارسی شاعری تک محدود تھا جن کا تخیل اور ذہانت علاقائی حدود سے بلند تھی۔ ابھی تک اُن کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا تھا۔

''مجھے اعتراف ہے کہ مجھ پر ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ کا بہت بڑا قرض ہے،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں تحریر کیا۔ ''اِن میں سے پہلے دو نے چیزوں کے باطن تک میری رہنمائی کی۔ تیسرے اور چوتھے نے یہ سکھایا کہ باہر کی شاعری کے نصب العین کو جذب کرنے کے بعد بھی میں کس طرح اپنی روح اور اظہار کو مشرقی رکھ سکتا ہوں۔ آخری نے میرے طالبِ علمی کے زمانے میں مجھے الحاد سے بچایا۔''[۱۰۳]

168

کالج کے کچھ طلبہ سے انگریزی اور فارسی کے شاعروں پر گفتگو ہوئی۔

''زندگی کی سب سے گہری سچائیوں کو معمولی کہانیوں میں بیان کرنے کے لیے غیر معمولی جینیس کی ضرورت ہے،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''انسانی تاریخ میں شیکسپیئر، مولانا روم اور یسوع مسیح کے سوا شاید اِس قسم کے جینئس کی کوئی اور مثال موجود نہیں۔''[۱۰۴]

شاید اُسی دن شاعری والی بیاض میں 'شیکسپیئر' کا عنوان ڈال کر لکھا:

شاہدِ مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ

برگِ گل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار
جوہرِ گل کے لیے ماہِ تمام آئینہ

جس طرح شراب پینے والے کو جام میں، صبح کے رنگوں کو دریا کی روانی میں، اور پھول کی پتی میں بہار کے موسم کو اپنا حسن دکھائی دیتا ہے اُسی طرح دل کو شیکسپیئر کے کلام میں وہ حسن دکھائی دیتا ہے جو فطرت کی سچائی ہے۔

مصرعوں کی بندش بدلنے کی ضرورت پیش آئی:

شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیِ شام آئینہ
برگِ گل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار
شاہدِ مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حُسن
واسطے دل کے ترا حُسنِ کلام آئینہ

تراش خراش سے نظم سنور رہی تھی مگر کسی وجہ سے یہ بہت مدّت کے لیے ادھوری چھوڑ دی گئی۔ ممکن ہے اِس کی وجہ یہ ہو کہ کالج کے زمانے کے دوست فضلِ حسین کے والد میاں حسین بخش فوت ہو گئے اور اقبال اُن کی تعزیت میں ایک نظم لکھنے لگے۔۱۰۵

169

نظم دھیمے اور گمبھیر لہجے میں شروع ہوئی جیسے کسی کا جنازہ جا رہا ہو۔

مگر پھر آہستہ آہستہ موت کی وادی میں زندگی کے پھول کھلنے لگے، پہاڑ کی بلندیوں سے حدی گاتی ہوئی آئی اور آخر زندہ دل شاعر نے موت سے اور شاید اپنے اندر چھپی ہوئی مایوسی سے بھی یہ کہہ کر انتقام لے لیا کہ مرنے والے کبھی ہم سے جدا نہیں ہوتے یہاں تک کہ جب زندگی میں ایسے اندھیرے چھا جائیں جنہیں دُور کرنا زندہ دوستوں

کے بس میں نہ ہوتو مرنے والے شاید جسم کی قید سے آزاد ہونے کی وجہ سے ہمیں روشنی دکھانے کی قدرت رکھتے ہیں۔

موت زندگی کی طاقت کم کرنے کی بجائے امکانات میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔

170

نظم میں سات بند تھے جن کی خوب تراش خراش ہوئی۔عنوان پہلے دفضل حسین کے نام' رکھا مگر پھر اسے کاٹ کر فلسفۂ غم' لکھ دیا۔ اڈونس کے مقابلے میں یہ نظم بہت سادہ تھی۔ شیلے کو ایک شاندار منظر کشی کے ذریعے کیٹس کی عظمت ظاہر کرنی تھی مگر اقبال کو کچھ فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرنا تھا یعنی غم کے بغیر زندگی کا تجربہ مکمل نہیں ہوتا اور موت کے بعد زندگی بھی ممکن ہے۔ایک طرح سے یہ نظم اُس بحث کا تسلسل تھی جو کئی برس پہلے کیمبرج میں اقبال اور میک ٹیگرٹ کے درمیان شروع ہوئی تھی۔[۱۰۶]

شیلے نے اپنی نظم سے پہلے جو افلاطونی شعر اور اُسی خیال کا آخری بند لکھا تھا اُس کا اثر بھی نظر آتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کے بچھڑنے والے مُردوں کی دنیا میں روشنی پہنچانے کی بجائے بدستور زندوں پر چمکتے رہتے تھے۔

اِس کے علاوہ اقبال نے کچھ عرصہ پہلے کالج میں اڈونس پڑھاتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق اس سے ملتے جلتے خیالات کے اشعار مشرق کے قدیم شاعروں کے یہاں سے بھی اکٹھے کیے ہوں گے۔ چنانچہ اُن کا اثر بھی اقبال کی نظم میں ضرور آیا ہوگا۔

بہر حال نظم میں ایک نیا رنگ جھلک رہا تھا جو خاص اقبال کا رنگ تھا۔[۱۰۷]

فلسفۂ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹرایٹ لاء لاہور کے نام)

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی

اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موجِ غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی
ہے 'الم' کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں
آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے
دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے
شام جس کی آشنائے نالۂ 'یا رب' نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بیخبر ہے ہجر کے آزار سے
گو بظاہر تلخیِ دوراں سے آرامیدہ ہے
زندگی کا راز اُس کی آنکھ سے پوشیدہ ہے
اے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے
ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
ظلمتِ ہستی میں یہ سورج سدا تابندہ ہے
رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے، مگر جاتا نہیں
ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی
آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی، اُس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اِس اُفتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر، ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جُو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
پستیِ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر
وادئ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اُس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

یہودی تعداد میں کم تھے اور مدت سے اُنہیں حکومت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی مگر

انسانی تہذیب کے ارتقاٗ میں اُنہوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ''راست بازی کے تصور میں کاروباری اخلاقیات کے جو اُصول موجود ہیں اُنہیں سب سے پہلے شاید یہودیوں ہی نے بنایا تھا،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔[۱۰۹]

172

اٹلی کے ہیرو مزینی کا اصل میدان سیاست نہیں بلکہ شاعری تھا۔ ''اُس کے سیاست میں آنے کی وجہ سے دنیا میں جو کمی رہ گئی وہ اٹلی کے فائدے کے مقابلے میں بہت کم ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔[۱۰۹]

173

انسانی سوچ کے ارتقاٗ کو معاشرتی اور سیاسی حالات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، یہاں تک کہ اُس زمانے کی سیاست میں فرد کی آزادی کا جو تصور رائج ہو رہا تھا اُس کا اثر بھی سائنس میں دیکھا جا سکتا تھا جو کائنات کو زندہ ایٹموں کی جمہوریت کے طور پر دیکھتی نظر آتی تھی۔

سائنس نے غیر مادّی چیزوں سے بیزاری کا رویہ اختیار کیا تھا مگر دلچسپ بات یہ تھی کہ سائنس کو مادے کا صحیح تصور سب سے پہلے ایک مابعدالطبیعاتی فلسفی ہی نے دیا تھا۔ یہ لیبنیز تھا جس نے مادے کو مزاحمت کی طاقت قرار دیا تھا۔ سائنسی طریقہ کار خود اس فلسفیانہ تعریف تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اقبال چیزوں کی تہ میں اُتر کر دیکھ رہے تھے۔ لگتا ہے کہ روایتی علم کی بنائی ہوئی بہت سی سرحدیں اُن کے ذہن میں معدوم ہو گئی تھیں۔ ''ایک انگریز نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ اُسے یہودیوں سے نفرت ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کی پسندیدہ قوم سمجھتے ہیں جس میں دوسری قوموں کے لیے حقارت کا رویہ ظاہر ہوتا ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''اُسے یہ بات یاد نہ رہی کہ وائٹ مینز برڈن کی ترکیب اسی یہودی عقیدے کی

ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔''

اِسی طرح اقبال کا خیال تھا کہ اٹھارہویں صدی کے انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے ہندوستان میں جو لوٹ مار مچائی تھی اُس کی سمجھ اُس وقت آتی ہے جب سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی یورپی کرنسیوں کا مطالعہ کیا جائے۔ فطرت کا اصول یہی تھا کہ دولت گردش میں رہے چنانچہ جب کسی خاندان میں دولت جمع ہو جاتی ہے تو دوسری تیسری پشت میں کوئی فضول خرچ جانشین پیدا ہو کر اُس دولت کو بکھیر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی قوم بہت سی دولت جمع کر کے اُس پر بیٹھ جاتی ہے تو فطرت کسی لٹیرے گروہ کو بھیج دیتی ہے جن کے ذریعے دولت منتشر ہو جاتی ہے اور یوں دنیا کی صنعت چلتی رہتی ہے۔

وارن ہیسٹنگز، کلائیو اور محمود غزنوی ایسی ہی اقوام کے نمائندے تھے۔"[۰]

174

''قومیں مرجاتی ہیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''اُن کی اولاد یعنی خیالات کبھی نہیں مرتے۔''[۱۱]

175

گرمیوں کی رات تھی اور اقبال چھت پر سونے کے لیے لیٹے ہوئے تھے۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ اشعار موزوں ہو گئے مگر علی بخش کو جگا کر بیاض منگوانے کی بجائے خود ہی لالٹین اٹھائی اور نچلی منزل میں دفتر کے کمرے میں جو انارکلی بازار کے رُخ تھا جا کر اشعار قلم بند کر لیے۔

واپس جانے کے لیے پلٹے تو دیکھا کہ کمرے میں ایک دراز قد سفید داڑھی والے بزرگ سفید لباس پہنے کھڑے ہیں۔ اقبال کو تعجب ہوا کیونکہ گھر کے سارے دروازے بند تھے۔ بزرگ سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کیسے آئے ہیں تو انہوں نے جواب دیا،

میں یہ کہنے آیا ہوں کہ تم پانچ سو آدمی تیار کرو، پانچ سو آدمی تیار کرو۔

یہ کہتے ہوئے وہ بزرگ نظروں سے غائب ہو گئے۔

اگلی صبح اقبال کی آنکھ کھلی تو رات کا واقعہ ذہن میں آیا۔ وہ اِسے خواب سمجھے مگر جب نچلی منزل پر پہنچے تو رات کے لکھے ہوئے اشعار موجود پائے۔ قریب ہی لالٹین رکھنے کا نشان بھی ابھرا ہوا تھا![۱۱۲]

176

شکریہ اور گورستانِ شاہی مخزن جون ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئیں۔ اقبال کے تعارفی نوٹ بھی شامل تھے۔

177

اُسی مہینے اقبال کے سابقہ منشی سلطان علی کسی فوجداری مقدمے میں پھنس گئے اور اقبال سے درخواست کی کہ ہوشیار پور کے بیرسٹر شیخ عبدالعزیز سے مدد کروا دیں۔

۱۲ جون کو اقبال نے ایک تعارفی رقعہ لکھ کر سلطان علی کے حوالے کر دیا۔

178

ملٹن کی خشک مذہبیت اقبال کے زمانے کی نسل کے تخیل کو متاثر نہیں کر سکتی تھی اور والٹیر نے سچ کہا تھا کہ ملٹن کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں ہو گی کیونکہ کوئی اُسے پڑھتا ہی نہیں ہے۔ مگر اقبال کا خیال تھا کہ کسی شاعر نے اپنے ہنر کے بارے میں ملٹن سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا چنانچہ اُس کا حسنِ بیان جھوٹے خداؤں کے لیے بنایا ہوا عالیشان مندر ہے جو وقت کے بے رحم ہاتھوں سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔[۱۱۳]

179

آسکر وائلڈ کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ اُس کی روح انگریز سے زیادہ ایرانی

تھی۔[114]

180

''انسان کی یادداشت کمزور واقع ہوئی ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''سوائے اُن برائیوں کو یاد رکھنے میں جو دوسروں نے اُس کے ساتھ کی ہوں۔''[115]

181

گرمیوں کی تعطیلات میں اقبال سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ رات کو جب اعجاز احمد، میاں جی (شیخ نور محمد) کا بدن دبا رہے تھے تو اقبال بھی سونے کے لیے لیٹے اور میاں جی سے اُس پراسرار بزرگ والے واقعے کا ذکر کر کے اُن سے اس کا مطلب پوچھا۔
میاں جی نے جواب دیا کہ اقبال پانچ سو آدمی تیار نہیں کر سکتے مگر انہیں چاہیے کہ آدمی بنانے والی پانچ سو اشعار کی کتاب لکھ دیں۔[116]

182

''مشرقی ممالک میں تفریحات موجود نہیں ہیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''نہ تھیٹر، نہ میوزک ہال، نہ کانسرٹ اور یہ اچھا ہی ہے۔'' ایک دفعہ تفریحات کی لت لگ جائے تو وہ ختم ہونے میں نہیں آتی جیسا کہ یورپی زندگی کا تلخ تجربہ بتاتا تھا۔
مسلمان معاشرے میں لوگ اپنے اپنے گھروں میں چپ چاپ تفریح حاصل کر لیتے تھے۔[117]

183

امام بی بی اقبال کی دوسری شادی کی اجازت دے چکی تھیں مگر شیخ نور محمد تیار نہ تھے۔
''ایک دن میاں جی (شیخ نور محمد) اور بھائی صاحب (اقبال) میں کچھ علمی گفتگو ہو رہی تھی،'' اقبال کی بہن کریم بی بی کا بیان ہے۔ ''بھائی صاحب نے میاں جی سے

دریافت کیا کہ قرآن کریم کی آیت ھو الذی خلقکم مّن نفس واحدة وّ جعل منھا زوجھا لیسکن الیھا میں "نفس واحدة" سے کیا مراد ہے؟ میاں جی سمجھ گئے کہ بھائی صاحب نفس واحدة کا مطلب نہیں پوچھ رہے بلکہ اپنی بے سکون زندگی کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔"

شیخ نور محمد نے اُس روز کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے۔ دوسرے دن امام بی بی سے پوچھا، اقبال کے لیے کوئی رشتہ تلاش کیا؟[۱۱۸]

184

اقبال کی بڑی بہن طالع بی بی کی وفات کے بعد اُن کے شوہر شیخ غلام محمد نے میاں جی اور بے جی کی اجازت سے دوسری شادی کی تھی اور بدستور میاں جی کے ٹوپیوں کے کاروبار کی نگرانی کرتے تھے۔ بڑے لڑکے نور احمد اپنی پسند کی دلہن لائے تھے مگر دوسرے لڑکے خورشید احمد جن کی عمر اب بیس برس ہو چکی تھی اُن کی شادی اس برس غلام محمد نے اپنی پسند سے برادری ہی میں حکیم پروفیسر جمشید علی کے بڑے بھائی کی لڑکی مہتاب بی بی کے ساتھ کروائی۔[۱۱۹]

185

انجمن حمایت اسلام کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے جو بورڈ بنایا گیا تھا اس نے اپنا فیصلہ دے دیا۔ مجلس عاملہ کو توڑ کر انجمن کا سارا انتظام ایک جنرل کونسل اور نو ماتحت کمیٹیوں کے سپرد ہونا تجویز پایا تھا۔ جنرل کونسل کی ہیئت میں بھی تبدیلیاں کر کے اسے مزید جمہوری بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

مولوی انشاء اللہ خاں نے اپنے مقدمات واپس لے لیے اور ۱۹ جولائی کو یہ فیصلہ پیسہ اخبار میں شائع ہو گیا۔[۱۲۰]

186

جولائی ۱۹۱۰ء کے مخزن میں 'فلسفۂ غم' شائع ہوئی۔ تعارفی نوٹ میں اقبال نے لکھا تھا کہ اگرچہ نظم ذاتی نوعیت کی ہے مگر اس لیے شائع کی جا رہی ہے تا کہ میاں فضل حسین کے تمام احباب تک پہنچ جائے۔

فضل حسین کے چھوٹے بھائی افضل حسین جو کالج میں اقبال سے شاعری پڑھ رہے تھے وہ اقبال کی نظم کا موازنہ شیلے کی اڈونس سے کیے بغیر نہ رہ سکے!

187

میاں فضل حسین شاید ابھی تمام سرگرمیاں دوبارہ شروع نہیں کر سکے تھے کیونکہ ۲۶ جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کے اجلاس میں، جس کے وہ سیکرٹری تھے، شریک نہ ہو سکے اور اقبال کو سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

188

بھوپال میں ۱۸ اگست کو غالب کی غزل پر طرحی مشاعرہ ہو رہا تھا۔ کسی نے اقبال سے بھی فرمائش کی اور انہوں نے غالب کی غزل پر تین شعر لکھ کر بھجوا دیے:[۱۴۱]

حلقہ زنجیر کا ہر جوہر پنہاں نکلا
آئینہ قیس کی تصویر کا خنداں نکلا
ہم گراں جان کر لائے تھے عدم سے بلبل
باغ ہستی میں متاع نفس ارزاں نکلا
وسعت افزائی آشفتگی شوق نہ پوچھ
خاک کی مٹھی میں پوشیدہ بیاباں نکلا

189

قوموں کی تقدیر افراد کے کردار سے وابستہ تھی مگر کردار کیا تھی؟

اقبال سمجھتے تھے کہ کردار ایک طرح کی توانائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقلیتوں نے اکثر تاریخ کے دھارے کا رُخ متعین کیا ہے کیونکہ دوسری توانائیوں کی طرح کردار بھی اگر زیادہ لوگوں میں تقسیم ہو جائے تو کمزور پڑ جاتا ہے۔

کسی نظریے کی کامیابی بھی اُسے پیش کرنے والے کے کردار کی قوت پر منحصر تھی۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ تینوں دنیا میں مساوات کا سبق لے کر آئے تھے مگر صرف دینِ محمدی ہی ابھی تک اس اصول کے لیے سرگرم تھا۔

تعلیم کا مقصد بھی دانشوری کی بجائے کردار کی تعمیر ہونا چاہیے۔ دنیا کا قانون جدوجہد ہے اور تعلیم کے ذریعے افراد کو جدوجہد کے لیے تیار کرنا چاہیے۔[۱۴۲]

190

فرانسیسی مستشرق رینان نے بڑے شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا مگر اصل میں بہت مذہبی آدمی تھا۔

''کسی کی سوچ سے اُس کے کردار کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔[۱۴۳]

191

دنیا میں کوئی شاعری عربوں کی شاعری سے زیادہ سیدھی، براہِ راست اور مردانگی سے بھرپور نہیں ہو سکتی تھی مثلاً حماسہ کے وہ اشعار جن کا انگریزی ترجمہ اقبال نے اپنی نوٹ بک میں درج کیا:

''وہ میرے چچا کا لڑکا چٹان کے کنارے پر جا رہا ہے۔ کیا میں اُس کے پیچھے جا کر اُسے سنگلاخ وادی میں دھکیل دوں کہ اُس کی زندگی میں کبھی دوبارہ سورج نہ نکلے؟ اُس کا سلوک اسی قابل ہے مگر یہ کمینگی ہے اور مردانگی سے دُور ہے۔''[۱۴۴]

192

مذہبی خیالات کے ارتقاء میں تین مراحل آتے ہیں۔ پہلا مرحلہ روایتی مذہب پر شکوک وشبہات کا ہوتا ہے جب عقل عقیدے کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے۔

دوسرے مرحلے میں ایک سماجی طاقت کے طور پر مذہب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ مذہب کی عقلی توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔

اس کے نتیجے میں ایسے اختلافات پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے قوم کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ تیسرا مرحلہ ہوتا ہے اور اقبال سمجھتے تھے کہ اُس زمانے میں ہندی مسلمان اسی مرحلے سے گزر رہے ہیں یا کسی حد تک پچھلے مرحلے میں ہیں اور کسی حد تک اس میں۔

اگر اختلافات خلوص پر مبنی نہ ہوں تو وہ مکمل تباہی کی طرف لے جاتے ہیں اور اقبال کا خیال تھا کہ عام طور پر اختلافات خلوص پر مبنی نہیں ہوتے۔

''خوش قسمتی سے کچھ اور قسم کی قوتیں بھی سرگرم ہیں جو قوم میں اتحاد برقرار رکھنے کی طرف مائل ہیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''اگرچہ مجھے ڈر ہے کہ ان کا اثر زیادہ عرصے نہ رہے گا۔''[۱۲۵]

193

کسی نے اکبر الہ آبادی سے اقبال کے ترانے پر رائے لی۔ اُنہوں نے کہا، ''اقبال جوان آدمی ہیں، سارا جہاں ہمارا کہہ گئے۔ میں بڑھاپے میں یہ ترنگ کہاں سے لاؤں!''

پھر کسی کو کاغذ پنسل سنبھالنے کا اشارہ کر کے مخاطب ہوئے:

کالج میں ہو چکا جب امتحاں ہمارا
سیکھا زباں سے کہنا ہندوستاں ہمارا

رتبے کو کم سمجھ کے اقبال بول اٹھے
ہندوستان کیا ہے، سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم
جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا[۱۴۶]

194

''خدا نے چیزیں بنائیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''انسان نے اُن کی قدر متعین کی۔ نیٹشے نے کہا تھا کہ کسی قوم کا ہمیشہ رہنا ہمیشہ نئی اقدار تخلیق کرتے رہنے پر منحصر ہے۔ چیزوں پر خدا کے کارخانے کی مہر ضرور لگی ہوتی ہے مگر اُن چیزوں کو معانی صرف اور صرف انسان دیتا ہے۔''[۱۴۷]

195

''طاقت سچائی سے زیادہ خدا کی طرح ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''خدا طاقت ہے۔ پس تم بھی اپنے باپ جیسے ہو جاؤ جو آسمانوں میں ہے۔''
طاقتور انسان اپنا ماحول خود بناتا ہے۔ کمزور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنا لیتا ہے۔[۱۴۸]

196

ہزارہ کے قصبے پکھلی میں کوئی انجمن اسلامیہ تھی جس کے آنریری سیکرٹری گوہر علی خاں کو خیال آیا کہ عالمگیر اسلامی کانفرنس کے بارے میں مسلمان مشاہیر سے دریافت کیا جائے کہ کیا ایسی کانفرنس میں مسلمانوں کی شرکت مناسب ہے یا نہیں۔ اُنہوں نے اقبال کو بھی خط لکھا، پیسہ اخبار ۳۱ جولائی کی اپنی تحریر یاد دلائی جس میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ اقبال اپنی قوم کی خدمت کریں گے اور ساتھ ہی یہ شکایت کی اب وہ بیرسٹری کو

پیارے ہوگئے ہیں اور قومی خدمت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

۲۲ اگست کو اقبال نے اپنے جواب میں لکھا، ''کوئی شخص جو اپنی زندگی میں ناکام رہے اوروں کے کام نہیں آسکتا تاہم ان نامساعد حالات میں بھی جو کچھ مجھ سے ہو ہے میں نے دریغ نہیں کیا۔ قومی خدمت کوئی آسان بات نہیں، افسوس ہے کہ آپ کو تمام حالات معلوم نہیں۔ کئی لوگوں نے ایسے ہی اعتراضات مجھ پر اور بعض لوگوں پر بھی کیے ہیں لیکن میں نے ان احباب کو معذور سمجھ کر کوئی جواب نہیں دیا۔''

مصر میں عالمگیر کانفرنس کی تجویز کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ ایسی کانفرنس کا منعقد ہونا ہی دشوار ہے کیونکہ اسلامی ممالک اپنے اپنے سیاسی انقلابات میں اُلجھے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ کانفرنس ہو ہی جائے تو اسے سیاست سے بالکل علیحدہ رکھا جائے اور ''اس کی تجاویز مسلمانوں کی سوشل اور مذہبی اصلاح تک محدود ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ دنیا کی گورنمنٹیں ضرور اسے بدظنی کی نگاہ سے دیکھیں گی۔''

معلوم ہوتا ہے کہ دو سال پہلے جو تجویز خود اقبال کے ذہن میں آئی تھی اب وہ اُس کی افادیت کے قائل نہیں رہے تھے۔ ''جو مقصد اس قسم کی کانفرنس سے پورا ہو وہ مکہ معظمہ کی سالانہ کانفرنس سے ہو سکتا ہے،'' انہوں نے لکھا تھا۔ ''افسوس ہے مسلمان اس سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ وقت قریب ہے جب مسلمان اس رمز سے آگاہ ہوں گے جو فریضۂ حج میں مختص ہے۔''

اقبال کے خیال میں پان اسلام ازم فرانسیسی صحافیوں کی وضع کی ہوئی اصطلاح تھی جو حقیقت سے ناواقف تھے۔ ''مسلمانانِ عالم کی کسی ملک میں کوئی ایسی تحریک عام طور پر نہیں ہے جس کا منشا یورپ سے پولیٹکل مقابلہ کرنا ہو نہ ایسا خیال ایک ایسی قوم میں پیدا ہو سکتا ہے،'' اقبال نے اپنے اِسی خط میں لکھا تھا، ''مسلمانوں کو کلامِ الٰہی میں امن اور صلح کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ پوشیدہ طور پر مشورہ کرنے کی بھی ممانعت ہے۔'' آخر میں انہوں نے عربی میں وہ آیت لکھی جس کا ترجمہ

یہ ہے کہ ''اے ایمان والو، جب تم سرگوشیاں کرو تو گناہ اور ظلم کے لیے سرگوشیاں نہ کیا کرو۔''

نواب وقارُالملک، شبلی نعمانی، میاں محمد شفیع اور مولوی محمد عزیز مرزا نے بھی اس کانفرنس میں شرکت سے گریز کرنے کی صلاح دی تھی۔ گوہر علی خاں نے ان خطوط کو اس وقت شائع کروانا مناسب نہ سمجھا۔

اقبال کے ذہن میں تو یہ خیالات گردش کر رہے تھے کہ قومی زندگی میں طاقت اور بیخوفی سب سے اہم اقدار ہیں مگر عملی اقدامات کے لیے مسلمانوں کو اِس قسم کی رائے دینا اجتماعی خودکشی کی دعوت دینے کے برابر تھا۔ اِس پس منظر میں اُن کی نظم 'شکوہ' کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جو بہت جلد اُن کے قلم سے نکلنے والی تھی اور جس میں خدا سے شکایت کی گئی تھی کہ مسلمان سیاسی قوت سے محروم کیوں ہیں۔

197

۲۶ اگست کو امریکہ کی ریاست نیو ہیمپ شائر میں ولیم جیمز کا انتقال ہوگیا۔

198

بی ایس سی کے طلبہ مضمون نویسی کے لیے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔ افضل حسین کا گروپ اقبال کے سپرد تھا۔

پرانے اور گھسے پٹے موضوعات پر سبھی لکھتے ہیں، اقبال نے کہا۔ نئے اور اچھوتے موضوعات پر بحث کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے۔ اُنہوں نے گروپ کو مشورہ دیا کہ وہ باطل کے دفاع میں مضمون لکھے۔[۱۲۹]

199

''طاقت جھوٹ کو چھوتی ہے اور دیکھو وہ سچائی میں بدل جاتا ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں درج کیا۔ تہذیب طاقتور انسان کے تخیل کا نام تھی۔

''مہدی کا انتظار کرنا چھوڑو،'' اقبال نے لکھا۔ ''جاؤ اُسے تخلیق کر لو۔''[۱۳۰]

200

قومیت کا تصور اپنی جگہ مفید تھا۔ ''مگر یہ حد سے بڑھ جائے تو ادب اور فن کو وسیع انسانی پہلوؤں سے محروم کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔[۱۳۱]

201

کانٹ نے کہا تھا، ''اس طرح عمل کرو کہ تمہارے عمل سے ایسا سبق نکل سکے جسے تمہاری مرضی سے ہر جگہ اپنایا جا سکے۔'' اس تصور کو categorical imperative کہتے تھے۔ اقبال کے خیال میں جرمن قوم کی تاریخ اس کی وضاحت کرتی ہے۔ افراد اپنے آپ پر قابو رکھنا سیکھ لیں تو خاندان بنتا ہے۔ قومیں خود پر قابو رکھنا سیکھیں تو سلطنت تعمیر ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں سیاسی زندگی کا آغاز حقوق مانگنے سے نہیں بلکہ فرائض ادا کرنے سے ہوتا ہے۔

عمل کے بغیر سوچ بیچار موت ہے کیونکہ شاعری اور مصوری کی طرح زندگی بھی اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی میں کامیابی ذہانت سے نہیں بلکہ مضبوط ارادے سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنی حدود کو سمجھو، اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لو اور زندگی میں تمہاری کامیابی یقینی ہے!

مگر جس طرح پودے رقص نہیں کر سکتے اسی طرح سست ذہن بھی اپنے آپ کو وقت کی تال کے ساتھ ہم آہنگ کرنا نہیں جانتا۔[۱۳۲]

202

جس طرح بیمار جسم اپنے آپ کو دوبارہ صحتمند کرنے کی صلاحیت سے کام لے کر

دوبارہ تندرست کر لیتا ہے اُسی طرح کبھی کبھی ایک بیمار قوم بھی اپنے آپ میں ایسی قوتیں پیدا کر لیتی تھی جو اُسے دوبارہ طاقتور بنا دیں۔ ''مثال کے طور پر کسی عظیم شخصیت کا نمودار ہونا جو ایک نئے مقصد کو سامنے لا کر مرتے ہوئے وجود کو واپس زندگی کی طرف لے جائے؛'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔

نوٹ بک کے ایک اور صفحے پر اُنہوں نے لکھا، ''کردار اور صحت مند تخیل کی مدد سے اس گناہوں اور دُکھوں کی دنیا کو سچ مچ کی جنت بنانا ممکن ہے۔''[۱۳۳]

203

میاں اسلم نے اقبال سے ذکر کیا کہ نثر میں افسانے اور ناول ہی لکھے جا سکتے ہیں اور یہ اکثر بے مقصد ہوتے ہیں، اس الجھن کا کیا کیا جائے؟

اقبال نے کہا، ''تم افسانہ لکھو یا ناول، وہ بے مقصد نہیں ہونا چاہیے۔''[۱۳۴]

204

اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں جو کلام پڑھا تھا وہ بازار میں کتابچوں کی صورت میں ملتا تھا۔ انہوں نے اپنے بعض طلبہ کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا کہ مرزا جلال الدین کی کوٹھی پر دس بارہ مخصوص طلبہ کو جمع کرتے اور ان کے سامنے اپنے اُس کلام کی تشریح کرتے جو کتابچوں کی صورت میں دستیاب تھا۔[۱۳۵]

205

''ریاضی دان infinity کو ایک line میں نہیں سمو سکتا مگر شاعر ایسا کر سکتا ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''شاعر وہ راز بے نقاب کر دیتا ہے جنہیں رُوحِ کائنات ہم سے چھپاتی ہے۔''

کائنات ایک بہت بڑے استعارے کے سوا کچھ نہیں۔ روحِ کائنات اپنی اندرونی

زندگی کی کہانی کو اشاروں میں چھپاتی ہے مگر وہ ہمیں اِن اشاروں کا مطلب سمجھانے کی زحمت نہیں کرتی۔ یہ کام شاعر کرتا ہے۔

شاعر کا کام فطرت کی تقلید کرنا نہیں ہے۔ اُس کا کام فطرت کو بے نقاب کرنا ہے۔[۱۲۶]

206

ایک مہینے بعد انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب نے، جو خود بھی اقبال کا قدردان تھا، اُن سے کہا کہ اُن کی محفلِ خاص میں دو چار اُس کے مخبر بھی ہیں تو اقبال نے اپنے کلام کی تشریح کا سلسلہ بند کر دیا۔[۱۲۷]

207

رات نے شاعر سے پوچھا کہ سب نیند کی آغوش میں ہیں پھر وہ کیوں رات کے جادو سے آزاد ہے؟

اُس نے جواب دیا، دن میں جو آنسو دوسروں کے سامنے رُکے رہتے ہیں وہ اندھیرے اور تنہائی میں گویا چاند کی کھیتی میں بوئے جاتے ہیں۔ یہ آنسو اس دُکھ کے ہیں کہ وہ جلوہ جسے دیکھنے کے لیے طور پر موسیٰ بیتاب ہو گئے تھے وہ میرے دل میں مچل رہا ہے مگر کوئی نہیں جو اسے دیکھنے کا شوق رکھتا ہو:

صفتِ شمع لحد مردہ ہے محفل میری
آہ، اے رات! بڑی دُور ہے منزل میری
عہدِ حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو
اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو
یہ دلِ مردہ کو تعلیمِ رضا دیتے ہیں
لُٹ کے غارت گرِ گلشن کو دُعا دیتے ہیں

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سُنا جاتا ہوں[۱۳۸]

208

''اگر آپ سیاسی لیڈر بننا چاہتے ہیں تو پبلک کی نازبرداری کرنا ضرور آتا ہو،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''بڑی بڑی باتوں سے اُسے خوش کریں اور اگر ضرورت پڑے تو جھوٹ سے بھی۔''

اقبال کو جمہوریت سے یہ شکایت تھی کہ جسے اکثریت درست قرار دے وہ نہ صرف قانونی طور پر جائز سمجھا جاتا تھا بلکہ اکثر اُسے اخلاقی طور پر بھی درست تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ مگر اُن کے خیال میں یورپی اقوام میں جو فتوحات کا شوق پرورش پا رہا تھا اُس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اب خود یورپ بھی جمہوریت سے بیزار ہے کیونکہ جمہوریت اور استعمار ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

اُنہیں کم سے کم فرانس اور انگلستان میں اِس بیزاری کے آثار ضرور نظر آتے تھے مگر اُن کا خیال تھا کہ اس کا مطالعہ صرف تاریخی واقعات کی روشنی میں نہیں کرنا چاہیے۔ اِس کا نفسیاتی مطالعہ بھی ہونا چاہیے۔[۱۳۹]

209

''اگر تمہارے پاس بہت بڑی لائبریری ہے اور تم اس کی تمام کتابوں سے واقف بھی ہو تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم امیر آدمی ہو، یہ نہیں کہ تم ضرور سوچنے والے بھی ہو۔ تمہاری بڑی لائبریری کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہاری جیب اِتنی بھاری ہے کہ تم اپنی جگہ دُوسروں کو سوچنے کے لیے اُجرت پر رکھ سکتے ہو۔''[۱۴۰]

210

کیا کبھی معجزے ہوئے تھے؟

تاریخی واقعات کا تجزیہ کر کے اس سوال کا کوئی بھی جواب دیا جا سکتا تھا مگر معجزے ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں اُن پر یقین رکھنا سماجی ارتقا کے لیے مفید تھا۔

معجزے پر یقین قدرت کی ایسی طاقتوں کا احساس دلاتا ہے جو مادّی دنیا سے پرے ہیں۔ اِس طرح یہ نہ صرف قدیم معاشروں کو یکجا رکھنے میں مدد دیتا تھا بلکہ آج بھی اسلام جیسے معاشروں کے لیے ضروری تھا جہاں قومیت کی بنیاد عقاید پر تھی۔[۱۴۱]

211

''اگلوں نے عظیم شخصیات پیدا کیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''ہم نیک قارئین پیدا کرتے ہیں۔''

اُن کے خیال میں کم سے کم ایک لحاظ سے گناہ، نیکی سے بہتر تھا۔ گناہ میں تخیل کا عنصر موجود تھا جس سے نیکی محروم تھی۔ گناہ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے چنانچہ اقبال کا خیال تھا کہ شاید اِسی لیے نیک لوگ اکثر نرے احمق ہوتے ہیں۔[۱۴۲]

212

مسلم یونیورسٹی کے لیے تحریک شروع ہوئی تو لاہور میں بھی وفد آنے لگے۔ اُس سال کے ایک وفد میں وہ مولوی صاحب بھی شامل تھے جنہیں اقبال نے کچھ برس پہلے لندن کی سیر کروائی تھی مگر معلوم نہیں دوبارہ ملاقات ہوئی یا نہیں۔[۱۴۳]

213

سیالکوٹ میں اقبال کے آبائی گھر کے سامنے والے بازار چوڑیگراں میں سبزی فروش سڑک کے دونوں طرف زمین پر بیٹھ کر سبزیاں بیچا کرتے تھے اور اگر شام کو کچھ

مال بچ رہتا تو وہ کسی کی دکان میں رکھوا جاتے تھے۔

سبزی فروشوں میں سیالکوٹ کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا ارائیں برادری کا بابا لوٹا بھی تھا جو اپنے ٹوکرے شیخ نور محمد کی دکان میں رکھوایا کرتا تھا۔ایک روز اعجاز احمد اور دوسرے لڑکوں نے اُس کے ایک ٹوکرے میں بیر رکھے پائے اور کچھ بیر نکال کر کھا لیے۔ بے جی یعنی امام بی بی کو خبر ہوئی تو اگرچہ بابا لوٹا کہتا ہی رہ گیا کہ بچوں نے کھا لیے تو کیا ہوا، انہوں نے سب کی پٹائی کر دی۔

میاں جی یعنی نور محمد کو بھی یہ بات معلوم ہوئی۔ اُس دن وہ خاموش رہے مگر اگلی صبح بازار سے بڑے عمدہ بیر خرید کر لائے، سب لڑکوں کو کھلائے اور پھر اُن سے پوچھا کہ یہ بیر اچھے ہیں یا وہ مردے کا گوشت جو کل کھایا تھا۔بات لڑکوں کی سمجھ میں نہ آئی تو کہا کہ بابا لوٹے کا سامان جو وہ ہمارے ہاں رکھ جاتا ہے، ہمارے پاس امانت ہوتا ہے۔قرآن کریم میں امانت میں خیانت نہ کرنے کا بار بار حکم آیا ہے۔امانت کا مال کھانا مُردے کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔کل والے بیر جو تم لوگوں نے کھائے تھے وہ مُردے کا گوشت تھا۔

''یہ سن کر میاں جی کے لائے ہوئے بیروں کا مزہ بھی جاتا رہا،'' اعجاز احمد کا بیان ہے۔ ''لیکن بابا لوٹے کا مال جو ہمارے ہاں رکھا جاتا تھا ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔''[۱۴۴]

214

اعجاز احمد اور آفتاب کو پڑھنے کی ترغیب دلانے کے لیے شیخ نور محمد کہا کرتے تھے، تم لوگ سپرو ہو اور یہ لفظ پہلے ''سب پڑھو'' تھا، لہٰذا تمہیں علم حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔[۱۴۵]

215

بیاض میں ایک نظم دعید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں' درج ہے جس میں کہا

گیا ہے کہ قوم کی تباہ حالت کی وجہ سے اقبال کو عید پر خوشی منانے کا جواز نظر نہیں آتا:

یہ شالامار میں اِک برگِ زرد کہتا تھا
گیا وہ موسمِ گُل جس کی یادگار ہوں میں[۱۴۶]

216

کچھ دن پہلے اخبار الحکم (قادیان) میں خبر چھپی تھی کہ کسی احمدی لڑکی کا نکاح ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا ہے۔ اقبال کے ملنے والوں کو خیال ہوا کہ اُنہوں نے کسی کو بتائے بغیر دوسری شادی کر لی ہے چنانچہ ۱۰ ستمبر کو اقبال نے پیسہ اخبار میں وضاحت بھیجی کہ "جن ڈاکٹر محمد اقبال کا ذکر ایڈیٹر صاحب 'الحکم' نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔"[۱۴۷]

217

۱۱ ستمبر کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں کالج کمیٹی کے سیکرٹری کے عہدے پر اقبال کی توثیق کی گئی۔ اس کے چار روز بعد کالج کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اُس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اسلامیہ کالج کے امور میں اچھی طرح چھان بین کی جائے اور اس کے لیے نو ارکان کی ایک کمیٹی بنائی جائے۔

218

۱۵ ستمبر کو پیسہ اخبار میں پانچ دن پہلے بھیجی ہوئی اقبال کی وضاحت "وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ہوں گے" کے عنوان سے شائع ہوئی۔[۱۴۸]

219

۲۲ ستمبر کو اقبال نے ایما کو خط لکھا، "مجھے آپ کا نوازش نامہ موصول ہو گیا ہے جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج ڈاک کا دن ہے مگر بدقسمتی سے میں بہت

مصروف ہوں۔ اگلے ہفتے میں آپ کو زیادہ طویل خط لکھوں گا، میرے خیال میں اُس وقت ممکن ہوگا۔''

اِس عبارت سے لگتا ہے جیسے اقبال ایما کو ہر ہفتے خط لکھتے ہوں۔ ایسا تھا تو چند ہی خطوط ہم تک پہنچے ہیں۔

اِس دفعہ کے خط کے ساتھ اقبال نے تبتی بھیڑ کی کھال کا تحفہ بھی ایما کو بھیجا۔ ''یہ دراصل اوورکوٹ کے کالر اور بازوؤں کے لیے ہے،'' انہوں نے لکھا۔ [۱۴۹]

220

۲۵ ستمبر کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل نے کالج کمیٹی کی تجویز کی منظوری دے دی۔ کالج کے معاملات میں تحقیق کے لیے جو کمیٹی بنی اُس میں اقبال کو بھی شامل کیا گیا۔ [۱۵۰]

221

اُس برس شبلی نعمانی کی شعر العجم کی تیسری جلد شائع ہوئی۔ اگر اقبال نے اس کا مطالعہ کیا تو اکبر کے دَور کے ایرانی شاعر عرفی شیرازی کے تذکرے نے ضرور اُن کی توجہ حاصل کی ہوگی جس کے بارے میں سب کچھ شاید اُنہیں پہلے ہی سے معلوم رہا ہو۔

222

فلسفہ انسانی عقل کی سردرات میں ٹھٹھرتے ہوئے مبہم اصولوں کا مجموعہ ہے۔ شاعر اُنہیں حرارت دے کر معروضی صورت میں لے آتا ہے۔ پیغمبر بھی باعمل شاعر ہی ہوتا ہے۔

''قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں،'' اقبال نے لکھا۔ ''وہ سیاست دانوں کے ہاتھوں پرورش پاتی اور مر جاتی ہیں۔'' [۱۵۱]

223

بیاض میں نظم لکھی، 'شاعر'۔ اس میں شاعر کو ایک بہتی ندی سے تشبیہہ دی جس کی وجہ سے قوم کی کھیتی سیراب ہوتی ہے۔[۱۵۲]

224

''بہت خوبصورت عورت جس میں اپنی ذات کا شعور بیدار نہ ہوا ہو میری نظر میں خدا کی زمین پر سب سے پیاری چیز ہے،'' اقبال نے اپنی نوٹ بک میں لکھا۔[۱۵۳]

225

سردار بیگم، منشی طاہرالدین کے دوست عبدالغنی کی بہن تھیں۔ یہ ایک غریب کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قالین بیچتے تھے۔ دونوں بہن بھائی بچپن ہی میں یتیم ہوکر دس بارہ سال پہلے لاہور آ گئے تھے جہاں ان کی پرورش اُن کی پھوپھی نے کی۔

پھوپھی صاحبہ کی پہلی شادی سیالکوٹ میں ہوئی تھی مگر شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے منشی گلاب دین نقشہ نویس سے شادی کر لی جن کی پہلی بیوی سے ایک بیٹی تھی اور جو موچی دروازے میں رہتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق وہ ضلع کچہری میں عرضی نویس تھے۔

سردار بیگم کبھی اسکول تو نہیں گئی تھیں مگر گھر پر قرآن مجید اور معمولی اُردو پڑھنے لکھنے کی تعلیم ضرور حاصل کی تھی۔ اُن کی عمر انیس برس کے قریب تھی۔

منشی گلاب دین کی پہلی بیوی سے جو لڑکی تھی اُس کی شادی نبی بخش وکیل سے ہوئی تھی۔ ''وہ ذرا رنگین طبیعت کا آدمی تھا،'' عبدالغنی کے ایک دوست شمس الدین کا بیان ہے۔ اُس نے کوشش کی کہ اُس کی دوسری شادی سردار بیگم سے ہو جائے مگر سردار بیگم کی پھوپھی صاحبہ نے پسند نہ کیا اور صاف انکار کر دیا۔[۱۵۴]

226

''لاہور میں ایک کلب پہلے سے موجود تھی، اُس میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا،'' مرزا جلال الدین کہتے ہیں۔ ''ہم نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی الگ کلب بنالیں، چنانچہ میکلوڈ روڈ پر ایک کوٹھی لی اور کلب بنالی۔ یہ بڑے اونچے پیمانے پر چلتی رہی۔ پہلے میاں شاہ دین اس کے صدر اور میاں شفیع اس کے سیکرٹری تھے، پھر [میاں شفیع] اس کے صدر بنے اور مجھے اس کا سیکرٹری بنایا گیا... میں اور ڈاکٹر اقبال روزانہ اس کلب میں جایا کرتے تھے۔''[۱۵۵]

227

لاہور میں کوئی پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس بنی تھی۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل عبدالعزیز اس کے سیکرٹری تھے مگر اب انہوں نے کسی وجہ سے استعفٰی دے دیا۔

میاں فضل حسین نے تجویز پیش کی کہ اقبال کو اُن کی جگہ لینی چاہیے چنانچہ ۲۳ اکتوبر کے اجلاس میں، جو میاں نظام الدین کی صدارت میں ہو رہا تھا، یہ تجویز منظور کی گئی۔ کانفرنس کے قواعد و ضوابط بنانے کا کام بھی اقبال اور نئے جوائنٹ سیکرٹری کے ذمے تھا جو اسلامیہ ہائی اسکول کے پرنسپل تھے۔[۱۵۶]

228

عامیانہ ذہن کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ عقاید سے اختلاف رکھنے کے باوجود نہ صرف اُنہیں برداشت کیا جا سکتا ہے بلکہ اُن کا ساتھ بھی دیا جا سکتا ہے۔

''اگر تم ایسا کرتے ہو تو خاموش رہو،'' اقبال نے نوٹ بک میں شاید اپنی یاددہانی کے لیے لکھا۔ ''اور کسی کو اپنی پوزیشن سمجھانے کی کوشش مت کرو۔''[۱۵۷]

229

اقبال نے میاں اسلم سے کہا، ''جو کچھ لکھو، قومی نقطۂ نظر سے لکھو۔''[۱۵۸]

230

میاں نظام الدین کو اپنے بیٹے کا افسانہ لکھنا پسند نہیں تھا۔ ایک دن اقبال اُن کے یہاں آئے تو میاں نظام الدین نے کہا کہ وہ اسلم کو افسانے وغیرہ لکھنے سے منع کر دیں۔ اقبال نے مسکرا کر جواب دیا، ''میں نے اسلم کو ہدایت کر دی ہے کہ جو کچھ لکھے کسی مقصد کے تحت لکھے۔ مقصد کے تحت لکھنا برا نہیں ہے۔''[۱۵۹]

231

امام بی بی جن لڑکیوں کی پرورش کرتی تھیں اُن میں سے کئی کی اب شادیاں ہو چکی تھیں مگر وہ اب بھی ملنے آیا کرتی تھیں جیسے اپنے میکے آتی ہوں۔

232

بابا لوٹا کی بیوی فوت ہوگئی۔ اُس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام حسن بی بی تھا اور عمر دس بارہ سال تھی۔ اُس کی پرورش کی دشواریوں کو سامنے رکھتے ہوئے امام بی بی نے حسن بی بی کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

امام بی بی کی ایک رشتہ دار لڑکی جو اُن کے گھر میں پرورش پا رہی تھی اور شکل صورت کی اچھی ہونے کی وجہ سے بھی اپنے آپ کو دوسری لڑکیوں سے برتر سمجھتی تھی، اُس نے ایک دن حسن بی بی کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانے سے انکار کر دیا۔ امام بی بی نے سنا تو اُنہوں نے حسن بی بی کو اپنے برتن میں کھلانا شروع کر دیا اور رشتہ دار لڑکی کو اکیلے کھانے کی ہدایت کی۔ دو چار دن بعد رشتہ دار لڑکی نے بھی امام بی بی کے ساتھ کھانے کی اجازت مانگی تو اُنہوں نے کہا کہ میں تو حسن بی بی کے ساتھ کھاتی ہوں، تمہیں اُس کے

ساتھ کھانے میں عار ہے تو میرے ساتھ کیسے کھاؤ گی۔

''اُس نے ندامت سے رونا شروع کر دیا،'' اعجاز احمد کا بیان ہے۔ ''بے جی (امام بی بی) نے اُسے گلے سے لگا کر کہا کہ حسن بی بی بھی ویسی ہی میری بیٹی ہے جیسی تم ہو اور صاف ستھری بھی تم سے کم نہیں، پھر تمہیں اُس کے ساتھ کھانے میں اعتراض کیوں ہو؟ دو چار دن اُس کے ساتھ کھانا کھالو، پھر میرے ساتھ بھی کھا لینا۔''

اُس دن سے رشتہ دار لڑکی کا گھمنڈ جاتا رہا اور وہ حسن بی بی کی پکی سہیلی بن گئی۔ [۱۶۰]

233

فقیر سید افتخار الدین سے اقبال کی دوستی کا آغاز ہو چکا تھا اور اُن دنوں وہ ہوشیار پور میں تھے۔

اقبال نے اپنے ہوشیار پور والے دوست بیرسٹر عبدالعزیز کو ۱۴ اکتوبر کو لکھا، ''اگر ممکن ہوا تو مجھے حاضر ہونے میں خوشی ہو گی۔ ہوشیار پور میں خود آپ کی ذات میں بڑی کشش ہے جس میں میرے دوست ایف ایس افتخار الدین کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔''

اُن کا ارادہ تھا کہ وہ مہینے کے آخر میں ہوشیار پور جائیں گے کیونکہ ایک طویل ویک اینڈ کی توقع تھی مگر ۲۸ اکتوبر کو معلوم ہوا کہ پیر کی چھٹی نہیں مل رہی۔

''اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں جمعے کی شام ہوشیار پور پہنچ جاتا مگر... مجھے امید ہے کہ آپ اس سال مجھے معاف رکھیں گے۔ آیندہ سال مجھے امید ہے کہ میں حاضر ہو سکوں گا۔'' اگرچہ عذر یہ تھا کہ ''یہ کالج کا تعلق مجھے معذور کر دیتا ہے، دسمبر میں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا،'' مگر سچ یہ ہے کہ کالج کا تعلق شروع ہونے سے پہلے وکالت کا بہانہ تھا اور دسمبر میں سلسلہ ختم ہونے کے بعد متعدد دوسری وجوہات حائل ہوتی رہیں۔

آہستہ آہستہ اقبال کے دوست اس بات پر صبر کر کے بیٹھ گئے کہ کاہلی اقبال کی فطرت کا حصہ ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved.

234

اقبال کے گھر والے تسلیم کر چکے تھے کہ اقبال بہر حال کریم بی بی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے اور اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دُوسری طرف اقبال بھی اِس بات پر آمادہ نظر آرہے تھے کہ اُن کی دوسری بیوی ایسے پس منظر سے ہو کہ گھر والوں کے ساتھ گھل مل کر رہ سکے۔

منشی طاہرالدین کا خیال تھا کہ عبدالغنی کی بہن سردار بیگم اقبال کے لیے بہت مناسب رہیں گی۔ اقبال نے اصرار کیا کہ وہ لڑکی کی صورت دیکھے بغیر شادی نہیں کریں گے تو طاہرالدین عبدالغنی سے یہ کہہ کر کہ اقبال کی والدہ کو دکھانے کے لیے تصویر درکار ہے سردار بیگم کی تصویر بھی لے آئے اور اقبال کے سامنے رکھ دی۔

اقبال نے پسند کیا اور سیالکوٹ سے امام بی بی نے آکر لڑکی کے گھر والوں سے بات کر لی۔[61]

235

نومبر میں عطا محمد فوجی ملازمت سے سوا سال کی رخصت قبل از پنشن لے کر سیالکوٹ آئے۔ آبائی مکان اور دو ملحقہ مکان جو پندرہ بیس برس پہلے خریدے گئے تھے اُنہیں ملا کر ایک بڑا مکان بنانے کی گنجائش تھی چنانچہ عطا محمد نے آتے ہی پرانے مکان کو گرا کر نیا سہ منزلہ تعمیر کروانا شروع کر دیا۔

اُس زمانے میں خاص عمارتیں چونے گچی مسالے سے تعمیر ہوتی تھیں جسے اینٹ پیس کر اور اُس میں چونا ملا کر تیار کیا جاتا تھا۔ محنت طلب، مہنگا اور مضبوط طریقہ تعمیر تھا۔ عطا محمد نے چنوائی اور پلستر کے لیے یہی استعمال کیا۔

اقبال یورپ جانے سے پہلے جو کتابیں سیالکوٹ میں چھوڑ گئے تھے وہ ابھی تک وہیں پڑی تھیں۔ عطا محمد نے اس طرف توجہ دلوائی تو اقبال نے کہا، مجھے اب ان کی

ضرورت نہیں، یہیں رہنے دیجیے۔[۱۶۲]

236

لارڈ منٹو کے عہدے کی معیاد ختم ہو چکی تھی۔

۱۸ نومبر کو لارڈ ہارڈنگ کلکتہ پہنچے اور نئے وائسرائے کے طور پر اختیارات سنبھال لیے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ شاہ برطانیہ جارج پنجم جو پانچ برس قبل ولی عہد کے طور پر ہندوستان آئے تھے اگلے برس دربار منعقد کرنے آ رہے ہیں۔

237

''تمہاری لائبریری کی تمام کتابیں راوی کے کنارے ایک شاندار غروبِ آفتاب کے برابر نہیں،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔[۱۶۳]

238

''قدرت کی خوبصورتیوں کو صرف ایک عاشق کی نگاہوں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''چنانچہ ایک سچی شادی کی اہمیت!''[۱۶۴]

239

موسمِ سرما میں کسی وقت اقبال کا دوسرا نکاح ہوا۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے اور نکاح کے روز اُن کے علاوہ اقبال کے دوستوں میں سے مرزا جلال الدین، میاں شاہنواز، مولوی احمد دین اور شیخ گلاب دین اقبال کے ساتھ سسرال پہنچے۔ نکاح ہوا اور مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا مگر اسی چہل پہل میں میاں شاہنواز کا اوورکوٹ جو انہوں نے کھونٹی پر ٹانگ رکھا تھا رات بارہ بجے روانگی کے وقت غائب پایا گیا۔

یہ گویا پہلا برا شگون تھا جس کے بعد اگلے ڈھائی برس اس نئے رشتے کے لیے چھے

ثابت نہ ہوئے۔[۱۶۵]

240

نکاح کے چند روز بعد اقبال کو گمنام خطوط ملنے لگے جن میں لکھا تھا کہ لڑکی کا چال چلن درست نہیں ہے۔ اقبال الجھن میں پڑ گئے۔ مرزا جلال الدین کی بیگم کے ملنے جلنے والوں میں مس بوس تھیں جو سردار بیگم کے محلے میں وکٹوریہ گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ اُن سے صرف تعریف ہی سننے کو ملی۔ خود شیخ نور محمد نے استخارہ کیا تو اُس میں بھی یہی سامنے آیا کہ لڑکی پاک دامن ہے۔

اقبال کی ذہنی اذیت کم نہ ہوئی اور انہوں نے رخصتی رُکوا دی۔

241

کہاوت مشہور تھی کہ شیطان کا نام لیا جائے تو وہ پہنچ جاتا ہے مگر یہ بات تو خدا کے لیے بھی کہی جا سکتی تھی، اقبال سوچتے تھے۔

''خدا اور شیطان دونوں انسان کو صرف موقع دیتے ہیں،'' اُنہوں نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''اُسے آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ موقع کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔''[۱۶۶]

242

نئی اصلاحات کے بعد وائسرائے کی کونسل میں ایک لاٗ ممبر یعنی رکنِ قانون کا اضافہ ہوا تھا جس کی حیثیت ایک طرح سے وزیرِ قانون جیسی تھی۔ پچھلے برس ستیندر سنہا کو اولین ہندوستانی لاٗ ممبر بننے کا فخر حاصل ہوا تھا مگر وہ ایک چوٹی کے بیرسٹر تھے اور لاٗ ممبر کا عہدہ قبول کرنے سے انہیں دس ہزار پونڈ سالانہ کا نقصان ہو رہا تھا۔ وہ پہلے ہی یہ دعوت قبول نہ کرتے اگر بیرسٹر جناح نے اپنے سیاسی گرو گوکھلے صاحب کے ساتھ مل کر سنہا جی پر زور نہ ڈالا ہوتا۔

مسلم لیگ اُسی وقت سے کوشش کر رہی تھی کہ یہ اسامی کسی مسلمان کے ہاتھ آئے۔ نومبر میں سنہا جی نے استعفیٰ دیا تو لیگ کی خواہش پوری ہوئی اور علی امام لاٗ ممبر بن گئے جو اُن دنوں لیگ کے رہنماؤں میں پیش پیش تھے۔[١٦٧]

243

مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ پھر لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس دفعہ لاہور کے کشمیری مسلمانوں نے باقاعدہ میموریل لکھ کر لے جانا چاہا جس کا لہجہ تلخ تھا مگر مہاراجہ کے دیوان بشن داس نے رائے دی کہ جو کچھ کہنا ہو زبانی کہا جائے۔

''سرکار ہمیشہ فرشی دربار کیا کرتے ہیں لیکن آپ کی خاطر آج کرسیوں کا دربار لگایا گیا ہے،'' مہاراجہ نے کہا جب وفد کے ارکان کرسیوں پر بٹھائے جا چکے تھے۔ وفد نے شکریہ ادا کرنے کے بعد کشمیری مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کی طرف مہاراجہ کی توجہ دلائی۔

''سرکار کو ساری خبر ہے کہ لیڈر کس طرح بنا کرتے ہیں،'' مہاراجہ نے جواب دیا اور پھر کہتے چلے گئے کہ جو شخص بہت زیادہ باتیں بنائے، تحریر میں تلخ لہجہ اختیار کرے یا ہندو مسلم فساد پھیلائے وہ لیڈر بن جاتا ہے۔ اپنے کشمیری بھائیوں سے ہمدردی ہے تو کشمیر ہاؤس آنے کی بجائے کشمیر آئیں۔ وہ پنجاب نہیں، کشمیر ہے چنانچہ وہاں ہندو مسلم فساد کا سوال پیدا نہ ہونے دیا جائے گا۔

وفد کے سربراہ خان بہادر اللہ بخش نے بڑے سلیقے سے جواب دیا کہ انہوں نے سرکار کے عہد میں کبھی ریاست میں ہندو مسلم فسادات کا ذکر نہیں سنا مگر صرف ان لوگوں کے اطمینان کی ضرورت ہے۔

''کیا سرکار کی زبان پر اعتبار نہیں؟'' مہاراجہ نے کہا۔ ''بس ہم نے کہہ دیا، یہی ہماری زبان ہے اور یہی ہماری تحریر ہے۔''[١٦٨]

244

دسمبر میں اقبال کے دو سال پرانے لیکچر "Political Thought in Islam" کی پہلی قسط الہ آباد کے انگریزی پرچے *Hindustan Review* میں بھی شائع ہوئی۔[۱۶۹]

245

درگا سہائے بیوی اور لڑکے کی وفات کے بعد شراب میں گم رہنے لگے تھے۔ ۳۰ دسمبر کو فوت ہو گئے۔

عجب رقت بھری اے چارہ گر ہے داستاں میری
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر فغاں میری

درگا سہائے سرور جہان آبادی

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

246

۳۱ دسمبر کو شام ساڑھے چھ بجے برکت علی محمڈن ہال میں انجمن اسلامیہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ شیخ امیر علی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اقبال نے تقریر کی، خلیفہ شجاع الدین نے 'مسلمانوں کی تعلیم' پر انگریزی میں لیکچر دیا اور منشی اللہ یار جوگی نے 'برکاتِ تعلیم' کے عنوان سے نظم پڑھی۔[۱۷۰]

247

۱۷ دسمبر کو انجمن حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کا اجلاس ہوا۔

معلوم ہوتا ہے نو ارکان کی تحقیقی کمیٹی اپنی رپورٹ پیش کر چکی تھی کیونکہ اب کالج کے قواعد پر نظرِ ثانی کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے چار ارکان میں سے ایک اقبال تھے۔[۱۷۱]

248

نواب وقار الملک نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی اجازت دی جائے۔ اِس تجویز کے ساتھ ہی اس کی مخالفت اور اس کی حمایت میں بحث کا آغاز ہو گیا۔

249

''یا رب!'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا، ''میں اس دنیا میں اپنی پیدائش پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہاں گلابی صبح، شعلے سے سجی ہوئی شام اور وہ گھنے جنگل ہیں جن میں فطرت کی گزری ہوئی راتوں کی اُداسی ہمیشہ کی نیند سوتی ہے!''[۱۷۱]

250

''ہندوستانی خاندانوں کے ایک خاص طبقے میں، جو زیادہ تر برطانوی حکومت کی پیداوار ہیں، مختلف افسروں سے حاصل کی ہوئی اسناد جمع کروانے اور شائع کروانے کا رجحان ایک جبلت بن گیا ہے جو بعض اوقات بچوں میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''میں اِسے ایک قسم کی اخلاقی کمزوری سمجھتا ہوں جو غیر صحتمند ماحول کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔''[۱۷۲]

251

افراد کوئی وجود نہیں رکھتے۔ معاشرہ ہی اصل حقیقت ہے اور افراد کا وجود محض ایک فلسفیانہ خیال ہے جسے ہم نے اپنی سہولت کے لیے اختیار کیا ہوا ہے۔ کسی معاشرے میں افراد کی طبعی عمر کا تعین بھی اُس معاشرے کی ضروریات کے مطابق خود بخود ہوتا ہے اور یہ انکشاف بیالوجی کی کسی تحقیق سے ہوا تھا۔ یہ تحقیق اقبال کی نظر سے گزری تھی اور وہ اِسی کو علی گڑھ والے لیکچر کا مرکزی خیال بنا رہے تھے۔

معاشرہ ایک ایسا حقیقی وجود ہے جو سوچ سکتا ہے اور وہ یہ کام افراد کے ذریعے کرتا ہے جو اپنی سوچ کی معنویت سے خود واقف نہیں ہوتے۔ معاشرہ ہی عقلِ کل ہے۔ اُس کی نگاہ میں افراد کی موجودہ زندگی اہم نہیں ہوتی اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔ معاشرے کا کام اپنی بقاء کی فکر کرنا ہے چنانچہ مستقبل اور آنے والی نسلیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

مسلمان معاشرے کا وجود کسی جغرافیائی خطے سے منسلک نہیں چنانچہ ایک مسلمان کے لیے عقاید پر ایمان رکھنا کافی نہیں ہے بلکہ مسلمان ثقافت کو اپنا بھی ضروری ہے۔ البتہ جو اقدار زندگی کی کشمکش میں مفید نہ رہی ہوں اُن کی جگہ آنے والے وقت کی مناسبت سے نئی اقدار تخلیق کرنی چاہییں۔

کسی قوم کے ارتقاء میں تین قسم کی شخصیات سامنے آتی ہیں۔ پہلی قسم دلیر اور اُجڈ شخصیت ہے، مثال کے طور پر امیر تیمور۔ دوسری قسم عیش و عشرت کا ذوق رکھنے والی ہے، چنانچہ مغل شہنشاہ بابر کی شخصیت میں ان دونوں اقسام کی آمیزش پائی جاتی تھی جبکہ جہانگیر پوری طرح دوسری قسم کا نمائندہ تھا۔ تیسری قسم اپنے آپ پر قابو رکھنے کی شوقین اور دنیا کو سنجیدگی کی نگاہ سے دیکھنے والی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی عمدہ مثال اورنگزیب عالمگیر تھا۔ مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے نوجوانوں کو ایسا ہی بنائیں مگر موجودہ نظامِ تعلیم کے ذریعے یہ مشکل تھا۔ اکبر الٰہ آبادی نے سچ کہا تھا:

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مسلم یونیورسٹی کا قیام اِس مسئلے کا حل تھا اگر اس کا نصاب ہندی مسلمانوں کی قومی ضروریات کی روشنی میں طے کیا جاتا۔ مسلم یونیورسٹی میں علی گڑھ کالج، ندوۃ العلماء، دیوبند وغیرہ مختلف مکاتیبِ فکر کو اکٹھا کرنے کی ضرورت تھی تاکہ قوم ان سب کے مجموعی تجربات سے فائدہ اٹھا سکے مگر لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم ایک غلط خیال تھا۔

احمدی تحریک کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ یہ پنجاب میں اسلامی سیرت کا

خالص نمونہ ہے۔

اِس لیکچر کی تیاری میں اقبال کی نوٹ بک بہت کام آئی۔ اس میں درج کیے ہوئے بہت سے خیالات وہاں استعمال ہوئے۔

لیکچر دسمبر ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کالج کے اسٹریچی ہال میں انگریزی میں ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ۱۷۳

'The Muslim Community - Sociological Study'

252

سائنس، فلسفہ، مذہب، سب محدود ہیں اور صرف فن لامحدود ہے، اقبال کا خیال تھا۔

ماہرِ نفسیات سمندر میں تیرتا ہے مگر شاعر تہ میں اُتر جاتا ہے۔ اگر انسانی ذہن کا تجزیہ کرنا ہو تو ولیم جیمز کی کسی کتاب سے مدد لینی چاہیے مگر انسانی فطرت کی صحیح بصیرت صرف گوئٹے سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں ہی تخلیق کے خدائی خیال کو دوبارہ سوچتے دکھائی دیتے تھے مگر فرق یہ تھا کہ حقیقت پسند انگریز نے انفرادیت پر توجہ دی تھی اور تخیل پسند جرمن نے آفاقیت پر چنانچہ گوئٹے کا فاوسٹ اگرچہ انسان دکھائی دیتا تھا مگر حقیقت میں وہ پوری انسانیت کا علامتی اظہار تھا۔

حافظؔ شیرازی نے تراشے ہوئے ہیروں جیسے الفاظ میں کوئل کی میٹھی مدہوش روحانیت ڈال دی تھی۔

''جس طرح ندی کنارے اُگا ہوا پودا اُس میٹھے چاندی جیسے نغمے کی آواز نہیں سن سکتا جو تہ کے نیچے سے اُس کی پرورش کر رہا ہوتا ہے اُسی طرح ابدیت کے کنارے پرورش پاتا ہوا انسان بھی اُس خدائی لے کو نہیں سنتا جو اُس کی رُوح کی زندگی اور ہم آہنگی ترتیب دیتی ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔

ہر نیا تجربہ انسان کی روح میں سے کچھ نہ کچھ باہر لے آتا ہے۔ گناہ کا تجربہ بھی آپ کی رُوح کے کسی ایسے گوشے کو بے نقاب کرے گا جس سے آپ پہلے واقف نہ تھے۔

چنانچہ تجربہ دُہرے علم کا ذریعہ ہے کہ یہ آپ کو اُس کی بصیرت بھی دیتا ہے جو آپ کے باہر ہے اور اُس کی بھی جو آپ کے اندر ہے۔

نری عقل کی مدد سے سائنس کہیں نہ پہنچ پاتی۔ فرانسس بیکن نے منطق کے لیے یہ اصول متعین کیا کہ زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ زبانی جمع خرچ سے بہتر ہے تو چھوٹے چھوٹے واقعات بھی انسان کو کائنات کی طاقتوں کے راز سمجھانے لگے۔

اگر آپ اپنے دنوں، مہینوں اور برسوں کی قیمت اُن تجربات سے متعین کریں جو وہ لاتے ہیں تو اندازہ ہوگا کہ کبھی کبھی صرف ایک لمحہ پورے سال سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ [۱۷۴]

253

اقبال سیالکوٹ آئے تھے اور امام بی بی کی محفل میں بیٹھے تھے۔ محلے کے کسی تاجر گھرانے کی ایک شادی کا ذکر ہو رہا تھا جب کسی نے کہا کہ لڑکے والوں نے دلہن کو علاوہ اور زیور کے سونے کے پازیب پہنائے ہیں۔

اعجاز احمد دادی کے پاس ہی لیٹے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اعجاز کو پیار کرتے ہوئے کہا، اِس کی شادی ہوگی تو میں بھی اِس کی دُلہن کو سونے کے پازیب پہناؤں گی۔ [۱۷۵]

254

اعجاز احمد کا بیان ہے کہ اقبال تعطیلات میں سیالکوٹ آتے تو اپنی منجھلی بھتیجی عنایت بیگم کے ساتھ جو اُن دنوں دو تین سال کی ہوگی گھنٹوں کھیلتے رہتے۔ ''لیٹ کر اُس کو اپنے پیٹ پر بٹھا لیتے اور پوچھتے، تمہارا نام کیا ہے؟ وہ توتلی زبان میں کہتی 'لیت' تو خوب ہنستے۔ بار بار یہی سوال اور جواب دہرایا جاتا۔'' [۱۷۶]

255

''آؤ دوست،'' اقبال نے خیالات کی نوٹ بک میں لکھا۔ ''تم مجھے صرف تخیلاتی

متفکر اور بلند مقاصد کے خواب دیکھنے والے کے طور پر جانتے ہو۔ مجھے گھر میں بچوں سے کھیلتے ہوئے اور اُنہیں سواری کرواتے ہوئے دیکھو جیسے میں لکڑی کا گھوڑا ہوں! آؤ مجھے میرے گھر والوں میں گھرے ہوئے میری بوڑھی والدہ کے قدموں میں لیٹا ہوا دیکھو جن کے زندگی بخشنے والے ہاتھ وقت کو اُلٹے قدموں واپس لے آتے ہیں اور میں اپنے سر میں بھرے ہوئے تمام کانٹوں اور ہیگلوں کے باوجود اپنے آپ کو دوبارہ ایک اسکول جانے والا طالب علم محسوس کرتا ہوں۔ یہاں تم مجھے ایک انسان کے طور پر جان سکو گے۔''

اس کے بعد لکھا، ''فلسفہ بوڑھا کرتا ہے۔ شاعری دوبارہ جوان کردیتی ہے۔''[۱۷۷]

256

اقبال فرانسیسی مضمون نگار مونٹین کی تحریریں پڑھ رہے تھے جس نے انسانی فطرت کے بارے میں بڑے دلچسپ سوال اُٹھا کر سولھویں صدی کے معاشرے کو چیلنج کیا تھا۔ اُس نے ایک جگہ لاطینی شاعر ہورلیس کا حوالہ دیا تھا جس نے کہا تھا، ہم دریا پر بہتی ہوئی لکڑیوں کی مانند ہیں۔

مونٹین نے اس کی تشریح یوں کی تھی کہ ہورلیس کے خیال میں ہم زندگی کے سفر میں اپنی مرضی سے نہیں جاتے بلکہ جس طرح دریا پر بہتی ہوئی لکڑیاں پانی کے بہاؤ کے مطابق کبھی آہستہ کبھی تیز چلتی ہیں وہی مثال ہماری زندگیوں کی ہے۔

اقبال کا ذہن محمد حسین آزاد مرحوم کی طرف گیا جنہوں نے یہ خیال زیادہ خوبصورتی سے ادا کیا تھا:[۱۷۸]

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

257

جرمن ڈرامہ نگار اور نقاد لیسنگ نے اپنی تحریروں سے بعد میں آنے والے ادیبوں مثلاً گوئٹے کے لیے روشن خیالی کے دروازے کھول دیے تھے۔ ''ضروری نہیں کہ ادبی تنقید ادب کی تخلیق کے بعد پیدا ہو،'' اقبال نے نوٹ بک میں درج کیا۔ ''جرمن ادب کے آغاز ہی میں ہمیں لیسنگ دکھائی دیتا ہے۔''

جرمن ادب اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ جب گوئٹے کی شاعری پورے شباب پر تھی تو اُسی زمانے میں ہائنے جیسا دوسرا عظیم شاعر پیدا ہو گیا۔ ''دو **مسلسل** بہاریں!'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔[۱۷۹]

258

''محبت ایک شرارتی بچی ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا۔ ''وہ ہماری انفرادیت قائم کرتی ہے اور پھر چپکے سے ہمارے کان میں کہتی ہے، اِسے ترک کردو۔''[۱۸۰]

259

''میں نے اکثر دانائی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی ہے،'' اقبال نے لکھا۔ ''وہ ہمیشہ اپنے آپ کو مضبوط ارادے کی چٹان کے پیچھے چھپاتی ہے۔''

اس کے بعد اُنہوں نے لکھا، ''اگر چاہتے ہو کہ اس دُنیا کے شور میں تمہاری آواز سُنی جائے تو اپنی رُوح کو کسی ایک خیال کا پابند ہونے دو۔ صرف ایک خیال والا شخص ہی دنیا کی سیاست اور معاشرے میں انقلاب لاتا ہے، سلطنتیں قائم کرتا ہے اور دُنیا کو قانون دیتا ہے۔''[۱۸۱]

260

''۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ

اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہییں،" اقبال کا بیان ہے، "لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہر حال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدِنظر رکھ کر اپنی مثنوی... لکھنی شروع کی۔"[۱۸۴]

نظم چونکہ کسی ایک خیال کی پابند ہوتی ہے لہٰذا اُس سے شاعر کے خیالات کا نہیں صرف جذبات اور رویے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خیالات کو پیش کرنے کے لیے مثنوی سے بہتر کوئی اور صنف نہیں تھی جسے فارسی کے بڑے شاعروں نے کافی ترقی دی تھی۔ اُردو میں ابھی تک مثنوی نے ویسی ترقی نہیں کی تھی۔

اقبال نے ایک طویل مثنوی اُردو میں لکھنا شروع کی جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ تقریباً ڈیڑھ سو شعر لکھنے کے بعد تلف کر دیے مگر اُن کی بیاض میں 'نورِ محمدی' اور 'قربانیٔ خلیل' کے عنوانات سے چھوٹے چھوٹے ادھورے ٹکڑے اِسی مثنوی کے باب معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال بتانا چاہتے تھے کہ کائنات کی ابتدا کس طرح ہوئی اور پھر کس طرح زندگی کے دامن سے ایک ایسی قوم نے جنم لیا جس کا کام ہر زمانے میں خدا کی توحید پر گواہی دینا اور اس طرح لوگوں کو رنگ اور نسل کی تقسیم سے بلند ایک اور وحدت کی طرف بلانا تھا۔

اس نظم کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نُور ہی زندگی کی اصل ہے۔ یہ نور خود خدا کا نور ہے۔ وہ بات کہ احد میں 'م' کا اضافہ کرنے سے احمد بن جاتا ہے، اقبال نے اس نظم میں بھی دہرائی۔

نورِ محمدّی

جوہرِ خالقِ دہر اور دہر بھی
جوہرِ بحر اور بحر کی لہر بھی

جو کثرت میں آ کر بھی تنہا رہا
نہاں ہو کے پردوں میں پیدا رہا
رہی بے کلی جس کو سیماب وار
ملا میمِ احمد میں جس کو قرار
وہاں بھی دُوئی نے نہ پایا اُسے
کہ بھایا نہ احمد کا سایا اُسے
ہوا جسمِ بے سایہ بن کر عیاں
بنی جس سے خاکِ عرب آسماں
سمایا نہ جو وہم و اِدراک میں
درخشاں ہوا شانِ لولاک میں
کہیں پر ہے آبادیٔ بزمِ قیس
کہیں خیرہ کرتے ہیں چشمِ اویس
کہیں قہرِ فاروق و وعظِ علی
کہیں نعرۂ اُمتی، اُمتی
علَم پر کہیں اس کے چمکا ہلال
جلایا کہیں اس نے رختِ بلال
کہیں طُور پر لن ترانی سے کام
کہیں کوہِ فاراں پر دیدارِ عام
اِسی سے تھا روشن یقینِ خلیل
اِسی کی امیں تھی جبینِ خلیل

یہاں سے کلام کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف نکلا اور تین بند اُن کے بارے میں کہے گئے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. © 2002-2006

صاف نظر آتا ہے کہ اقبال انسان کا تعلق نہ صرف خدا سے بلکہ قومیت کے اُس تصور سے بھی جوڑنا چاہتے تھے جس کی بنیاد رسول اللہ نے رکھی تھی مگر جس کی جڑیں حضرت ابراہیم کے اِس اعلان تک پہنچتی تھیں کہ انسان کا سر خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے گا اور نہ ہی خدا کے سوا کوئی خوف دل میں جگہ لے گا۔

مگر اُردو زبان کا اپنا مزاج تھا اور اقبال مابعد الطبیعات کو نظم کرنے کی بجائے مرثیے کی طرف جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بالآخر اُنہیں تسلیم کرنا پڑا کہ جو محسوسات اُن کے ضمیر میں ہیں وہ اِس نظم میں ادا نہیں ہو پا رہے۔
بہت بے بسی محسوس کی ہوگی۔[۱۸۳]

261

ایک فارسی غزل کی آمد ہوئی تو اُسے بیاض کے آخری صفحات میں لکھا۔ 'قربانیٔ خلیل' کے بعد کے صفحات اب بھی اُردو نظم کے لیے خالی رہے۔

فارسی غزل کا مفہوم یہ تھا کہ رات اپنے گھر میں جلنے والی شمع سے میں نے پوچھا کہ میں بھی تمہاری طرح جلتا ہوں مگر کیا وجہ ہے کہ کوئی پروانہ مجھ پر فدا نہیں ہوتا:

دوش می گفتم بشمعِ کلبۂ ویرانِ خویش

کچھ سوچ کر کلبہ کاٹ کر اُسے منزل کر دیا۔ غزل کی بجائے یہ ایک ترکیب بند بن گئی کیونکہ کچھ اشعار کے بعد ایک ٹیپ کا شعر ہو گیا تھا۔ ویسے قریباً سترہ اشعار ہوئے جن کی وہ اصلاح کرتے رہے اور کئی اشعار کاٹ دیے۔[۱۸۴]

اُردو شاعری میں لالے کا پھول عاشق کی علامت تھا کیونکہ سینے میں داغ رکھتا تھا۔ مگر نامکمل عشق کی علامت تھا کیونکہ اپنا داغ ہر ایک کے سامنے ظاہر بھی کر دیتا تھا جبکہ مشرق میں یہ بات اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اقبال نے لالے کو روایتی حیثیت میں کئی دفعہ استعمال کیا تھا مگر اس غزل میں پہلی بار اُنہوں نے لالے کے لیے ایک ایسی ترکیب

استعمال کی جو بعد میں ایک بہت اہم استعارے کو جنم دینے والی تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو صحرا میں اُگے ہوئے لالے سے تشبیہ دی جو اپنے عشق کا داغ ظاہر تو کرتا ہے مگر اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

ملکہ نور جہاں کے مزار پر لکھے ہوئے اُس مشہور فارسی شعر کا اثر بھی نظر آ رہا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہم غریبوں کے مزار پر چراغ ہے نہ پھول ہیں، یہاں پروانوں کے پر جلتے ہیں نہ بلبل کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔[۱۸۵]

چوتھا حصہ

262

یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو ایل پی سانڈرز فلسفے کے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور پہنچ گئے اور اقبال سے چارج لے لیا۔

263

کالج میں اقبال کے لیے الوداعی تقریب ہوئی تو اُنہوں نے رابرٹ براؤننگ کی شاعری پر لیکچر دیا۔

لیکچر کی کوئی تفصیل موجود نہیں مگر براؤننگ کے بارے میں اُن دنوں اقبال کی رائے یہ تھی کہ تمام فلسفے کا حاصل یہ ہے کہ یقینی علم ممکن نہیں۔ براؤننگ بڑی خوبصورتی سے اِس بے یقینی کو اخلاقی فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی علم کا نامکمل ہونا اخلاقی نشونما کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ اگر یقینی علم ہوگا تو پھر اپنی پسند سے فیصلہ کرنے کا اختیار بھی جاتا رہے گا۔[۱۸۶]

264

علی بخش نے اقبال سے پوچھا کہ اُنہوں نے ملازمت کیوں چھوڑ دی۔انہوں نے جواب دیا کہ وہ جو کچھ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں اُسے حکومت کی ملازمت میں ہوتے ہوئے آزادی سے نہیں کہہ سکتے۔[۱۸۷]

265

''خوشامد محض حد سے بڑھی ہوئی خوش اخلاقی ہے،'' اقبال نے نوٹ بک میں لکھا اور اس کے بعد اُس میں اپنے خیالات درج کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔[۱۸۸]

266

اس برس میکملن لندن سے ہنری برگساں کی کتاب *Laughter* کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔یہ معلوم نہیں کہ اقبال اس سے کب متعارف ہوئے مگر بعد میں یہ کتاب ان کی کتابوں کے مجموعے میں شامل ہوئی۔اس میں برگساں نے مزاح کے میکانکی پہلوؤں کا جائزہ لیا تھا۔

اسی برس اقبال کے کیمبرج کے استاد سورلے کی کتاب *The Moral Life and Modern Worth* کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی اور یہ بھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئی۔لوزاک لندن نے اسلام کے دفاع میں ہنری اسٹب کی کتاب جسے حافظ محمود شیرانی نے مرتب کیا تھا، شائع کی اور یہ بھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئی۔اس کا عنوان تھا: *A History Of the Rise and Progress of Mahmoetanism with the Life of Muhammad and a vindication of him and his religion against the calumnies of the Christians*

اس برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں

یہ ہیں:[۱۸۹]

Baedeker, Karl. *The Mediterranean: Seaports and Sea Routes, Handbook for Travellers*. Leipzig, Karl Baedeker

Fyfe, H. Hamilton. *The New Spirit in Egypt*. Edinburgh, William Blackwood

Hill, J. Arthur. *Religion and Modern Psychology: a study of present tendencies, particularly the religious implications of the scientific belief in survival, with a discussion on mysticism*. London, William Rider

Judson, Harry Prat. *The Higher Education As A Training for Business*. Chicago, University Press of Chicago

Rogers, P. Reginald. *A Short History of Ethic: Greek and Modern*. Macmillan, London

Sedlack, Francis. *A Holiday with a Hegelian*. London, A. C. Field

267

اقبال نے خود یا اُن کے کسی شاگرد نے اُن کی مدد سے شیلے کے شاعرانہ نظریات پر ایک کتاب شائع کی تھی جس کی طباعت معمولی تھی اور سرورق پر مصنف کی حیثیت میں

شیخ محمد اقبال درج تھا۔[۱۹۰]

268

جنوری میں Hindustan Review میں اقبال کے دو سال پرانے لیکچر کی دوسری اور آخری قسط شائع ہوئی۔[۱۹۱]

269

رسالہ ادیب کے جنوری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں مس گوٹسمین والی نظم شائع ہوگئی۔

270

پیر ۹ جنوری کو صبح سویرے علی بخش یا کوئی اور نوکر ایک لفافہ لے کر آیا جس میں سر ٹامس آرنلڈ کی بیٹی نینسی کی طرف سے کرسمس کارڈ تھا جو شاید ڈاک کی تاخیر کی وجہ سے دیر میں پہنچا تھا۔

دو روز بعد جب صبح ہی سے اقبال کے سائیس کی سیاہ فام بچی، جو اقبال کے نزدیک ''پرفیکٹ نیوسینس'' (perfect muisance) تھی، نچلی منزل پر رو رو کر اُن کے ذہنی سکون میں خلل ڈال رہی تھی انہوں نے خاصے لطف کے ساتھ نینسی کے کارڈ کا جواب لکھا:

''غالباً تم اپنے علم نباتات کے اسباق میں خوب ترقی کر رہی ہوگی۔ میں جب اگلی مرتبہ اپنے گرو کے قدم چومنے انگلستان آؤں گا تو امید ہے کہ تم مجھے ان سب پھولوں کے نام سکھاؤ گی جو انگلستان کی خوبصورت وادیوں میں اُگتے ہیں۔ مجھے اب تک وہ سویٹ ولیمز، بلیو بیلز، ٹیولپ اور لیپ یاد ہیں، لو دیکھو تمہارے شاگرد کا حافظہ کچھ ایسا برا نہیں!''

آرنلڈ اُن دنوں انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلبہ کی مدد کے

لیے مشیرِ تعلیم کے طور پر کام کر رہے تھے لہٰذا اقبال نے لکھا، ’میرے گروان دنوں کم عمر انسانیت کی بہتری میں مصروف ہیں سو تم اس یزدانی ہستی اور فانی اقبال کے درمیان، جو اُن کے متعلق سب کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہے ایک نیک پیامبر کا کام کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے الہامات کو تم سے پوشیدہ نہیں رکھیں گے اور تم موقع پا کر ان کی خبریں مجھ تک پہنچا دو گی۔‘‘

271

۲۸ جنوری کو دوپہر دو بجے برکت علی محمڈن ہال میں نواب فتح علی قزلباش کی صدارت میں انجمن اسلامیہ پنجاب کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا جس میں اگلے تین برس کے لیے عہدیدار منتخب کیے گئے۔

اقبال، میاں شفیع، میاں نظام الدین، شیخ عبدالقادر، نواب ذوالفقار علی خاں، میاں فضل حسین، مولوی محبوب عالم، مفتی عبداللہ ٹونکی، شیخ عبدالعزیز اور میاں عبدالعزیز وغیرہ مجلس عاملہ کے ارکان قرار پائے۔[۱۹۴]

272

نواب ذوالفقار علی خاں نے ایک دفعہ پھر اقبال اور مرزا جلال الدین کو پٹیالہ بلایا تھا۔

’’اِس خیال سے کہ کہیں ہم انکار نہ کر دیں، اُنہوں نے ایک مقدمے میں ہم دونوں کو وکیل کر دیا،‘‘ مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ’’ہم کھانا ساتھ لے گئے۔ راج پورہ میں پہنچ کر کھانا کھایا۔ پٹیالہ پہنچے تو اتفاق سے اُس وقت نواب صاحب اور سر جوگندر سنگھ، مہاراجہ کے پاس کسی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے۔ اُن کے آدمی اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔‘‘

کچھ دیر بعد نواب ذوالفقار اور جوگندر سنگھ بھی پہنچ گئے اور تین دن تک اقبال اور مرزا

جلال الدین کو مہمان رکھا۔ جوگندر نے ان دونوں کو پٹیالے کی خوب سیر کروائی۔ دونوں مقدمے میں بھی پیش ہوئے اور شاید دو دو ہزار فیس ملی۔

پٹیالہ میں اقبال کو پیچش ہو گئی اور سول سرجن نے علاج کیا۔

واپسی پر اقبال اور مرزا جلال الدین امرتسر میں بھی رکے جہاں بیرسٹر تاج الدین سے ملے جو اُس زمانے میں وہاں بندوبست کے محکمے میں نائب تحصیلدار تھے۔[۱۹۳]

273

۱۴ جنوری کو مولانا محمد علی نے جن کی عمر پینتیس برس تھی، کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ Comrade جاری کیا۔ ظفر علی خاں نے زمیندار میں اس کی تعریف کی اور لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی ضرورتوں کی فہرست میں ایک ایسا اخبار مدت سے شامل تھا جو اُن کی آرزوؤں کی انگریزی میں ترجمانی کر سکے اور کامریڈ یہ ضرورت پوری کرتا ہے۔

274

ایران میں یورپی طاقتوں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا اور ہندوستان کے مسلمان جنہیں اپنے ملک کے سوا باقی تمام دنیا کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کی خلش رہتی تھی ایران کے لیے دعائیہ جلسے کرنے لگے۔ لاہور میں بھی اس قسم کا کوئی جلسہ ہوا تو اقبال سے شرکت کی درخواست کی گئی مگر اُنہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اُن کی طبعیت ٹھیک نہیں۔

ایک دفعہ پھر اقبال پر خوب اعتراضات ہوئے جنہیں اکٹھا کر کے اُنہوں نے نظم کر دیا:[۱۹۴]

تُو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز

275

انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ قریب آ رہا تھا۔

۵فروری کو جلسہ کمیٹی کے ارکان مقرر کیے گئے۔ اس دفعہ اقبال نے بھی شامل ہونا قبول کر لیا۔[۱۹۵]

276

یہ بات عام ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر اقبال دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں چنانچہ نکاح کے پیغام آنے لگے۔ ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کی بیٹی انہیں خط لکھا کرتی تھی کہ وہ اُن سے شادی کرنا چاہتی ہے کیونکہ اسے ہندوؤں سے نفرت ہے۔[۱۹۶]

277

مسلمانوں کی عام سیاست میں ابھی انگریزوں سے مفاہمت کا وہ دَور جاری تھا جس کی ابتدا سر سید احمد خاں کر گئے تھے مگر ظفر علی خاں کی طبیعت بار بار بدک اُٹھتی تھی۔ کہیں سے خبر ملی کہ جرمنی کے قیصر ولیم نے اپنی بحری فوج سے کہا ہے کہ آیندہ ایک ہولناک جنگ واقع ہو گی جس کے مناظر دل دہلا دیں گے۔ چنانچہ صرف وہی قوم بازی لے جا سکے گی جو شراب کم پیتی ہو۔

''کاش کہ ٹرکی جو اسلام کے تصدق میں اِس اُم الخبائث سے بچا ہوا ہے اُس ہولناک جنگ کے وقت جس کی طرف قیصر نے اشارہ کیا ہے انگلستان کا حریف بن چکا ہو،'' زمیندار نے ۲۴فروری کو لکھا، ''تا کہ جب چھڑے تو وہ قیصر کے قول کی عملی طور پر تصدیق کر سکے۔''

اتفاق ہے کہ تین سال بعد مولانا ظفر علی خاں کی دعا قبول ہوئی مگر قیصر کا قول پورا نہ ہو سکا۔

278

۲۶ مارچ ۱۹۱۱ءکو پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے اقبال کو اورینٹل فیکلٹی کا فیلو نامزد کیا جبکہ شیخ عبدالقادر کو قانون کی فیکلٹی میں رکھا گیا۔[۱۹۷]

279

۲۹ مارچ کو خبر پہنچی کہ بزرگ شاعر ظہیر دہلوی جن سے اقبال پچھلے برس حیدرآباد (دکن) میں مل کر آئے تھے دس روز قبل انتقال کر گئے۔[۱۹۸]

280

۳۱ مارچ کو پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس پیش کرنے کا بندوبست کیا گیا جو ایک روز پہلے لاہور تشریف لائے تھے۔ ایڈریس اگلی شام یونیورسٹی ہال میں پیش کیا گیا۔

۴۸ افراد کے وفد میں اقبال بھی شامل تھے۔ وہ ان دنوں پنجاب مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ اسسٹنٹ سیکرٹری کب بنے اور کب تک رہے۔[۱۹۹]

281

اُردو شاعری میں واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں محبت کرنے والا محبوب کی بے وفائی، ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ بیجا محبت اور جدائی کی مصیبت کی شکایت کرتا گویا معشوق کو دکھاتا ہے کہ اگر یہی روش رہی تو صبر کا دامن چھوٹ جائے گا۔ فارسی کی اِس صنف کو اُردو میں میر تقی میرؔ نے اٹھارہویں صدی میں مقبول کیا:

میں بھی ناچار ہوں اب منہ میں زباں رہتی نہیں

میرؔ نے چار واسوختیں لکھیں جن میں تمہید کے بعد اپنی وفاداری، محبوب کی بیوفائی اور

کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو جانے کی دھمکی کے ساتھ ساتھ لہجہ تیز ہوتا جاتا تھا مگر آخر میں ہتھیار ڈال دیے جاتے تھے۔

پیشتر ہم سے کوئی تیرا طلبگار نہ تھا
ایک بھی نرگسِ بیمار کا بیمار نہ تھا
جنس اچھی تھی تری، لیک خریدار نہ تھا
ہم سوا کوئی ترا رونقِ بازار نہ تھا
کتنے سودائی جو تھے دل نہ لگا سکتے تھے
آنکھیں یوں موند کے وے جی نہ جلا سکتے تھے

میر تقی میر[200]

282

اقبال نظم لکھنے بیٹھے تو بیاض کے اُن صفحات کو استعمال کرنا مناسب نہ سمجھا جنہیں طویل اردو مثنوی کے لیے خالی چھوڑ رکھا تھا۔ چنانچہ کسی اور کاغذیا کاپی میں نظم لکھی۔

آٹھ سال پہلے 'ابرِ گہربار' لکھتے ہوئے اُس کی تمہید میں ایک غزل اس ڈر سے لکھی تھی کہ کہیں کوئی کفر کا فتویٰ نہ لگا دے۔ اب جو نظم لکھنے جا رہے تھے اُس کا موضوع ایسا تھا کہ ایک دفعہ پھر یہی خدشہ پیدا ہوا چنانچہ معذرت میں نو اشعار کا ایک قطعہ شاید نظم سے پہلے ہی تحریر کر لیا:

منظور شکایت کا نرالا مجھے ڈھب ہے
شوخی مری ایسی ہے کہ بس حدِ ادب ہے

اِس کے بعد نظم لکھنا شروع کی۔ اُس کا عنوان تھا، 'شکوہ'۔

283

اُن دنوں اقبال انسانی تمدن کو عقل و تدبیر، جذبات اور عمل کے زاویوں سے دیکھتے

تھے مگر 'شکوہ' لکھتے ہوئے عمل کا زاویہ باقی سب پر حاوی آ گیا اور وہ بھی صرف اُس محدود عمل کا جس کا تعلق دنیاوی طاقت بڑھانے سے ہو۔

یہ موضوع کا تقاضا بھی تھا کیونکہ نظم میں خدا سے اِس بات کا شکوہ کرنا تھا کہ مسلمانوں کو دنیا میں سیاسی قوت کیوں حاصل نہیں ہے جبکہ وہ خدا کے نام لیوا ہیں چنانچہ اس کی دلیل میں یہ کہنا ضروری تھا کہ جب یہ طاقت حاصل تھی تو اُنہوں نے اِسے صرف توحید کی خدمت میں صرف کیا تھا۔ جس طرح ٹامس گرے کی نظم The Deserted Village میں بہت سی باتیں تاریخی حقائق کے خلاف تھیں مگر اُس کا حسن متاثر نہیں ہوتا تھا اُسی طرح 'شکوہ' کی تاثیر اس وجہ سے کم نہیں ہوتی تھی کہ اس میں یہ بات نظرانداز کرنی پڑ رہی تھی کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی اچھے برے ہر طرح کے بادشاہ گزرے ہیں اور اپنے اپنے وقت میں خدا کا پیغام پہنچانے اور توحید کا درس دینے پر دوسری قومیں بھی خدا کی طرف سے فائز رہی ہیں۔

مغربی مصنفوں کا اسلام پر سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ یہ مذہب تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ سرسید، امیر علی اور خود آرنلڈ بھی اسی کوشش میں رہے تھے کہ کسی طرح اس الزام کو غلط ثابت کر دیں مگر 'شکوہ' کی ساخت تقاضا کر رہی تھی کہ فی الحال یہ باتیں بھول کر خدا سے کہہ دیا جائے کہ مسلمانوں کی قوتِ بازو ہی تھی جس نے خدا کا نام پھیلایا چنانچہ اگر وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں توحید باقی رہے تو وہ مسلمانوں کو دوبارہ وہی شان و شوکت عطا کر دے ورنہ بعد میں اُن کی گرفت نہ کرے کہ دنیا میں توحید کیوں باقی نہ رہی۔

ظاہر ہے کہ اس نظم میں عقبہ بن نافع جیسے فاتحین ہی کا ذکر کیا جا سکتا تھا جنہوں نے بحرِ اوقیانوس میں گھوڑا ڈال کر تلوار لہرائی تھی اور کہا تھا، یا اللہ اگر سمندر میرا راستہ نہ روکتا تو میں دنیا کے آخری کونے تک تیرا پیغام لے جاتا۔ تھوڑی سی رُو رعایت کے ساتھ محمود غزنوی کی جگہ بھی نکل آئی تھی مگر غزالی، عطار اور رومی کے تذکرے کی گنجائش کم تھی کیونکہ

اُن جیسے لوگوں کا ہونا نہ ہونا سیاسی قوت کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ حالی نے مسدس میں اسلام کے کارناموں میں یہ بھی کہا تھا، مزہ علم و حکمت کا سب کو چکھایا۔ اقبال کہہ دیتے تو شکوے شکایت میں سے دم نکل جاتا کیونکہ پھر یہ سوچنا پڑتا کہ اگر حکومت خدا کے حکم سے دُوسروں نے بھی چھین لی ہو تو علم اور تحقیق کے میدان میں پیچھے رہ جانا مسلمانوں نے خود کیوں پسند کر لیا ہے؟

یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اقبال کو خود اس بات کا احساس نہیں تھا کہ شکوہ میں تصویر کا صرف ایک رُخ موجود ہے اور دوسرا سرے سے غائب ہے۔ بالکل اُنہی دنوں کی کم سے کم ایک ایسی تحریر ایسی موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصویر کے دونوں رخ اُن کے ذہن میں تھے مگر فنی اعتبار سے نظم خیال کی وحدت کا مطالبہ کرتی ہے اور ایک ایسی چیز ہے کہ اگر اس کے دامن میں بہت سے خیالات سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو اس کی تاثیر میں فرق آ سکتا ہے۔

موضوع کے دوسرے پہلو سامنے لائے جاتے تو شکایت اپنا جواب بن جاتی۔ چنانچہ بعد میں جب اقبال نے اپنی نظم کا جواب لکھا تو یہی کیا۔

ادبی اعتبار سے 'شکوہ' میں میر کی واسوخت، انیس کے مرثیے اور حالی کی مسدس کے علاوہ غالب کی معنی آفرینی جس کی پیروی کیے بغیر اقبال رہ ہی نہیں سکتے تھے، سب کی جھلک موجود تھی۔ زبان کی ایسی نزاکتیں دکھائی تھیں کہ اگر ایک مصرعے میں بُلبل کے نغموں کا ذکر ہے تو دوسرے مصرعے میں اپنے ساتھی کو بھی ہم نشیں، ہم دم یا کسی اور خطاب سے بلانے کی بجائے ہم نوا کہہ کر مخاطب کیا کہ اس لفظ کو نغمے سے مناسبت ہے۔ بعض بند ایسے تھے کہ مصرعوں کے درمیان میں بھی ہم قافیہ الفاظ استعمال کر ڈالے تھے مثلاً اگر ہُوں کی ردیف تھی تو بُوں، کروں، سُنوں، ہُوں مصرعوں کے درمیان میں آ رہے تھے۔ جس بند میں لڑائی کا ذکر تھا وہاں کرخت آوازیں تھیں یا ایسے حروف جن کے سُر چڑھے ہوئے ہوں مثلاً اڑ، اُکھڑ، بگڑ، لڑ وغیرہ۔ ویسے تو اقبال ہر نظم میں لفظوں کی

موسیقیت کا خاص خیال رکھتے تھے مگر بعض نظموں میں ایسا کمال دکھاتے تھے کہ اگر کوئی زبان نہ جانتا ہو اور اُس کے سامنے نظم پڑھی جائے تو وہ بھی کم سے کم یہ جان جائے کہ کس طرح کے جذبات کا اظہار ہو رہا ہے۔[۲۰]

یورپ جانے سے پہلے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں جتنی طویل نظمیں پڑھی تھیں اُن سے کہیں زیادہ چونکا دینے والا آغاز تھا۔ طویل تمہید کے بغیر اصل بات پر آ گئے تھے۔

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بُلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سُخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو
ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے
تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم
پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم

شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوبؐ کی دیوانی تھی؟
ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے، لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا
بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی
اہل چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے
تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کے مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی!
ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے
تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟
کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی
اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر ، جہاں دار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے 'ھو اللہ احد' کہتے تھے
آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے!
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے
تھے اشاعت پہ کمربستہ غریب اور امیر
غافل اِس کام سے رہتے تھے نہ سلطاں نہ وزیر
شہرِ دشمن میں گئے جنگ میں ہو کر جو اسیر
واں بھی مقصود رہی خدمتِ دیں کی تدبیر
ذوقِ تبلیغ سے بے چین رہا کرتے تھے
اہلِ زنداں کو مسلمان کیا کرتے تھے
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

IqbalCyberLibrary All rights reserved. © 2002-2006

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں!
امتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہ گار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مست مۓ پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر
بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں
یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور
پہلے رہنے کو محل تھے اب گھر بھی نہیں
ایسے ششدر ہیں کہ سر رکھنے کو اِک دَر بھی نہیں
چھوڑیئے کس کو یہاں دوش پہ اب سر بھی نہیں
یہ میسر ہو تو پھر ہاتھ میں پتھر بھی نہیں
نہیں مسجد تو ڈریں طعنۂ اغیار سے کیا
توڑ سکتے نہیں بتخانے کی دیوار سے کیا؟

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب
طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

صفتِ غنچہ ہے تدبیر ہماری دلگیر
ہو نہ تقدیر مساعد تو کرے کیا تدبیر
مدرسے بنتے ہیں پوری نہیں ہوتی تعمیر
زندہ ہم خاک ہوں تقدیر ہی کہتی ہے بمیر
دل کو تسلیم کی خُو ڈال کے بہلائیں گے
بے نیازی تری عادت ہے تو سہہ جائیں گے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!
تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کے آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدہء فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر
درد لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
امت احمد مرسلؐ بھی وہی تو بھی وہی
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی
تجھ کو چھوڑا کہ رسول عربیؐ کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسم سلمانؓ و اویس قرنیؓ کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشیؓ رکھتے ہیں
عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی

مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے!

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اِک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دُور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ 'ھو' بیٹھے
پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگرسوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز!
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اُسی آگ میں جلنے کے لیے
مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما
بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن!
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک
قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی!
لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینوں میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں
چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری!

284

بہار کا موسم تھا۔ شاہدرہ میں ایک پارٹی ہوئی اور چوہدری شہاب الدین سفید سوٹ پہن کر وہاں پہنچے تو اقبال نے پنجابی میں کہا، ''بھئی دیکھو دیکھو! کپاہ وِچ کٹا وڑ گیا اے'' (بھئی دیکھو، دیکھو! کپاس میں کٹا گھس گیا ہے۔''[۲۰۲]

اقبال نے پھر چوہدری شہاب الدین کی سیاہ رنگت پر چوٹ کی تھی۔ مرزا جلال الدین کا بیان ہے کہ چوہدری صاحب جب بگڑتے تھے تو اقبال کہتے تھے، ''بھئی تجھے دیکھ کر لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لیے مجھے لطیفوں سے نہ روکا کرو۔''

285

۱۳ اپریل کی رات گیارہ بجے شاہدرہ میں چاند کو دیکھ کر اقبال کی طبیعت رواں ہوئی۔

اے چاند حسن تیرا گردوں کی آبرو ہے
تو پھول ہے کنول کا، مہتاب تیری بو ہے

چاند جسے تاروں کی دلکشی میں ڈھونڈتا ہے وہ شاید زندگی کے ہنگاموں میں پوشیدہ ہے۔ سرو میں سر اٹھائے کھڑا ہے اور سبزے میں لپٹ کر سو رہا ہے۔ انسان کے دل سے چاند کے داغ تک ہر طرف بس وہی ہے۔

مصرعے اترتے رہے اور چار چار اشعار کے دو بند ہو گئے۔ نظم کا عنوان 'چاند' رکھا اور پھر نظم میں ترمیم ہوئی۔[۲۰۳]

286

۱۴ اپریل کو لاہور کے مشہور قوم پرست اخبار ہندوستان نے اقبال کے ترانے کا جواب شائع کیا تھا:

دعویٰ غلط تمہارا عربستاں ہے تمہارا
ہندوستاں کے ہم ہیں، ہندوستاں ہمارا
مذہب سب سے اوّل دنیا میں تھا ہمارا
تاریخ میں ہراول نام و نشاں ہمارا

شاعر کا نام رعنا تھا۔[۲۰۴]

287

اُسی روز اقبال کے دوست میاں شاہنواز کی شادی میاں محمد شفیع کی لڑکی جہاں آرا

سے ہوئی جو ابھی تک کوئن میری اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔شاہنواز کی عمر چھتیس برس تھی اور جہان آرا پندرہ برس کی تھیں۔

تقریب کا انتظام میاں خاندان کی باغبانپورہ والی قیام گاہ میں روایتی انداز میں کیا گیا تھا۔دلہن کو تقریب میں بھکاریوں کے داخلے پر اعتراض تھا مگر دلہن کی دادی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

اقبال نے اس شادی کے موقعے پر تاریخ کہی جس میں پانچ شعر تھے اور تاریخی مصرع یہ تھا:[۲۰۵]

خانہٴ فرخندہ اش آباد باد

288

کسی تقریب میں اقبال اور جسٹس شاہ دین اکٹھے تھے۔میز کے ایک طرف سے اقبال نے انہیں دو شعر لکھ کر بھیجے اور جواب میں جسٹس شاہ دین نے اُسی بحر میں شعر لکھ کر بھیجا۔دونوں میں کافی نوک جھونک ہوئی۔[۲۰۶]

289

۱۵ اپریل کو انجمن پنجاب پروونشل ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس میاں شاہ دین ہمایوں کی صدارت میں ہوا۔اقبال سیکرٹری مقرر ہوئے۔

اس کانفرنس کا مقصد پنجابی مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور وخوض کرنا تھا۔اُس روز آٹھ قراردادیں منظور ہوئیں جن میں اردو اور فارسی کی حمایت، غیر مسلم اساتذہ کی اکثریت کے پیشِ نظر مسلمان طلبہ کے حقوق کے تحفظ اور دیسی اسکولوں کی تجدید اور ترویج پر زور دیا گیا تھا۔[۲۰۷]

اُس روز انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے 'اصولِ تمدن' کے موضوع پر زبانی تقریر بھی کی جس کے دوران نوٹ لیے گئے تا کہ اُسے انجمن کی روئیداد

میں درج کیا جاسکے۔ یہ تقریر ایک طرح سے 'شکوہ' کا ذہنی پس منظر واضح کرتی ہے۔

اقبال نے کہا کہ کسی تہذیب کے اصولِ تمدن معلوم کرنے کے لیے اُس میں تین پہلوؤں کا تجزیہ کرنا ضروری ہے اور یہ عقل و تدبیر، جذبات اور عمل ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کی مغربی تہذیب کی بنیاد عیسائیت کے اس مفروضے پر تھی کہ انسان فطرتاً برا ہے چنانچہ وہاں نہ آزادانہ تحقیق نہیں تھی نہ اُنہیں فطرت میں حسن دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی وہ انسان کی آزادی کے قائل تھے۔ انسان حاکموں کا غلام تھا۔

جدید تہذیب عیسائیت کے اس مفروضے کے انکار پر مبنی ہے۔ بیکن اور ڈیکارٹ نے عقل کے میدان میں، مارٹن لوتھر نے مذہب کے اور رُوسو نے سیاست کے میدان میں انسان کی آزادی کا اعلان کیا اور بالآخر نپولین نے بادشاہتوں کی بنیادیں ہلا کر جمہوریت کی بنیاد رکھی۔ (نپولین کے بارے میں اگر اقبال نے واقعی یہ کہا تھا اور رپورٹ لکھنے والے کی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں تھا تو حیرت ہے)۔

اقبال نے کہا کہ حال کی مغربی تہذیب صحیح اصولِ تمدن پر مبنی ہے یعنی یہ کہ صحیح علم مشاہدے اور تجربے سے پیدا ہوتا ہے، فطرت میں حسن ہے اور انسان آزاد ہے۔

''اب میں یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ صحیح اصولِ تمدن دنیا کو پہلے پہل کس نے سکھلائے؟'' اقبال نے کہا۔ ''میرا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام اصول جن کے عمل سے تہذیب کی اعلیٰ صورتیں پیدا ہوتی ہیں قرآن سے اخذ کیے گئے ہیں اور قرآن ہی نے اُن تمام اُصولوں کی اشاعت دنیا میں سب سے پہلے کی ہے۔''

اسلام نے رہبانیت کی اور شرک سے منع کیا کیونکہ شرک کی وجہ سے انسان فطرت کو معبود اور خدا تسلیم کرتے ہوئے اُس پر آزادنہ غور کرنے سے اور اُسے اپنے ماتحت لانے کے ذرائع دریافت کرنے سے رُک جاتا ہے۔ اسپین میں مسلمانوں نے قرآن کے اصولوں کی تدوین کی جس کا اثر تمام یورپ پر مرتب ہوا۔

''اگر حال کے مسلمان یہ آرزو رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اسلاف کی طرح دنیا کی مہذب

اقوام میں شمار ہوں تو اُن کو لازم ہے کہ وہ قرآن کو مضبوطی سے پکڑیں اور ان اصولوں پر کاربند ہوں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھلائے ہیں،'' اقبال نے کہا۔ '' زندگی انہی اصولوں پر عمل کرنے سے ہے۔ ان کے مخالف عمل کرنا موت ہے۔ اس وقت جو اسلامی دنیا کی حالت نہایت افسوس ناک ہے، اس کے اسباب پر بھی اگر غور کیا جائے تو یہی معلوم ہو گا کہ مسلمان ان اصولوں سے غافل ہو گئے ہیں جو شارع اسلام علیہ صلوٰۃ والسلام نے اُن کو سکھائے تھے۔''[۲۸]

290

غالباً اگلے دن اسلامیہ کالج کے ریواز ہاسٹل کا وسیع صحن حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ اس دفعہ اقبال نظم پڑھیں گے مگر نظم کا عنوان کیا ہے یا اس میں کیا کہا گیا ہے، یہ بات اقبال کے قریبی دوستوں کو بھی معلوم نہیں تھی۔

اُس وقت بھی جب فقیر سید افتخار الدین جلسے کی صدارت کے لیے اسٹیج پر موجود تھے اور شاید ابتدائی تقریروں کا سلسلہ جاری تھا، اقبال مزے سے مرزا جلال الدین کے گھر بیٹھے تھے اور اُن کے ساتھ شیخ نور محمد تھے جو سیالکوٹ سے بیٹے کی نظم سننے اپنے پوتے اعجاز احمد کے ساتھ آئے تھے۔

''ہم کھانا ختم کر رہے تھے کہ انجمن کے سیکرٹری صاحب مع چند اراکین کے ہانپتے ہوئے تشریف لائے،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''[انہوں نے] پریشانی کی حالت میں کہا کہ نظم کا وقت شروع ہونے والا ہے اور سامعین شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سمجھ گئے کہ اس مرتبہ کوئی معرکۃ الآرا نظم ہو گی جس کے لیے اس قدر پردہ داری سے کام لیا گیا ہے۔''[۲۹]

291

ہاسٹل ریلوے روڈ پر واقع تھا۔ اردگرد زیادہ تر کھلی زمین تھی۔ صرف احمدیہ بلڈنگز کی

چند عمارتیں نظر آتی تھیں۔ سامنے حبیبیہ ہال زیرِ تعمیر تھا۔ اسلامیہ کالج کی عمارت یک منزلہ تھی اور ہاسٹل کا صرف سامنے کا حصہ دو منزلہ تھا۔

شہر کی طرف آنے جانے کا عام راستہ وہ پگڈنڈی تھی جو قریب ہی بہتے ہوئے پانی کے نالے کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ شاید اسی طرف سے اقبال اُس روز جلسے میں شرکت کے لیے ریواز ہاسٹل پہنچے ہوں گے۔ اُنھوں نے شلوار قمیص اور چھوٹا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر تُرکی ٹوپی تھی۔

ہاسٹل کے صحن میں گھاس کا فرش تھا جسے دو گزرگاہیں چوپڑ کی شکل میں کاٹ کر چار حصوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔ دائیں جانب کے آخری حصے میں اسٹیج بنایا گیا تھا جہاں اقبال کے ساتھ اُن کے والد اور اعجاز کو بھی بٹھایا گیا۔

پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دو منزلہ کے برامدے اور چھتوں پر بھی حاضرین موجود تھے۔ اقبال نظم سنانے ڈائس پر آئے تو حاضرین نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ اقبال نے نظم سے پہلے وہی قطعہ سنایا جس میں کچھ اپنا مذاق اڑایا تھا اور کچھ اُس زمانے کے سیاستدانوں پر طنز کیا تھا۔

اس کے بعد نظم کی رونمائی کا سوال اُٹھا۔ اقبال نظم چھپوا کر نہیں لائے تھے کہ اُسے فروخت کر کے انجمن کے لیے چندہ اکٹھا کیا جاتا۔ نظم کا اصل مسودہ موجود تھا، اُسے نیلامی کے لیے پیش کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر نواب ذوالفقار علی خاں نے بولی لگائی اور نظم کے سو روپے دیے۔ اس کے بعد مسودہ بھی انجمن کے حوالے کر دیا۔

اقبال نظم سنانے لگے تو آوازیں بلند ہوئیں کہ نظم ترنم سے پڑھی جائے۔ اقبال نے کہا کہ وہ خود ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ نظم کس طرح پڑھنی چاہیے۔ یہ نظم ایسی ہے کہ اسے گا کر پڑھنے کی بجائے تحت اللفظ پڑھنا مناسب ہوگا۔

''ایک بند سن لینے کے بعد سب کو یقین ہو گیا کہ حضرت علامہ ہی کا ارشاد درست تھا،'' غلام رسول مہر کا بیان ہے جو اُس وقت اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے اور جلسے میں

شامل تھے۔ ''حضرت علامہ نظم پڑھتے جاتے تھے اور پورا جلسہ جو ہزاروں افراد پر مشتمل تھا بالکل حیرت زدہ سا معلوم ہوتا تھا۔ وقتاً فوقتاً واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔'' بہت سے مداح پھول برسا رہے تھے۔

اقبال آواز کے نشیب و فراز سے خوب کام لے رہے تھے۔ ''بات کہنے کی نہیں تُو بھی تو ہرجائی ہے،'' والا مصرع کہتے ہوئے وہ اس طرح آگے بڑھ آئے اور ہاتھ کو جنبش دی جیسے سچ مچ کوئی راز کی بات کہہ رہے ہوں۔

نظم سناتے ہوئے کافی وقت صرف ہو گیا مگر مجمع اس طرح حیرت زدہ ہو کر سن رہا تھا کہ اگر نظم کئی گھنٹے بھی جاری رہتی تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ شیخ نور محمد کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے مگر شیخ عبدالقادر محسوس کر رہے تھے کہ لبوں پر تاثیرِ کلام سے وہی علاماتِ غم تھیں جو بیٹے کے چہرے پر تھیں، جیسے بیٹے نے یہ خصوصیت باپ سے ورثے میں پائی ہو۔

نظم ختم ہوئی تو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے سامعین میں بارہ مولا کے رئیس خواجہ عبدالصمد ککڑو اٹھ کر والہانہ اقبال سے بغلگیر ہوئے، روتے ہوئے اقبال کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک کشمیری دُھسّہ اُن کے کندھوں پر ڈال دیا جسے اقبال نے انجمن کو پیش کر دیا۔ وہ دُھسّہ اُسی اجلاس میں ایک بڑی رقم کے عوض نیلام کیا گیا۔

جلسے کے بعد بھی اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں مجمع لگا کر لوگ نظم کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ مولوی محبوب عالم کسی کو اسٹیشن چھوڑنے گئے تھے اس لیے نظم نہیں سن سکے تھے۔ ''اُن سے سب کہہ رہے تھے کہ اس مرتبہ تو اقبال نے کمال کر دیا، افسوس آپ نہیں تھے،'' حکیم محمد حسن قرشی کا بیان ہے جن کا اُس وقت لڑکپن تھا۔ ''[محبوب عالم] کہہ رہے تھے کہ اقبال کی نظمیں ہمیشہ بلند ہوتی ہیں۔ اقبال کے مشہور عاشق خواجہ عبدالصمد ککڑو... کہہ رہے تھے کہ میرے اقبال کا تخیل بہت بلند ہے۔''[۲۱]

معلوم ہوتا ہے کہ نظم سنانے کے فوراً بعد ہی انہوں نے اپنے پاس موجود نقل میں سے

تین بند نکال دیے۔ 'تھے اشاعت پہ کمر بستہ'، 'پہلے رہنے کو محل رکھتے تھے'، 'صفتِ غنچہ ہے تدبیر'، یہی تین بند ایسے تھے جو نظم کے مجموعی تاثر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ ان میں ایک مصرعہ 'چھوڑیئے کس کو یہاں دوش پہ اب سر بھی نہیں' خالص غالب کے رنگ کا نمونہ تھا مگر نظم کے جذباتی مزاج سے میل نہ کھانے کے علاوہ غالب کے مصرعے 'یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں' سے کچھ زیادہ ہی قریب تھا۔ سب سے بڑی خرابی اس پورے بند میں یہ تھی کہ جس طرح واسوخت میں محبوب کو کسی اور کی طرف مائل ہو جانے کی دھمکی دی جاتی ہے اُسی طرح اس بند میں مسجد کی بجائے بتخانے کی دیوار سے سر توڑنے کی دھمکی تھی جو اُس دعویدار کی زبان سے اچھی نہیں لگ رہی تھی جو توحید کے ساتھ اپنی وابستگی خدا کو بار بار یاد دلا رہا ہو۔

292

اُس زمانے میں کچھ لوگوں نے اس نظم کو خدا سے گستاخی بھی قرار دیا مگر تعریف کرنے والے کہیں زیادہ تھے۔ اقبال کو تعریفی خطوط ملنا شروع ہوئے جن کا سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔

'شکوہ' اقبال کی شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز تھی۔ بلا شبہ اردو میں کسی نظم کو ویسی شہرت حاصل نہیں ہوئی جیسی شکوہ کو حاصل ہوئی۔ پہلے اسے ہندوستان میں مسلمان تہذیب کا مرثیہ کہا گیا مگر بعد میں یہاں تک کہا گیا کہ ساڑھے چھ سو سال قبل تباہ ہونے والے بغداد کا اصل مرثیہ وہ نہیں تھا جو سعدی نے لکھا تھا بلکہ وہاں سے اسلامی تہذیب کا جو زوال شروع ہوا تھا اُس کے شایانِ شان نوحہ یہی تھا۔

اِس طرح اقبال اُس تاریخ سے براہِ راست منسلک ہو گئے جس کا اپنی نظم میں ذکر کیا تھا۔

باب۹

جنت الفردوس

اپریل ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک

پہلا حصہ

1

شیخ نور محمد نے ایک فرمائش کی جو بالآخر ایک بہت بڑے انجام تک پہنچی۔ وہ چاہتے تھے کہ بوعلی قلندر کی طرز پر فارسی مثنوی لکھی جائے۔ اقبال کو بیرسٹری کے ساتھ یہ کام مشکل ضرور معلوم ہوا مگر ابتدا کر دی۔

2

فریاد کے لیے ایک نئی طرز ایجاد کر، جسم کو ہاے اور ہُو سے آباد کر لے۔ تو آگ ہے، دنیا کو روشن کر اور اس آگ سے دوسروں کو بھی جلنے کا موقع دے:

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن
جزم را از ہاے و ہُو آباد کن
آتش استی بزمِ عالم برفروز
دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز

یہ اشعار اقبال نے کسی کاغذ پر درج کیے اور انہیں بھی بیاض کے اُن صفحات میں لکھنا مناسب نہ سمجھا جنہیں ایک طویل اردو نظم کے لیے خالی چھوڑ رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک اپنی اصل فلسفیانہ مثنوی کو اردو ہی میں مکمل کرنے کا خیال اُن کے ذہن میں تھا

اور جس فارسی مثنوی کا آغاز ہوا تھا اُسے کم حیثیت حاصل تھی۔

3

اصل آزادی اپنی مجبوریوں کو پہچان کر اُن کے درمیان میں سے اپنا راستہ نکالنے سے حاصل ہوتی ہے۔ محض اونچے خیالات سے باتیں بنائی جا سکتی ہیں مگر زندگی گزارنے کے لیے حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

اقبال نے یہ بات ایک مختصر اردو نظم میں پھول سے خطاب کر کے کہی:

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

نظم: پھول'

4

اخبار ہندوستان میں اقبال کے ترانے پر اعتراض کرنے والے شاعر کا نام رعنا لکھا تھا مگر ظفر علی خاں کا خیال تھا کہ یہ کسی ہندو کی حرکت ہے۔ اُنہوں نے زمیندار میں للکارا کہ یہ کیسا مسلمان ہے جو اسلام کی بجائے ویدانت کو اپنا مذہب قرار دے رہا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اخبار جنابِ رعنا کی شخصیت پر ہندوستانی مسلمان کی نقاب ڈالنے کی بجائے ''جناب کے نامِ نامی اور اسمِ سامی کو بھی شائع کر دیتا تاکہ ہم ایسے مقدس بزرگ کی زیارت سے بھی فیض یاب ہو سکتے۔''

اقبال پر اعتراض کرنے والوں میں اخبار ہندوستان کا شاعر تنہا نہ تھا۔ چنانچہ پنڈت اُدت نرائن ملا کے یہ اشعار بھی مشہور ہوئے:

ہندی ہونے پہ ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا

اپنی محفل کا رِند پرانا آج نمازی بن بیٹھا
محمل میں چھپا ہے قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبال وہ اب دُنیا میں نہیں[۲]

5

لاہور میں موجود داغ دہلوی کے شاگردوں نے ۲۳ اپریل کو اپنے استاد بھائی ظہیر دہلوی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت اقبال نے کی اور شاید یہ مناسب بھی تھا کیونکہ داغ کے سب سے نامور شاگرد تو وہی تھے۔

ظفر علی خاں اور میر جالب دہلوی نے تقریریں کیں۔ پھر منشی ہدایت اللہ شیدا امرتسری، محمد الدین فوق، منشی وجاہت جھنجھانوی اور خواجہ دل محمد نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اقبال نے جلسے میں بیٹھے بیٹھے مرحوم کی تاریخِ وفات نکالی مگر اُسے نظم نہ کر سکے: زبدۂ عالم ظہیر دہلوی۔ آخر میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے پچھلے برس دکن میں اپنی اور ظہیر کی ملاقات کا حال بیان کیا اور کہا، ''اُن کی ہستی تبرک تھی۔''[۳]

6

ظفر علی خاں نے کرم آباد سے لاہور آ کر ہیرا منڈی میں مکان لیا اور للّی لاج کی محفل میں شریک ہو کر بتایا کہ زمیندار یکم مئی سے لاہور سے نکلا کرے گا تو مرزا جلال الدین والی اسلام کلب میں اُنہیں بھی مدعو کیا گیا۔

''پنجاب مسلم کلب میں جب میاں محمد شفیع، شیخ محمد اقبال اور مرزا جلال الدین نیز دیگر احباب نے پوچھا کہ مکان کہاں لیا اور ہم نے پتا بتایا تو سب کے سب مسکرا دیے،'' ظفر علی خاں نے یکم مئی کو لاہور سے زمیندار کے پہلے اداریے میں لکھا۔ ''اِس معنی خیز تبسم کا جواب ہمارے پاس بھی موجود تھا:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[۴]

7

مئی میں یا اس سے پہلے کسی وقت اقبال کو ایما کی طرف سے کچھ خوبصورت ٹائیاں یا اسکارف موصول ہوئے اور اُس کے بعد ایک پوسٹ کارڈ ملا جس کے جواب میں ۱۱ مئی کو اُنہوں نے لکھا، ''میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کا دوبارہ سفر کروں تاکہ آپ سے مل سکوں اور میں نہیں جانتا کہ یہ کس دن ممکن ہو سکے گا مگر جیسی خوفناک جرمن زبان میں لکھتا ہوں اُن کی وجہ سے میرے خطوط آپ کو بہت محظوظ کرتے ہوں گے۔''

اُنہوں نے ٹائیوں کا شکریہ بھی ادا کیا اور ایک طویل خط کی درخواست بھی کی۔ ہمیشہ کی طرح اِس دفعہ بھی اقبال نے پروفیسر صاحبہ کی خیریت دریافت کی تھی۔

8

مئی ۱۹۱۱ء میں مولانا ظفر علی خاں نے اقبال کے مسلم کمیونٹی والے لیکچر کا ترجمہ 'ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر' کے عنوان سے برکت علی محمڈن ہال لاہور میں ایک جلسۂ عام میں پڑھ کر سنایا۔ اقبال بھی موجود تھے۔[۵]

9

ظفر علی خاں کا کیا ہوا اقبال کے لیکچر کا ترجمہ مرغوب ایجنسی لاہور سے خوبصورت طباعت کے ساتھ شائع ہوا۔

10

اقبال نے آفتاب کو سیالکوٹ کے مشن اسکول سے نکال کر قادیان کے تعلیم الاسلام اسکول میں داخل کروایا۔[۶]

11

ظفر علی خاں کے ساتھ ایک روز اُن کے دس گیارہ برس کے لڑکے حامد علی خاں بھی اقبال کے پاس آئے۔ ''سادہ سے مکان میں سادہ سا بستر لگا تھا،'' حامد علی خاں کا بیان ہے۔ ''بستر میں صرف شُتری رنگ کے دو کمبل تھے۔ سوچا کہ بیرسٹر ہیں اس لیے رضائی نہیں اوڑھتے لیکن یہ اُن کی زندگی کی سادگی تھی جس کا احساس بعد میں ہوا۔''[۷]

12

اُن دنوں ظفر علی خاں سے گہری چھن رہی تھی۔ وہ شاہ محمد غوث کی درگاہ کے قریب ایک نئی عمارت کی دوسری اور تیسری منزل پر کرائے پر رہتے تھے۔ ایک شام اسلامیہ کالج کے کچھ طالب علم مغرب کے بعد دوسری منزل پر پہنچے تو اقبال بھی موجود تھے۔

''اقبال نے شلوار پہن رکھی تھی،'' طلبہ میں سے ایک کا بیان ہے جس کا نام غلام رسول مہؔر تھا۔ ''سفید قمیص، اوپر چھوٹا کوٹ، سر پر لنگی بندھی تھی، ہاتھ میں چھڑی تھی۔۔ ٹہلتے ٹہلتے مولانا ظفر علی خاں سے ملنے آ گئے ہوں گے۔۔۔''

اقبال جو کچھ کہہ رہے تھے اُس کا مفہوم یہ تھا کہ ظفر علی خاں، آپ کے اخبار میں کانپور کے فلاں صاحب کی جو لمبی لمبی نظمیں چھپتی ہیں، بعض اوقات خیال آتا ہے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لوں اور کانپور پہنچ کر ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں، پھر سوچتا ہوں کہ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے کانپور تک تھرڈ کلاس کا کرایہ خرچ کرنا بھی روپے کا ضیاع ہوگا۔

''اس شاعر کی نظمیں بہت معمولی ہوتی تھیں اور عموماً زمیندار کا پورا پہلا صفحہ گھیر لیتی تھیں،'' مہؔر کا بیان ہے۔[۸]

13

نواب ذوالفقار علی خاں کے اعزاز میں لاہور میں پارٹی دی گئی۔ اُس میں اقبال نے فارسی شعر کہا جس کا مطلب تھا کہ پٹیالہ انہی کے چہرے کے نُور سے روشن ہے، ہندو بھی

ذوالفقارِ علی پر ناز کر رہا ہے:

پٹیالہ روشن است از انوارِ روئے اُو
ہندو بہ ذوالفقارِ علی ناز می کند

نواب ذوالفقار علی نے کہا کہ انہیں زیادہ تر کامیابی جوگندر سنگھ کی مدد سے ہوئی ہے جو وہاں ہوم منسٹر تھے۔ ظفر علی خاں نے اس اقبال ہی کی زمین میں ایک اور شعر کا اضافہ کر دیا جس کا مطلب تھا کہ نواب ذوالفقار علی آئینہ ہیں اور جوگندر ان کا جوہر ہیں، ایک سے ساز ہے اور دوسرے سے سوز ہے:

جوگندر است جوہر و نواب آئینہ
یک سوز می کند و دگر ساز می کند۹

14

نوق کا کشمیری میگزین ختم ہو چکا تھا۔ جون میں اُنہوں نے مشاہیرِ کشمیر کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ اس میں اقبال کے حالات بھی شامل تھے۔۱۰

15

جون کے مخزن میں 'شکوہ' شائع ہوئی۔

16

معلوم ہوتا ہے کہ موسمِ گرما میں ایک دفعہ پھر اقبال کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی بات نکلی۔ انہیں کسی دوست نے مرتب کیا تھا اور کتابت بھی شروع ہو گئی تھی مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود کچھ عرصہ بعد عطیہ فیضی کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے اقبال نے لکھا، ''اشاعت کے لیے انتخاب میرے لیے ایک مشکل مرحلہ ہے۔ گذشتہ پانچ

سال سے میری نظمیں بیشتر نجی نوعیت کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو میں نے بالکل ہی تلف کر ڈالی ہیں، اس ڈر سے کہ کہیں کوئی انہیں چرا کر شائع نہ کر دے، بہر حال میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔''

شاید اُنہی دنوں ایک نئی کاپی خرید کر اپنی نظمیں صاف کر کے اُس میں درج کرنا شروع کیں۔ ایک غزل، شکوہ اور دو قطعات درج ہو گئے مگر نئی نظمیں اُسی پرانی بیاض میں لکھی جاتی رہیں جس میں ایک طویل اُردو مثنوی کے لیے کئی صفحات خالی چھوڑے گئے تھے۔

17

عطا محمد کے گھر ایک اور لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اقبال گرمیوں میں سیالکوٹ گئے تو معلوم ہوا ان کی چھوٹی بہن کریم بی بی نے لڑکی کا نام مبارکہ تجویز کیا تھا۔ اقبال نے وسیمہ تجویز کیا اور یہی نام رکھا گیا۔"

18

اقبال کو عطیہ فیضی کا خط موصول ہوا جس میں اُنہوں نے اقبال کی نظموں کی تعریف کی تھی، کچھ نظمیں یا پھر شاید ساری نظمیں مانگی تھیں اور کہا تھا کہ اقبال ان کی خوشی کے احترام میں یہ نظمیں روانہ کر دیں۔

اقبال نے خاص طور پر وہ نظمیں تلاش کرنے کی کوشش کی جو اُنہوں نے بمبا دلیپ سنگھ کی چائے کی دعوت کے دوران لکھی تھیں اور جب اُن کی کوئی کاپی اپنے پاس نہ ملی تو اپنے دوست امراؤ سنگھ کو لکھا۔

19

۷ جولائی کو صبح کچہری جانے سے پہلے اقبال نے عطیہ فیضی کے خط کا جواب دیا اور یوں عطیہ کے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا جس میں پہلے جیسی گرم

جوشی نہیں تھی مگر ایک ایسا ٹھہراؤ ضرور تھا جس نے ان دونوں کی دوستی کو ہمیشہ قائم رکھنے میں مدد دی۔

''مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کے نوازش نامے کی طرف جو مجھے کچھ عرصہ ہوا ملا تھا، اب تک توجہ نہ دے سکا،'' اقبال نے لکھا تھا۔ ''میں ان دنوں بہت ہی پریشان رہا ہوں۔ میری بدقسمتی ایک وفادار کتے کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں نے محترمہ کو پسند کرنا سیکھ لیا ہے، اس کی نہ تھکنے والی وفاداری کے سبب...''

اقبال نے نظموں کے مجموعے کی ترتیب کے بارے میں انہیں اطلاع دی، زیرِ تصنیف مثنوی کے کچھ اشعار بھیجے، رسالہ ادیب میں شائع ہونے والی غزل ارسال کی اور بتایا کہ اُنہوں نے اپنے دوست امراؤ سنگھ کو لکھا ہے کہ وہ مس گوٹسمین والی نظم کا انگریزی ترجمہ ارسال کریں۔ ''اب دس بجے ہیں اور میرا خیال ہے مجھے جانا چاہیے...''[۱۲]

20

اِس کے بعد کسی وقت اقبال نے اپنی طویل نظم کو اُردو میں لکھنے کا خیال ترک کر دیا اور اُس نظم کے خیالات کو بھی فارسی مثنوی ہی میں بیان کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔[۱۳]

''میں نے اپنی مثنوی ابتدا میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ [کم سے کم لوگوں] تک پہنچیں... بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔''

'نورِ محمدی' والی نظم کو دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اقبال کیوں چاہتے تھے کہ اُن کے خیالات کم سے کم لوگوں تک پہنچیں۔ اُس وقت اقبال کے ذہن میں جو خیالات آ رہے تھے وہ واقعی اس قدر صوفیانہ تھے کہ شاید عام مسلمان اُن کی اشاعت

سے خوش نہ ہوتے۔[14]

21

مس گوسمین والی نظم مل گئی۔ بیاض میں طویل اردو مثنوی کے لیے جو صفحے خالی چھوڑے ہوئے تھے اُن میں یہ نظم درج کر دی۔

22

غزل

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو
تُو خاک کی مٹھی ہے ہے اجزا کی حرارت سے
برہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو
تُو جنسِ محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اِس دیس میں اَرزاں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پر عریاں ہو
اے رہروِ فرزانہ، رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گرِ ساماں ہو[15]

23

اقبال نے اکبر الہ آبادی کے اُس قطعے کی پیروی میں کچھ اشعار لکھے جو چار سال پہلے مخزن میں شائع ہوا تھا۔

یہ نظم مکمل نہ ہو سکی اور نا تمام نظم کے اشعار کے عنوان سے ظفر علی خاں نے جولائی کے پنجاب ریویو میں اُس کے چھ اشعار شائع کیے:

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں[۱۶]

شاید انہی دنوں اقبال کی طبیعت اکبر الہ آبادی کے رنگ میں کچھ لکھنے کی طرف پہلے پہل مائل ہوئی۔[۱۷]

24

حقیقت یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی اور اقبال کے خیالات میں بنیادی فرق تھا مگر بڑی مشکل سے ایک رہنما بزرگ ہاتھ آیا تھا اور وہ اسے کھونا نہ چاہتے ہوں گے۔ وہ اُن کے خطوط کو سنبھال کر رکھتے تھے اور بار بار پڑھا کرتے تھے مگر اکبر مشرق کے اُس قدیم سکون کے نمائندہ تھے جس میں دنیوی زندگی کی اہمیت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ انسان اسے دھوکہ سمجھ کر اس کا یقین کرنے سے بچتا رہے اور آخر موت کے دروازے سے گزر کر اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

یہ انداز جو اقبال کے نظریاتی رجحان سے بالکل مختلف تھا اکبر الہ آبادی کی اُن دنوں کی غزلوں میں بھی پایا جاتا تھا جب اُنہوں نے طنزیہ شاعری شروع نہیں کی تھی:

دُنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اس منزلِ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث
سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں

25

۳۱ جولائی کی رات ظفر علی خاں اقبال کے گھر آئے ہوئے تھے۔ دونوں نے مل کر نظم لکھی جس میں شاہِ انگلستان کے متوقع دربار کا ذکر بھی ہوا اور مغرب زدہ مسلمانوں سے بیزاری کا اظہار بھی:

مبارک ہے یہ جشنِ تاجپوشی جس کے صدقے میں
وہ مسجد تک چلا آیا کلب گھر کا جو رہرو ہے

نظم بنیادی طور پر ظفر علی خاں کے ہنگامی انداز میں تھی۔[۱۸]

26

اقبال نے اپنی نئی بیاض میں ایک مزاحیہ نظم کی داغ بیل ڈالی مگر صرف ساڑھے سات اشعار کہہ سکے اور پھر نظم نامکمل ہی رہی:[۱۹]

کہا یہ ایک مرے مہرباں نے کل مجھ سے
پلٹ گئے ہیں خیالات ہر مسلماں کے
غضب کیا ہے زمیــــــــــــــــــــندار کے اڈیٹر نے
سکھائے قطرے کو انداز اس نے طوفاں کے

27

حسن نظامی حجاز، فلسطین اور شام کے مقدس مقامات کی زیارت کو گئے ہوئے تھے۔ مدینہ منورہ میں بھی حاضری دی اور موسمِ سرما کے بعد کسی وقت واپس آئے تو اپنے حلقہ نظام المشائخ کی ترویج میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئے۔ اقبال کو بھی دعوت دی گئی

کہ اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔

''آرڈر قائم کرنے کا خیال تھا اور اب تک ہے،'' اقبال نے ایک خط میں کسی سے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا، ''مگر اس راہ میں مشکلات بیحد ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مذاق کے لوگ کہاں ہیں۔ بہر حال میں ہم خیال پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔''[۲۰]

28

''دلآویز نظم، دلکش آواز، قومی امداد، ہم خرما و ہم ثواب'' کے عنوان سے کامریڈ میں پورے صفحے کے اشتہار شائع ہو رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے گراموفون کمپنی سے اقبال کے ملّی ترانے کے ریکارڈ بنوائے تھے۔ گانے والا علی گڑھ کا طالب علم تھا جس نے معاوضہ وصول کرنے کو اپنے وقار کے منافی سمجھا تھا چنانچہ رائلٹی مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے نام کر دی گئی تھی۔[۲۱]

29

۲۹ ستمبر کو اٹلی نے طرابلس اور اس کے نواح پر حملہ کر دیا جو شمالی افریقہ میں عثمانی سلطنت کے آخری مقبوضہ جات تھے۔ اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی نے اپنی حکومت کے اس اقدام کی مخالفت کی اور جن سوشلسٹوں کو جیل ہوئی اُن میں ایک اٹھائیس سالہ نوجوان شامل تھا جس پر اشتراکی تحریروں کے علاوہ نیٹشے کا اثر بھی تھا اور جس کا نام بنیٹو مسولینی تھا۔

اُس زمانے میں جب جنگ کو صرف اپنے مفادات کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا اور ابھی دنیا کو یہ بات سمجھنے میں کچھ برس باقی تھے کہ طاقت کے ساتھ ساتھ حقوق بھی اہمیت رکھتے ہیں، برطانیہ اور فرانس نے فوراً اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا اور چونکہ یہی ممالک مصر اور تیونس کی نگرانی کرتے تھے لہٰذا ترکی سے آنے والے سپاہیوں کے

لیے خشکی کے راستے دشوار ہو گئے۔ سمندری راستوں کی اٹلی پہلے ہی ناکہ بندی کر چکا تھا چنانچہ ترک سپاہی اور سپہ سالاروں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بھیس بدل کر مصر پہنچیں اور خفیہ طور پر طرابلس کے میدانِ جنگ تک پہنچیں۔

جو سپاہی اس طرح طرابلس پہنچ رہے تھے انہیں میں وہ نوجوان افسر بھی شامل تھا جس نام مصطفیٰ کمال تھا اور جسے ابھی تک اس کے دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

30

کوئی مولوی کرم الٰہی صوفی تھے جنہوں نے ہندوستان میں سلاطینِ دہلی کے عہدِ حکومت کی تاریخ لکھی تھی اور اس میں مسلمان بادشاہوں کے کارنامے بیان کیے تھے۔ تبصرے کے لیے اقبال کو بھیجی گئی تو اُنہیں بہت پسند آئی۔

اُن کے خیال میں مولوی صاحب کا اندازِ تحریر اس بات کا ثبوت تھا کہ ''ابھی قوم میں ایسے لوگ زندہ ہیں جو اپنی تاریخ کو غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔''

مصنف کے نام خط میں اُنہوں نے لکھا کہ اس کتاب کو پڑھ کر مسلمان وہ اصول سیکھ سکتے ہیں ''جن پر عمل کرنے سے حجاز کے صحرانشین تمیں ہی سال کے اندر شتربانی سے جہاں بانی تک پہنچ کر اقوامِ قدیمہ کی تہذیب کے وارث اور تہذیب جدید کے بانی بن گئے۔ تاریخ کا مقصد اگر اخلاقی ہے اور میرے خیال میں تاریخ کا یہی مقصد ہونا چاہیے تو آپ کی تصنیف اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے...

''قومیت کا احساس جس کو بالفاظِ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیے قومی زندگی کے لیے ضروری ہے اور جن وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ بھی قومی حیات کے لیے ضروریات میں سے ہیں۔ پس اس اعتبار سے آپ کی کتاب کا مطالعہ ہر مسلم پر واجب ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلم خاندان اس کتاب کے پڑھنے سے مستفید ہو گا۔''

کرم الٰہی نے خط مخزن کو بھجوا دیا تاکہ اسلامی تاریخ عہدِ افغانیہ کے

اشتہار کے طور پر شائع کر دیا جائے۔[۴۴]

31

اُن دنوں زمیندار کے 'عید نمبر' کے لیے جو نظم اقبال نے لکھی اُس میں بھی یہی خیالات جھلک رہے تھے۔

پہلے بند میں یہ بات دہرائی گئی تھی ہلال مسلمانوں کا قومی نشان ہے لہٰذا عید کے چاند سے اُنہیں ایک خاص تعلق ہے۔ اس بند کا ہر شعر مثنوی کی طرح آپ میں ہم قافیہ تھا۔ دوسرے بند کی ہیئت الگ تھی اور یہ ترکیب بند تھا جس میں قوم کا ماتم کیا گیا تھا۔ چاند چونکہ ساری دنیا پر چھا نکلتا ہے لہٰذا کسی ایک **ملک** میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی زبوں حالی اُسے دکھائی دے سکتی تھی:

قافلے دیکھ اور اُن کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زُناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا نظارہ بھی کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اُس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن

اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیّاری بھی دیکھ
مکر کے پھندے میں شہبازِ مراکش آ گیا
اُمتِ عیسیٰ کا آئینِ جہاں داری بھی دیکھ
صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

نظم بغرّہ شوال[۲۳]

دوسری قوموں کے خلاف ایسی تلخی اقبال کے یہاں پہلے نظر نہیں آئی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ کسی تعمیری خیال کی بجائے یہ شکایت زیادہ نظر آ رہی تھی کہ دُوسرے ہم سے آگے کیوں بڑھے ہوئے ہیں۔

اُس زمانے میں یہ نظم بہت مقبول ہوئی جس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ ہندوؤں میں تقسیمِ بنگال ہی کے زمانے سے انگریزوں کے خلاف عملی اقدامات شروع ہو گئے تھے اور اگرچہ اُس وقت اُن کی صورت دہشت گردی سے مختلف نہ تھی مگر عام شہری کے قومی جذبے کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اِس کے برعکس مسلمانوں کے رہنما ابھی تک اُسی پالیسی پر قائم تھے جو سر سید احمد خاں نے پچھلی صدی میں وضع کی تھی چنانچہ نئی نسل کے جوشیلے مسلمان بڑی بے بسی اور شرمندگی سے نواب وقار الملک کی وہ تقریریں سنتے تھے جن میں انگریزوں سے وفاداری کے عہد دہرائے جاتے تھے۔

جب دُوسرے آگے بڑھتے نظر آئیں مگر اپنے لیے عمل کے راستے ہم نے خود ہی بند کر رکھے ہوں تو اسی قسم کی جھلاہٹ جنم لیتی ہے جیسی اقبال کی اس نظم میں دکھائی دے رہی تھی۔

دُور سے دیکھنے والوں کو اُس میں قومی غیرت نظر آئی مگر کم سے کم عطیہ فیضی ضرور

محسوس کر رہی تھیں کہ یہ بھی وہی خودترسی ہے جس کے تحت اقبال پچھلے برس تک ایسے خطوط لکھتے رہے تھے کہ دنیا میں بالکل اکیلا ہوں مگر مرنے کے بعد میری قدر ہوگی، خدا سے جواب طلب کروں گا، وغیرہ وغیرہ۔ جسے اقبال کی نئی قومی شاعری کہا جا رہا تھا اُس کا پچھلی نظموں سے موازنہ کرنے پر عطیہ نے اُس میں تلخی محسوس کی اور اُسے ایک طرح کی قنوطیت کہنے پر مجبور ہوئیں۔[۴۳]

32

ظفر علی خاں سے معلوم ہوا کہ اکبر الٰہ آبادی کو چوٹ آئی ہے۔ اقبال کو خیال آیا کہ عیادت کا خط لکھا جائے۔

اگلے روز ۶ اکتوبر کو خود اکبر کا خط موصول ہو گیا جس میں انہوں نے 'ناتمام نظم کے اشعار' پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اکبر کے نام اقبال کے جتنے خطوط دستیاب ہیں اُن میں سے پہلا اسی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے خط محفوظ نہیں ہیں۔

''میں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں،'' اقبال نے لکھا۔ ''خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔''

اپنی تنہائی کا ذکر، جو بہت عرصے تک اپنے خطوط میں اقبال کا محبوب موضوع رہنے کے بعد آخر کار ان کی شاعری کا خاص جزو بنا وہ یہاں بھی موجود تھا، ''لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے...''

اقبال نے اکبر سے درخواست کی تھی کہ زمیندار میں اُن کے ہلالِ عید والے اشعار بھی پڑھیں۔ ''میں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ترکی واٹلی کی جنگ نے اُس کی تصدیق کر دی ہے۔ اگر زمیندار اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے بھجوا دوں

گا۔"

33

اُسی روز جنگِ طرابلس کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے بادشاہی مسجد میں ایک جلسہ تھا، اور اقبال کو نظم سنانی تھی۔

وہ 'عندلیبِ حجاز کی نذر' کے عنوان سے ایک مختصر سی نظم لے کر آئے اور کمر پر ہاتھ رکھ غالباً ترنم سے پڑھنا شروع کی تو کسی نے جلسے کی تصویر کھینچ لی اور یہ اقبال کی نظم پڑھتے ہوئے اُتاری گئی واحد تصویر ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اِسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے جلسوں میں حاضرین کی تعداد جو ہزاروں میں بتائی جاتی ہے اُس میں مبالغہ نہیں ہے۔

اقبال نے پہلے بھی ایسی نظمیں لکھیں تھیں جن میں زمین کو چھوڑ کر آسمانوں کا خیالی سفر کیا تھا مگر اِس دفعہ تیسرے ہی شعر میں فرشتے اُنہیں رسول اللہ کے حضور لے گئے اور آپؐ نے دریافت کیا کہ دنیا کے باغ سے خوشبو کی طرح نکل کر آتے ہوئے وہ اپنے رسولؐ کی خاطر کیا تحفہ لے کر آئے ہیں؟

اِنہوں نے عرض کی:

"حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنّت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں"

نظم میں صرف بارہ شعر تھے جن کے آخر تک پہنچتے ہوئے وہ خود بھی رو رہے تھے اور سننے والوں پر بھی ایسی کیفیت طاری تھی کہ آج تک سینہ بہ سینہ یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ آخری مصرعہ پڑھتے ہوئے اقبال نے فرطِ جذبات سے اپنا ہاتھ کھول دیا جیسے واقعی اپنی ہتھیلی پر رکھا ہوا آبگینہ پیش کر رہے ہوں اور اس کے ساتھ ہی سننے والوں نے بے خود ہو کر جو کچھ جس کی جیب میں تھا وہ نکال کر طرابلس فنڈ کے لیے پیش کر دیا۔

اتنی مختصر نظم سے اتنے بڑے مجمع پر ایسا تاثر قائم کرنا ایک فنکار کی خود اعتمادی کی انتہا تھی۔[۲۵]

34

دو تین روز بعد اقبال کی محفل میں کسی نے ذکر چھیڑا کہ بادشاہی مسجد والے جلسے میں خیریت رہی ورنہ ڈر تھا کہ کہیں لوگ اقبال کی نظم سے جوش میں آ کر ہنگامہ نہ کر دیں۔ اقبال نے کہا، ابھی قوم تیار نہیں ہے۔[۲۶]

35

اکبر الہ آبادی نے اقبال کی ہلالِ عید والی نظم پڑھی۔ متاثر ہوئے۔ احباب کو سنائی جن میں سے ایک نے نقل مانگی۔ شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ یعنی تسبیح کے دھاگے کا ٹوٹنا اور پختہ زُناری یعنی برہمن کا اُس دھاگے کو مضبوط رکھنا جو وہ مذہباً گلے میں ڈالتے ہیں، اکبر کے خیال میں اقبال ہی کا حصہ تھا۔

خاص طور پر کافروں کی مسلم آئینی والا مصرعہ پسند آیا۔[۲۷]

36

زمیندار میں خبر شائع ہوئی کہ اکبر الہ آبادی اُردو میں کوئی شاہنامہ لکھ رہے تھے جو ضائع ہو گیا اور صرف نمونے کے چند اشعار قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

اقبال اُن اشعار سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایک مصرعے کے بارے میں ان کا خیال تھا فردوسی اور نظامی بھی اس پر رشک کرتے:

رگِ موج سے خون جاری کریں[۴۹]

37

انجمن حمایت اسلام نے بھی دہلی دربار کے سلسلے میں ایک ایڈریس پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

۲۲ اکتوبر کو جنرل کونسل کے اجلاس میں اس ایڈریس کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس کے سات ارکان میں اقبال بھی شامل تھے۔[۴۹]

38

طرابلس کی جنگ سے گویا اردو صحافت میں انقلاب آ گیا تھا۔ اخباروں کی فروخت بڑھ گئی تھی۔

نومبر میں طرابلس کے کسی معرکے میں ترکوں کی فتح کی خبر آئی اور اردو اخباروں میں اس طرح شائع ہوئی جیسے جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہو اور بالآخر ترک ہلال نے اٹلی کی صلیب کو شکستِ فاش دے دی ہو۔

39

چند روز بعد اقبال کو اکبر الہ آبادی کے دو خطوط ملے جن میں غالباً ترکوں کی شاندار فتح کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

''ترکوں کی فتح کا مژدۂ جانفزا پہنچا،'' ۹ نومبر کو اقبال نے جواب لکھتے ہوئے اپنی رو میں تحریر کیا۔ ''مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنا کا احساس

اپنے دل میں کرتا ہوں گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔''

اقبال نے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ دہلی دربار کے موقع پر دہلی آئیں گے اور اُن کے صاحبزادے ہاشم کے لیے دعائیں لکھتے ہوئے اُسے پیغام دیا تھا، ''اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرق دنیا میں نہ رہیں گے اور آیندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے۔ میاں ہاشم! اب وقت ہے اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیرِ مشرق سے لے سکتے ہو لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمہاری روح لذت اٹھائے گی۔''

پیرانِ مشرق سے مراد بزرگ تھے جنہوں نے قدیم اسلامی تہذیب کے سائے میں جنم لیا تھا اور یہ تہذیب اب ختم ہو چکی تھی۔ نئی دنیا میں پیدا ہونے والے جن میں خود اقبال بھی شامل تھے اپنی محنت سے اس تہذیب کا شعور حاصل کر سکتے تھے مگر یہ کوشش اُس قدرتی اثر کا بدل نہیں ہو سکتی تھی جو کسی تہذیب سے مخصوص ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی اس طرح چلا جاتا ہے جیسے محفوظ کی ہوئی پرانی شراب آہستہ آہستہ دنیا سے ختم ہو جاتی ہے۔

وقت کے قافلے کو واپس نہیں لوٹایا جا سکتا۔

40

۷ دسمبر کو بادشاہ جارج پنجم اور ملکہ الیگزانڈرا بحری جہاز سے بمبئی پہنچے اور ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔

''دیگر باشندگانِ ہند بالعموم اور مسلمان بالخصوص جو مذہباً اپنے ولی نعمت تاجدار کو ظلِ اللہ فی الارض خیال کرتے ہیں اور اس کے دیدار کو روحانی انبساط سمجھتے ہیں، بیتابانہ ہمہ تن چشم براہ تھے کہ دیکھیے کب وہ ذاتِ قدسی صفات اپنے قدومِ میمنت لزوم سے تیرہ خاکِ ہند کو منور کرتی اور اپنے دیدارِ فرحت آثار سے اُس کے اہالیان کی امیدوں کے

کنول کھلاتی ہے...''

مخزن کا ایک مضمون نگار۴۰

41

اقبال بھی دہلی دربار میں شرکت کے لیے گئے۔ سر لوئی ڈین نے کوئی شاہی میلہ قائم کیا تھا جس میں تاجپوشی کی نظموں کا انتخاب کرنے کے لیے ایک مشاعرہ ہوا جس کا صدر اقبال کو بنایا گیا۔ انہوں نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی نظم کو سب سے بہتر قرار دیا جس پر کیفی کو تمغہ اور سرٹیفکیٹ ملا۔

42

اقبال اپنی زندگی کو ایک ایسے رباب سے تشبیہ دے رہے تھے جس کی آغوش میں ہر طرح کے نغمے موجود ہوں مگر کوئی مضراب اس ساز کو بجانے والا نہ ہو۔ مگر پھر آسمان سے کسی حور کی سانس آہستہ سے آ کر اسے چھیڑ دیتی ہے۔

مگر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی
سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی
چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات
جس سے ہوتی ہے رہا رُوحِ گرفتارِ حیات
نغمۂ یاس کی دھیمی سے صدا اُٹھتی ہے
اشک کے قافلے کو بانگِ درا اُٹھتی ہے
جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

نظم میں چار چار اشعار کے دو بند تھے۔ عنوان 'نوائے غم' تھا۔ لفظ 'بانگِ درا' جو اس سے پہلے چین و عرب ہمارا والے ترانے میں بھی آ چکا تھا یہاں ایک دفعہ پھر استعمال

ہوا۔[۳۱]

43

معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملاقات میں اقبال نے سروجنی نائیڈو سے اپنی نظم 'نوائے غم' کا ذکر کیا مگر خود سنانے کی بجائے وعدہ کیا کہ عطیہ فیضی دکھائیں گی۔ اس کے بعد انہوں نے نظم عطیہ فیضی کو غالباً دسمبر میں کسی وقت ارسال کی۔[۳۲]

44

دہلی دربار میں بادشاہِ وقت کی زبان سے دو بہت اہم اعلان ہوئے۔ پہلا اعلان یہ تھا کہ ہندوستان میں تاجِ برطانیہ کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کیا جا رہا ہے۔ دوسرا اعلان یہ تھا کہ تقسیمِ بنگال منسوخ کر دی گئی ہے۔

تقسیمِ بنگال کی تنسیخ سے مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی اور جو سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے ان کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست اپنی پرانی روش سے ہٹ کر اپنے حقوق کے مطالبے میں زیادہ بیباک ہو جائے گی۔ انگریزوں کی سرپرستی کا آسرا ختم ہو گیا تھا۔

45

مرزا جلال الدین کے گھر رقص و سرود کی محفل برپا تھی۔ اقبال پر وجد کی وہی کیفیت طاری ہوئی جس میں وہ شعر کہا کرتے تھے مگر جذبات ایک ایسی بحر پر جا نکلے جس میں انہوں نے پہلے کبھی مشق نہیں کی تھی۔

بحر بڑی مترنم تھی اور سازوں کے ساتھ جب یہ مصرعے پہلی بار محفل میں گونجے ہوں گے تو سماں بندھ گیا ہو گا:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے[۴۴]

نظم اُس وقت مکمل نہیں ہوئی مگر بعد اقبال نے مزید اشعار کا اضافہ کیا:

پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلیٰ دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
آتش عشق جس کی کانٹوں کو جلا ڈالے
اس بادیہ پیما کو وہ آبلۂ پا دے
رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر
خودداریِ ساحل دے، آزادیِ دریا دے
اِس دَور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
میں بلبلِ نالاں ہوں اِک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

اِس نظم میں سوز و گداز کی غیر معمولی کیفیت تھی اور اقبال نے بہت اچھا کیا کہ اس کا نام صرف 'دعا' رکھ دیا۔ یہ دنیا بھر کے دعائیہ ادب کے چند بڑے شاہکاروں میں سے ایک ہے اور اس کے بے پناہ تاثر کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ استعارے اور ترکیبیں

جنہیں صدیوں کی فارسی، عربی اور اردو ادب کی روایات نے عشقِ مجازی سے منسوب کر رکھا تھا اور جن کی طرف ہلکا سا اشارہ ہی زبردست خواہشات کو مہمیز کرتا تھا اقبال نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ اُنہیں ایک نئے احساس میں بدل دیا۔

قلب کا گرما جانا، روح کا تڑپ اٹھنا، شوقِ تماشا، دیکھنا، دکھانا، محمل، شاہد، لیلیٰ اور آہو روحانی استعارے ہیں مگر اس دعا میں یہ انسان اور اُس کے معبود کے درمیان تعلق کو بھی محسوس کرواتے ہیں اور اُس معبود کے حوالے سے اپنی قوم کے ساتھ ایک ایسے رشتے کا شعور بھی دیتے ہیں جس کی بنیاد طاقت اور مصلحت پر نہیں بلکہ عشق اور محبت پر قائم ہے۔

انسان، خدا اور معاشرے کی یہ تکون اِس نظم میں جمالیاتی حقیقت بن کر ابھرتی ہے اور کائنات کی مادّی حقیقتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُنہیں ایک روحانی اساس عطا کر دیتی ہے۔

46

عطیہ فیضی کا خط موصول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے لکھا تھا کہ سروجنی نائیڈو اردو شاعری کی سمجھ نہیں رکھتیں۔ اقبال نے نظم 'دعا' ایک کاغذ پر خوشخط لکھی اور انگریزی میں لکھا، ''اگر آپ سمجھتی ہیں کہ مسز نائیڈو اردو شاعری کی قدر نہیں کرسکتیں تو اُنہیں یہ نظم نہ دکھایئے۔'' خط میں اُنہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''یہ کچھ اور اشعار ہیں جو پرسوں صبح چار بجے کہے۔ اس بحر میں پہلے کبھی کچھ نہیں کہا ہے۔ یہ بحر نہایت مترنم ہے۔ کاش میں وہاں ہوتا اور آپ کو اور بیگم صاحبہ کو گا کر سناتا۔'' یہ نظم 'دعا' کی طرف اشارہ تھا۔[۴۴]

کاغذ کے دُوسری طرف اُنہوں نے پھر ۱۴ دسمبر کی تاریخ ڈال کر تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بارے میں خیالات درج کیے، ''بنگالی سمجھتا ہے کہ اُسے بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے مگر وہ یہ نہیں دیکھ رہا کہ اس کی اہمیت صفر کے درجے تک گھٹا دی گئی ہے۔ اس بارے میں دو شعر ملاحظہ ہوں:

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاجِ شاہی آج کلکتہ سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جُوتی اور پگڑی چھن گئی''

اکبر الہ آبادی کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش میں ایسی کامیابی اقبال کو بہت کم نصیب ہوئی۔

48

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اُسی شہر میں ہو رہا تھا جو کبھی مسلمانوں کی سلطنت کا مرکز رہا تھا اور اب پھر دارالحکومت قرار پایا تھا۔ دربار میں شرکت کے لیے ہندوستان بھر کے راجے مہاراجے آئے تھے اور اُن میں سے بہت سے کانفرنس کی درخواست پر رُک گئے تھے تا کہ اجلاس میں شریک ہو جائیں۔

اقبال جس روز لاہور سے روانہ ہو رہے تھے اُس دن گرامی کا خط ملا جس میں دہلی کے بارے میں گرامی کے کچھ فارسی اشعار بھی تھے۔

49

کانگریس کا سالانہ اجلاس ۲۶ سے ۲۸ دسمبر تک کلکتہ میں ہوا۔ اجلاس کے دوسرے روز رابندرا ناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا بنگالی گیت پڑھا گیا: جنا گنا منا...

اے ذہنوں پر حکومت کرنے والے!
بھارت کی تقدیر کے مالک!

اگلے روز کانگریس نے قرارداد منظور کی جس میں ہندوستان کو رونق بخشنے پر شاہِ انگلستان کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔[۳۵]

دہلی میں عالی شان خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔

اقبال نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی جس میں خواجہ حسن نظامی نے اُنہیں ترجمانِ حقیقت کا خطاب دیا۔

اِس کے بعد شاہ سلیمان پھلواری کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں مولانا شبلی نعمانی کے ہاتھوں اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا جانے والا تھا۔ اس میں خواجہ کمال الدین نے 'اسلام اور علومِ جدیدہ' کے موضوع پر ایک لیکچر دیا اور آخر میں ایک عجیب و غریب تقریر کی۔ ''کہاں ہے تُو ڈاکٹر اقبال؟'' انہوں نے جذبات میں ڈوب کر پکارا (اقبال اُن کے پیچھے اسٹیج پر بیٹھے تھے)، ''تجھے خدا تعالیٰ نے بے نظیر قابلیتیں اس لیے نہیں دیں کہ تُو لفظی موشگافی میں پڑے اور اپنے شعروں سے ہمیں خوش کرے۔ تیرے گانے کا یہ وقت نہیں۔ یہ عملی کام کا وقت ہے...قوم تجھے ملک الشعرا بنانا چاہتی ہے اور وہ ایسا کرنے میں غلطی پر ہے اور تُو پست ہمت ہوگا اگر اس پر قانع ہوا...''

اس بہت لمبی چوڑی تقریر میں خواجہ کمال الدین نے یاد دلایا کہ قرآن مجید میں شاعروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اندھی وادیوں میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں۔ اقبال شاعری کی پستی چھوڑ کر قرآن میں سے حکمت اور فلسفہ کے موتی نکال کر دنیا کے سامنے پیش کریں، یہ پھولوں کا ہار کچھ حقیقت نہیں رکھتا جو قوم اُن کے گلے میں ڈالنا چاہتی ہے۔

اُنہوں نے اقبال سے پوچھا کہ کیا وہ بات درست ہے جو کچھ روز پہلے شیریڈن نامی کسی یورپین نے طرابلس کی جنگ پر لیکچر دیتے ہوئے کہی تھی کہ اسلام نے کبھی دنیا کو کچھ نہیں دیا اِس لیے اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ مغرب والے خود چور ہیں، ان کا فلسفہ اور سائنس سب کی سب مسلمانوں سے چُرائی ہوئی ہیں اور ''بیرسٹر اقبال، آ میرے ساتھ وکالت میں شامل ہو اور ہم... اس مال کو اپنے گھر کا مال

مسروقہ ثابت کردیں۔''

اس کے جواب میں اقبال کو غالباً اپنی باری سے قبل ہی تقریر کرنی پڑی۔ ''خواجہ صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہے وہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے...'' انہوں نے کہا اور پھر بتایا کہ اسلام اور علوم جدیدہ کے موضوع پر اس زمانے میں مسلمانوں نے بہت لکھا ہے۔ ڈیکارٹس کا فلسفیانہ طریق کار غزالی کے یہاں پہلے سے موجود تھا، راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا اور جان اسٹوارٹ مل کے فلسفے کے تمام بنیادی اصول بوعلی سینا کی کتاب میں پہلے سے موجود تھے نیز اُس نے منطق پر جو اعتراض کیا ہے بالکل وہی اعتراض رازی نے بھی کیا تھا۔ چنانچہ اسلام نے زندگی کے ہر پہلو پر اچھا اثر ڈالا ہے۔

اقبال کی متانت کا یہ نہایت ہی لطیف پہلو تھا کہ اُنہوں نے اپنی شاعری کے دفاع میں کچھ نہیں کہا جسے خواجہ کمال الدین جذبات کی رَو میں بیکار قرار دے گئے تھے۔

اقبال کی تقریر کے بعد سجاد حیدر یلدرم نے جو اُن دنوں امیرِ کابل کے پولیٹکل اسسٹنٹ افسر تھے، شبلی نعمانی سے درخواست کی کہ وہ اقبال کو پھولوں کا ہار پہنائیں۔

علامہ شبلی نعمانی اٹھے تو انہوں نے اُسی باوقار اور کہیں کہیں اکھڑے ہوئے لب و لہجے میں جو اُن کی عالمانہ تصانیف کے ساتھ مخصوص ہو چکا تھا ایک مختصر تقریر کی، ''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنی چاہیے'' شاید وہ خواجہ کمال الدین کی سرزنش کر رہے تھے۔ ''ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے ہیں اُتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی... جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔'' شبلی نے قوم کی طرف سے انہیں ملک الشعراُ کا خطاب دیا۔

شبلی نے اقبال کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا اور اب اقبال کی باری تھی کہ وہ اُن کا

شکریہ ادا کریں۔ یہاں اپنی شاعری کے دفاع میں کچھ کہنا مناسب تھا بلکہ شبلی نعمانی جیسی بزرگ ہستی کے ادب کا تقاضا بھی یہی تھا۔

اقبال نے پان اسلام اِزم کا ذکر کر کے کہا کہ ابھی دہلی میں وہ ایک شاہی قبرستان میں کسی کتبے پر 'الملک للہ' لکھا ہوا دیکھ کر آ رہے ہیں، یعنی سلطنت خدا کی ہے، چنانچہ اِس سے مسلمان بادشاہوں کی درویشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو اُس کے مستقبل سے ناامیدی نہیں ہوسکتی اور یہی وہ پان اسلام اِزم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے۔ اِسی قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں۔''

آخر میں صدرِ جلسہ شاہ سلیمان پھلواری کی باری آئی اور اُس خوش مزاج عالمِ دین نے بھی اپنے کندھوں پر یہ بوجھ محسوس کیا کہ اقبال کو دوبارہ یقین دلائیں کہ اُنہیں دہلی بلانے کا مقصد اُن کی شاعری کی تحقیر کرنا نہیں تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے کہا کہ قرآن نے صاحبِ ایمان شعرا کو اُس گروہ میں شمار نہیں کیا ہے جو اندھی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اقبال کی قومی شاعری اب عام جلسوں میں بلکہ میلاد اور وعظ کی محفلوں میں بھی پڑھی جانے لگی ہے اور یہ ایسا بلند خیال شاعر ہے کہ ایک طرف طرابلس ہاتھ سے نکل رہا ہے دوسری طرف ایران خطرے میں ہے مگر یہ سارا جہاں ہمارا کہہ کر قوم کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔

''خیر ہم بھی کہتے ہیں کہ خدا کرے سارا جہان تمہارا ہو جائے،'' آخر میں انہوں نے کہا، ''اور کوئی نہ ہو تو ہم تمہارے ہیں... اقبال صاحب کے لیے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کے مقتدر ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے۔ نام بھی مبارک، کام بھی مبارک، پھولوں کا ہار بھی مبارک اور ہار ڈالنے والے کا دستِ کرم بھی مبارک!''

بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم تعلیم نسواں کے شعبے کی صدارت کر رہی تھیں چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں تقریریں ہوئیں اور عام تعلیم کے حوالے سے مسٹر

گوکھلے کے اُس بل کی حمایت کی گئی جو ان دنوں بہت مشہور ہو رہا تھا اور جس میں انہوں نے انگریز حکومت سے درخواست کی تھی کہ ہندوستان میں تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس بل کی منظوری کی صورت میں مسلمانوں کی ضرورتوں اور مقاصد کی پوری حفاظت ہونی چاہیے۔[۳۱]

51

ایلکتبے پر لکھی ہوئی رسمی عبارت سے پچھلے چودہ سو برس کے بے شمار شاہی خاندانوں کی حکومت کے اصول دریافت کر لینا فنِ تاریخ کے ساتھ ایسی جسارت تھی جس پر شبلی نعمانی کا کلیجہ ضرور تڑپا ہوگا مگر اس درخت کا بیج اُنہوں نے ہی لگایا تھا۔ یورپی مصنفین کے تعصب کے خلاف ردِ عمل کو اپنی تاریخ نگاری میں جگہ دی تھی اور تعصب کا ردِ عمل بھی ایک قسم کا تعصب ہی ہوتا ہے خواہ اس میں معصومیت کے رنگ جھلکتے ہوں۔

شبلی ہمیشہ تحقیق میں پورے اترتے تھے مگر کسی کتاب کا مجموعی تاثر عام طور پر اُس کی جزئیات سے زیادہ ذہن میں بیٹھتا ہے۔ ان کی تاریخ نگاری کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی سب ٹھیک تھا اور اب جتنے مسائل ہیں وہ مسلمانوں کو دوبارہ حکومت ملتے ہی حل ہو جائیں گے۔ اقبال کا اپنا تاریخی اور سماجی شعور اس رویے سے مختلف تھا اور اُس میں امیر علی کی اعتدال پسندی بھی تھی مگر جذباتی طور پر وہ شبلی کے تخیل کی طرف کھنچے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

52

مہاراجہ کشن پرشاد بھی دہلی آئے ہوئے تھے اور اقبال کا قیام اُنہی کے دولت خانے میں رہا۔

یہ شاید حیدرآباد کے بعد کشن پرشاد سے اقبال کی دوسری ملاقات تھی اور ملازمت کے بارے میں بھی سرسری سی گفتگو ہوئی مگر اقبال اُن کا ارادہ معلوم نہ کر سکے۔ کچھ امید ضرور

بندھی ہو گی جسے دبانے کے لیے انہوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلی دی کہ ''بہر حال مجھے بے تابی نہیں۔ مقدر کا قائل جو شخص ہو اس کی طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ مجھ کو جہاں ہوں اپنے فرائضِ مفوضہ کی ادائیگی سے کام ہے۔ خواہ لاہور میں ہوں خواہ لندن میں ہوں، کسی خاص جگہ ملازمت کرنے کی خواہش بھی دل میں پیدا نہیں کرتا کیونکہ سراپا تن بہ تقدیر رہتا ہوں۔''

لاہور آ کر گرامی کو خط لکھا اور یہ خیالات اُس میں تحریر کر دیے۔ گرامی نے جو فارسی اشعار بھیجے تھے اُن میں سے ایک مصرعے کی اقبال نے خوب داد دی: 'ذوقِ وارفتگیٔ کج کلہانِ دہلی'یعنی ہائے وہ دلی کے بانکوں کا ذوقِ بیخودی!

53

سیالکوٹ میں آبائی مکان کی جگہ سہ منزلہ حویلی تعمیر ہو چکی تھی۔ بازار کی جانب لکڑی کی خوبصورت بالکونی تھی اور انگریزی رواج کے مطابق کئی کمروں کے ساتھ ملحقہ غسلخانے تھے۔ باہر کی طرف سیڑھیوں کے ساتھ تین دکانیں تھیں اور صدر دروازہ امام بی بی کے کہنے پر اندر گلی کی طرف رکھا گیا تھا۔

امام بی بی کا کمرہ خاص طور پر سجایا گیا۔ پورے کمرے میں لکڑی کے تخت بچھائے گئے، اُن پر نئی دری اور ایک درمیانہ سائز کا ایرانی قالین ڈالا گیا۔

عطا محمد نے حویلی کو 'اقبال منزل' کا نام دیا۔[۳۷]

54

عطا محمد سب لڑکوں کے لیے اُس زمانے کی مقبول سیاہی اسٹیفنز اِنک (Stephen's Ink) کی بڑی بوتل لے کر آئے جو پتھر کی تھی اور اس کے منہ پر کارک لگا ہوا تھا جسے لاکھ سے بند کیا گیا تھا۔

دوپہر کو جب گھر کے لوگ آرام کر رہے تھے تو آفتاب، اعجاز کو ساتھ لے کر بوتل اور

کارک کھولنے والا اسکرو لے کر امام بی بی کے کمرے میں چلے آئے۔ امام بی بی کی گاؤ تکیے والی خاص مسند پر بیٹھ کر آفتاب نے سیاہی کی بوتل اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ لی اور جب اسکرو لگا کر زور سے کارک کھینچا تو بوتل لڑھک گئی۔ نہ صرف آفتاب کے ہاتھ اور کپڑے سیاہی میں رنگ گئے بلکہ نیچے قالین اور دری بھی تر بتر ہو گئے۔

''گھبراہٹ میں آفتاب بھائی نے کہا، چلو بھاگ چلیں،'' اعجاز احمد کا بیان ہے۔ ''شہر کے وسط میں سالبان کا قلعہ ایک مشہور جگہ ہے۔ اُن دنوں شہر کا تھانہ، میونسپل ہال، میونسپل کمیٹی کے دفاتر، پبلک لائبریری، گورنمنٹ ہائی اسکول، سب قلعے پر ہوتے تھے اور لڑکوں کے کھیلنے کے لیے بھی کھلا میدان ہوتا تھا۔ گھر سے فرار ہو کر ہم نے وہاں پناہ لی۔ گھر میں جب یہ راز کھلا تو ہمارے لیے ڈھنڈیا پڑی۔ میرے بہنوئی اور پھوپھی زاد بھائی فضل الٰہی مرحوم ہمیں قلعے سے پکڑ لائے...''

عطا محمد نے دونوں کے ہاتھوں پر آٹھ آٹھ بید مارے۔ آفتاب عادی ہو گئے تھے مگر باپ کے ہاتھوں اعجاز کی یہ پہلی جسمانی سزا تھی۔[۳۹]

55

تقسیم بنگال کی تنسیخ کا مسلمانوں میں پہلا ردِ عمل نواب وقار الملک کا مضمون تھا جو انہوں نے دہلی دربار سے واپس آتے ہی لکھا اور ۲۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپ گیا۔

''ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اُس وقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے، لاحاصل مشورہ ہے،'' نواب وقار الملک نے لکھا۔ ''اب زمانہ اِس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسا کرنا چاہیے وہ ہماری قوتِ بازو ہے۔''

نواب وقار الملک کا خیال تھا کہ مسلمان اگر کانگریس میں شامل ہوئے تو اُن کی ہستی فنا ہو جائے گی۔

مضمون کا عنوان 'مسلمانوں کی آیندہ حالت' تھا۔ اِس کے چھپتے ہی وہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوا جو انتہا پسند نوجوانوں کے دلوں میں نجانے کب سے کسی ایسی ہی اجازت کا انتظار کر رہا تھا۔

56

غزل

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دُور وصالِ بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجابِ لیلیٰ سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلیٰ بھی گئی

کی ترک تگ و دَو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگیِ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے ہے یہ کس کی صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی

تیسرے شعر کے بعد ایک اور مصرعہ بھی بیاض میں لکھا تھا مگر پہلا مصرعہ موزوں نہ ہو سکا:

ساقی بھی گیا، محفل بھی گئی، صہبا بھی گئی، مینا بھی گئی[۳۹]

57

جوشِ عشق سے ہوا رُخِ بہار بے حجاب

یہ ایک اردو نظم کا پہلا مصرعہ تھا جس میں اقبال زندگی کے بارے میں اپنا فلسفہ بیان کرنے کی کوشش کرنے والے تھے۔

چند اشعار سے زیادہ نہ ہو سکے۔[۴۰]

58

دسمبر ۱۹۱۱ء میں اقبال کو عربی کے انٹرمیڈیٹ کے پرچے کا ممتحن مقرر کیا گیا۔ ایک پرچہ مرتب کرنے کا معاوضہ تیس روپیہ تھا اور پرچہ جانچنے کا معاوضہ چھ آنہ فی پرچہ تھا۔

اسی برس وہ عربی کے انٹرمیڈیٹ پرچے اور بی اے پرچے اور بی اے فلسفہ کے پرچے کے ممتحن مقرر ہوئے۔ ایم اے فلسفہ کے ممتحن بھی مقرر ہوئے جس میں پروفیسر سانڈرز اور ریورنڈ گریسولڈ بھی ممتحن تھے۔[۴۱]

58

۳۱ دسمبر کی صبح اقبال ایک اور نظم لکھ رہے تھے۔ عنوان تھا 'نمودِ صبح' اور اس میں کہا گیا تھا کہ جب اپنے دامن میں ہنگامے لیے مشرق سے صبح نمودار ہوتی ہے تو دنیا سے خاموشی چلی جاتی ہے اور ہر چیز اپنی زندگی کا ثبوت دینے لگتی ہے، چنانچہ:

مسلم خوابیدہ! اُٹھ ہنگامہ آرا تُو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر! گرمِ تقاضا تُو بھی ہو

دوسرا حصہ

59

یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو اسلامیہ ہائی اسکول سے ۴۰۲ طلبہ کو انجمن حمایت اسلام کے تحت ایک نئے اسکول منتقل کر دیا گیا جو موچی دروازے کے باہر ڈاکٹر بوس کی کوٹھی میں کھولا

گیا تھا۔ پرانے اسکول کے نام میں شیرانوالہ دروازہ کا اضافہ ہوگیا۔[۴۲]

60

۲ جنوری کو مولانا محمد علی نے لکھا کہ ایک متحدہ ہندوستان وجود نہیں رکھتا مگر اِسے وجود میں لانا ہوگا۔

61

وطنیت

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارتگرِ کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے!
ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی

رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے[۴۳]

62

اُسی مہینے عطا محمد نوکری پر واپس چلے گئے۔ اِس دفعہ اُن کا تقرر کیمبل پور میں ہوا تھا۔[۴۴]

63

خواجہ فیروز الدین اور فاطمہ بیگم کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام خواجہ خورشید انور رکھا گیا۔[۴۵]

64

مس گوٹسمین نے اس برس کسی وقت سردار امراؤ سنگھ سے شادی کر لی اور دونوں ہنگری چلے گئے۔

جنوری ۱۹۱۲ء کے مخزن میں اکثر مضامین تاجپوشی کے جشن سے متعلق تھے۔

غلام محمد طور بی اے لاہور نے اپنے مضمون 'دربارِ تاجپوشی' میں لکھا تھا، ''ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک غیر ملک کا رہنے والا بادشاہ صلح و امن کا فرشتہ بن کر ہندوستان میں رونق افروز ہے۔ جابر اور قہار کشور کُشا مثلاً سکندر، محمود، تیمور، بابر جو برّی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور البقرق اعظم و دیگر پرتگیزی و ولندیزی حملہ آور جو بحری راستے سے ہند میں داخل ہوئے سب کے سب بزورِ شمشیر بے پناہ خلقِ خدا کو حلقۂ غلامی میں داخل کرتے رہے مگر آج ملک کی خوش قسمتی سے وہ زمانہ آ پہنچا ہے کہ ہمارے انگلستانی تاجر نے ہمارے جسموں کو بزورِ شمشیر نہیں بلکہ ہمارے دلوں کو بزورِ اخلاق مسخر کر لیا ہے...''

اقبال کی ایک نظم بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

ہمارا تاجدار

بیادگار شاہی دربار ہز امپیریل مجسٹی جارج پنجم بمقام دہلی

ہمائے اوجِ سعادت ہو آشکار اپنا
کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا
اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں میں
اسی کے نام سے ہے قائم اعتبار اپنا
اسی سے عہدِ وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کے خاکِ قدم پر ہے دل نثار اپنا[۴۱]

اُس مہینے رسالہ الندوۃ میں شبلی نے اعلان کیا کہ اُن کا ارادہ رسولِ اکرم کی ایک

مفصل اور مستند سوانح لکھنے کا ہے۔

اس کے لیے بہت سی نایاب اور قلمی کتابیں درکار تھیں اور مغربی مصنفین کی کتابوں کا ترجمہ کروانے کی بھی ضرورت تھی تا کہ اُن کے اعتراجات کا جواب دیا جا سکے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کتاب کے انگریزی اور عربی میں ترجمے شائع ہوں، ''محض اُردو ایڈیشن بیکار ہے۔''

شبلی کا خیال تھا کہ اس کام کے لیے ڈھائی سو روپے ماہانہ درکار ہوں گے۔[۲۶]

67

حیدر آباد دکن میں نواب میر محبوب علی خاں انتقال کر چکے تھے اور میر عثمان علی خاں نظام بنے تھے۔ ۱۱ جنوری کو مہاراجہ کشن پرشاد سے مدار المہام کے عہدے سے استعفیٰ لے لیا گیا۔

68

وقف علی الاولاد کمیٹی کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں وفد لے جانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ جنوری ۱۹۱۲ء کے آغاز میں مولانا شبلی نعمانی نے اقبال کو بھی خط لکھا اور لکھنؤ آنے کی دعوت بھی دی۔

۱۲ جنوری کو اقبال نے وفد میں شامل ہونے سے معذرت کر لی مگر چودھری شہاب الدین، نواب ذوالفقار علی خاں اور میاں محمد شفیع کے نام تجویز کیے جن میں سے کوئی بھی اُن کے خیال میں اس مقصد کے لیے موزوں ہو سکتا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ایسٹر کی تعطیلات میں ہونے والا تھا چنانچہ اقبال نے لکھا کہ اگر اس کے بعد وہ لکھنؤ آ سکے تو ضرور حاضر ہوں گے۔

69

۱۴ جنوری سے لکھنؤ کے سر برآوردہ مسلمانوں نے ایک نیا اُردو اخبار جاری کیا جس کا

نام مسلم گزٹ تھا۔وحیدالدین سلیم جو پہلے علی گڑھ سے معارف نکالا کرتے تھے اس کے مدیر بنے۔

ظفرعلی خاں نے زمیندار میں نئے اخبار کو خوش آمدید کہا۔[۴۸]

70

شبلی ایک مجلس بنانا چاہتے تھے جو ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھ کر اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کرے۔انہوں نے تین علماٗ کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے اقبال کو اس میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔

71

اس برس آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے شری رادھا کرشنن کی کتاب Essentials of Psychology شائع ہوئی۔معلوم نہیں اس کتاب سے اقبال کا تعارف کب ہوا مگر یہ ان کی کتابوں کے مجموعے میں شامل ہوئی۔

اس برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[۴۹]

Hocking, William Ernest. *The Meaning of God in Human Experience: A Philosophical Study of Religion*. London, Oxford University Press

Holt, Edwin B., and others. *The New Realism Cooperative Studies in Philosophy*. New York, Macmillan

Majid, S.H.R. Abdul Majid. *England and the Moslem World: articles, addresses and essays on*

Eastern subjects. New York, Yorkshire Printing Co.

72

پچھلے برس ہندوستان میں ہونے والی مردم شماری کی رپورٹ اس برس شائع ہوئی تو اُس کی چودھویں جلد میں جو پنجاب کے بارے میں تھی، حصہ اول میں اقبال کے علی گڑھ والے لیکچر کے اقتباسات بھی شامل تھے۔٥٠

73

یکم فروری کو موچی دروازے کے باہر باغ میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا تا کہ تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال پر تبصرہ کیا جا سکے۔

اقبال کو جلسے کا صدر تجویز کیا گیا تھا مگر انہوں نے اسٹیج پر آ کر اپنی جگہ ملک مبارز خاں صاحب ٹوانہ سے صدارت کی درخواست کی۔ ٹوانہ صاحب صدر کی کرسی پر بیٹھ گئے تو اقبال نے سورۂ دہر کی چند آیات کی تلاوت سے جلسے کا آغاز کیا۔

جلسے کی تیسری قرارداد مولوی غلام محی الدین نے پیش کی جس میں اُس رشتۂ اتحاد کی قدر کی گئی تھی جو شاہِ انگلستان اور ملکہ عالیہ کے ہندوستان تشریف لانے کی وجہ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان قائم ہوا تھا۔ یہ توقع بھی ظاہر کی گئی تھی کہ ''ہندوستان کی بین الاقوامی محفل''میں مسلمان وہ درجہ حاصل کریں گے جس کے وہ اپنی بڑی تعداد اور اہمیت کی وجہ سے مستحق ہیں۔

قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ بادشاہ سلامت کے ہندوستان تشریف لانے سے یہ ملک برطانیہ سے قریب ہو گیا ہے۔ ہندوستانیوں کو بہت سی برکات حاصل ہوں گی، یہاں کی قومیں ایک دوسرے سے قریب آ جائیں گی خواہ اس وقت کچھ اختلافات ہی کیوں نہ سامنے آ رہے ہوں۔ البتہ مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے

خود بھی ہاتھ پاؤں مارنے چاہییں کیونکہ ہندوؤں کو اب تک جو کچھ ملا ہے اپنی کوششوں سے ملا ہے۔

اس کے بعد اقبال نے اسلام کے اولین زمانے میں عربوں کے عروج کا حوالہ دیتے ہوئے بڑے جوش سے کہا، ''ہمیں چاہیے کہ اپنے خدا، اپنے رسول، اپنے دین اور اپنے قوتِ بازو پر بھروسا رکھ کر حاکموں سے مؤدبانہ حاجات طلب کریں اور بنی نوعِ انسان میں امن و امان قائم رکھیں کیونکہ اسلام ہمیں شر و فساد کی ممانعت کرتا ہے۔ اِن اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر باقی اقوام سے ربط و اتحاد بڑھائیں اور جو سیکھ سکتے ہیں انہیں سکھائیں، جو سکھا سکتے ہیں اُن سے سیکھیں، اور حتی الوسع ہمارا وہ نصب العین ہو جو اگلے مسلمانوں کا تھا۔''[۵۱]

74

۴ فروری کو شیخ غلام محمد انتقال کر گئے جو امرتسر کے اخبار وکیل کے مالک تھے۔ ایک عرصے تک یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا اخبار رہا تھا۔[۵۲]

75

۶ فروری کو مسلم گزٹ میں شبلی نعمانی کے مضمون 'مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ' کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ اُنہوں نے وقار الملک کی اس بات پر تنقید کی کہ کانگریس میں شامل ہونے سے مسلمانوں کی ہستی فنا ہو جائے گی۔

شبلی کے خیال میں یہ غلط منطق تھی۔

76

فروری کی ایک سر درات شمع نے اُس سوال کا اُردو میں جواب دیا جو اقبال نے کچھ عرصہ پہلے فارسی غزل میں اُس سے پوچھا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ تو رات بھر خاموشی سے

جلنے کے بعد صرف ایک آہ بھر کر ختم ہو جاتی ہے مگر شاعر ہر سانس کے ساتھ شعر کہتا ہے۔ یہ اپنی فطرت کے تقاضے سے جلتی ہے مگر اُس کا سوز و گداز بس دِکھاوا ہے۔

'شکوہ' کا اختتام اِس بات پر ہوا تھا کہ اگلے زمانے کے مسلمان اپنی تہذیب سمیٹ کر دنیا سے چلے گئے ہیں مگر اقبال اُن کی آخری نشانی بن کر ابھی تک دنیا میں آہ و زاری کر رہے ہیں۔

نئی نظم کا آغاز اسی مقام سے ہوتا تھا مگر اب شمع، شاعر کو شرمندہ کر رہی تھی کہ وہ محفل تو اجڑ چکی ہے، اور آخرِ شب بسمل کی تڑپ بہت دیکھنے کے قابل تھی، اب سب کچھ ختم ہونے کے بعد تمہاری شاعری کا کیا فائدہ ہے۔ فرد کا وجود اپنی قوم سے ہوتا ہے۔ جس طرح لہر دریا میں ہوتی ہے اور دریا کے باہر کچھ بھی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد انہوں نے شمع سے وہ بات کہلوائی جو اقبال کا بنیادی پیغام بن گئی، یعنی اگر دُنیا میں مشکلات ہیں تو اُن کا حل بھی ضرور ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی ایک بھی انسان یہ سمجھ کر بیٹھ جائے کہ خوشی اُس کے حصے میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ اگر کسی کے دامن میں صرف چند کلیاں سمیٹنے کی گنجائش ہو تو باغ میں دامن وسیع کرنے کا سامان بھی ہے۔

کافی تراش خراش ہوئی۔ اُن کی محبوب ترکیب 'بانگِ درا' یہاں بھی ایک مصرعے میں آ گئی تھی:

کارواں بے حس ہوا بانگِ درا ہو یا نہ ہو

مگر پھر کچھ سوچ کر اس مصرعے میں بانگِ درا کی بجائے آوازِ درا کر دیا۔

نظم میں تغزل بہت تھا مگر چونکہ شاعر سے مراد مسلم قوم تھی لہٰذا کچھ ایسے اشعار کاٹنے پڑے جو اس مفہوم کو سہار نہیں سکتے تھے، مثال کے طور پر:

بت کدے دنیا کے ویراں کر دیے اس نے مگر
بت شکن کے دل کی بستی میں صنم خانے رہے

لالہ بھی بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔ کچھ جگہوں پر رہنے دیا مگر ایک جگہ بات نہیں بنی تھی۔ اُسے کاٹ دیا:

داغِ نَو سے سینۂ مسلم گلستاں ہو گیا
چھوٹی چھوٹی مشعلیں لالوں کی روشن ہو گئیں

جیسے جیسے نظم آگے بڑھی بعض ٹیپ کے شعر جو کسی پچھلے بند آخر میں لکھے تھے، اٹھا کر اگلے بند میں رکھ دیے اور پچھلے بند کے لیے کوئی اور شعر لکھ دیا۔ پہلے جو شعر چوتھے بند کے آخر میں تھا وہ بعد میں پانچویں بند کا آخری شعر بن گیا اور اس کا یہ پہلا مصرعہ بھی تبدیل کر دیا گیا:

ہے خبر تاروں میں لیکن آمدِ خورشید کی

نظم کا آخری بند سب سے زیادہ تیاری کے ساتھ لکھا گیا۔ زمین نکالنے کے لیے بے جوڑ لیکن مترنم مصرعے لکھے کہ بعد میں شاید ان پر گرہ لگ جائے:

- خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
- یہ کلی آزادِ احسانِ صبا ہو جائے گی
- صبح نکلے گی تو یہ شبنم ہوا ہو جائے گی
- برگِ گُل پر موجِ بُو اِک دِن فدا ہو جائے گی

ان میں سے صرف ایک ہی مصرعہ کام آیا مگر اس زمین میں آخری بند نظم کی عظمت کے مطابق تھا۔ اگر کوئی غور کرتا تو اُس میں چھپا ہوا درد بلکہ خودترسی بھی محسوس کر سکتا تھا کیونکہ صبح ہوتے ہی شمع بجھا دی جاتی ہے چنانچہ وہ ایک ایسی خوشی کا پیغام دے رہی تھی جس میں شریک ہونے کے لیے وہ خود زندہ نہ ہوگی۔

شمع اور شاعر

شاعر

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش
گیسوے تو از پرِ پروانہ دارد شانۂ
درجہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحراستم
نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ
مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم
در طوافِ شعلۂ ام بالے نہ زد پروانۂ
می تپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من
بر نمی خیزد ازیں محفل دلِ دیوانۂ
از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی

شمع

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا
یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا
ہے مری شب کے لہو سے گل بہ دامن میری صبح
اور ترے امروز سے ناآشنا فردا ترا
سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے؟

انجمن پیاسی ہے اور پیانہ بے صہبا ترا!
قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا
مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل
لب اسی موجِ نفس سے ہے نواپیرا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائیِ بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا
اور ہے تیرا شعار، آئین ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
اے دُرِ تابندہ، اے پروردۂ آغوشِ موج!
لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا
جل رہی ہوں میں تو اپنی انجمن کے واسطے
نغمہ پیرا تو بھی ہو اپنے وطن کے واسطے
تھا جنھیں ذوقِ تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا

اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو

کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا

تیرے پروانے بھی جل مرنے سے بیگانے رہے

شوق بے پروا گیا فکر فلک پیا گیا

تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں

فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے

خوفِ جاں پروردۂ عقلِ زیاں اندیش ہے

...

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے

اب نہ وہ مے کش رہے باقی نہ مے خانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے

کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں

رقص میں لیلیٰ رہی ، لیلیٰ کے دیوانے رہے

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو

پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

رہزنِ دانا متاعِ کارواں بھی لے گیا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی لے گیا

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی

وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر اُن کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہوگئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بہ دامن ہو گئیں

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہوگئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدت کے ترے رِندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز

دل کے ہنگامے مےٗ مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینابدوش
در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے
ملک ہاتھوں سے گیا ملّت کی آنکھیں کھل گئیں
سرمہ چشمِ دشت میں گردِ رمِ ہوا
رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں آبِ جُو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دُنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر
بجلیوں کو پردۂ دل میں ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورت مینا نہ کر
خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارتگرِ کاشانہ کر
تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عینِ دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا، سرودِ بربطِ عالم ہے تو
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو

قطرہ ہے لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے؟
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے
راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ!
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ!
آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نواساماں طیور

خونِ گل چیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اِس چمن کی ہر کلی دردآشنا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اِسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے[۵۳]

مسٹر گوکھلے کے لازمی تعلیم کے بل پر بحث ہو رہی تھی۔ اِسے جبری تعلیم کا بل بھی کہا جاتا تھا۔

۷ افروری کو لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے زیرِ اہتمام جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اقبال نے قرارداد پیش کی: ''مسلمانانِ لاہور کا یہ عام جلسہ یقین کرتا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں ابتدائی تعلیم عام طور پر پھیلانے کے لیے سابق کی نسبت زیادہ با اثر کوشش کی ضرورت ہے اور جلسہ استدعا کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام بطور مسلمانانِ پنجاب کی سب سے اعلیٰ تعلیمی جماعت کے مسلمانوں کے تعلیمی پروگرام کے اس حصے کو نہایت مستعدی اور گرم جوشی سے پورا کرنے کے لیے ایک باضابطہ اور زبردست تحریک چلائے۔'' قرارداد منظور ہوئی۔[۵۴]

۱۸ فروری کو مسودۂ قانون کے لفظ ''جبریہ'' پر غور کرنے کے لیے ایک اور جلسہ اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں ہوا اور اقبال نے صدارت کرتے ہوئے کہا، ''لفظ جبر سے کھٹکنا نہیں چاہیے۔ جس طرح چیچک کا ٹیکا لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے.... جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔''۵۵

78

۱۹ فروری کو مسلم یونیورسٹی کے لیے لاہور میں جلسہ ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ مسلمانوں کی قومیت کا اصول توحید ہے جس کا تعلق دل سے ہے چنانچہ مسلمان جہاں جاتا ہے اپنی قومیت ساتھ لے جاتا ہے مگر ایسے غیر محسوس اصول کی حفاظت کے لیے کچھ ٹھوس چیزوں کو اس سے منسلک کرنا ضروری ہے جن میں سے پہلی یہ ہے کہ اسلام نے ہر وقت خدا کو یاد کرنے کا حکم دیا ہے اور دن میں کئی بار نماز فرض کی ہے تاکہ مسلمان اصولِ توحید کو بھول نہ جائے۔

مسلمان کی قومی زندگی کی دوسری ٹھوس محافظ اُس کی ثقافت ہے جس کی بنیاد اپنی معاشرت، تمدن، سیاست وغیرہ کے علم پر ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے علم کو اہمیت دی گئی یہاں تک کہ بعد میں اسپین میں ایک بہت بڑی یونیورسٹی قائم ہوئی جس کا نام قرطبہ یونیورسٹی تھا۔ یورپ سے عیسائی بھی وہاں آیا کرتے تھے اور بالآخر اُنہوں نے مسلمانوں کے اسی ادارے کے نمونے پر پیرس میں ایک یونیورسٹی قائم کی جو اب تک موجود ہے۔

اقبال نے کہا، دنیا میں سب سے پہلے یونیورسٹی بنانے کا خیال مسلمانوں کو آیا۔ نصاب میں عربی زبان لازمی قرار دی گئی کیونکہ اُس زمانے میں تمام علوم وفنون اس زبان میں موجود تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ثقافت کے خزانے بھی اسی زبان میں چھپے ہوئے موجود ہیں مگر چونکہ اب سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے اور اُنہیں دوسری قوموں کا تمدن پڑھنا اور سیکھنا پڑا ہے چنانچہ وہ اپنے تمدن سے ناواقف ہوگئے

ہیں جس کے بغیر قومی وجود بھی مشکل ہے۔ چنانچہ نوجوانوں میں پہلے بداعتقادی پھیلی اور پھر وہ بے دین ہو گئے۔

اقبال نے کہا، مسلمانوں کے مقتدر اور ذہین لیڈروں نے اس خطرے کا اندازہ لگا کر مسلمانوں کے نصاب میں اُن کی معاشرت اور تمدن و سیاست کو داخل کرنا چاہا جس کے لیے محمڈن یونیورسٹی ضروری ہے۔[۵۶]

۲۳فروری کو لاہور میں آغا خاں، نواب وقار الملک اور ان کے ساتھیوں کا زبردست استقبال کیا گیا جو دو روز بعد ہونے والے مسلم یونیورسٹی کے بہت بڑے جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے پرانے شہر کے راستے انارکلی تک کے علاقے کو بیزوں محرابوں اور دوسرے آرائشی سامان سے سجایا گیا۔[۵۷]

جلسہ ۲۵فروری کو ہوا۔ غالباً یہی موقع ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ سر آغا خاں کی صدارت میں برکت علی میموریل ہال میں یونیورسٹی کے لیے جلسہ ہوا تو اقبال بھی موجود تھے اور انہوں نے رباعی پڑھی:

باہر ہوئے جاتے ہو کیوں جامے سے
پوچھو کسی پنڈت سے نہ علاّمے سے
میں تم کو بتاتا ہوں یونیورسٹی کیا ہے
پتلون کی تکرار ہے پاجامے سے

آغا خاں نے یونیورسٹی کے لیے ایک لاکھ روپیہ چندہ دیا۔ لاہور سے پانچ لاکھ روپے کے قریب چندہ جمع ہوا۔

''کیا یہودی مسلمانوں کے دوست ہیں؟'' اُنہی دنوں زمیندار اخبار نے سرخی جمائی۔

اِس کے نیچے درج تھا، ''پیرس کا کروڑپتی یہودی ایک فرانسیسی عالمِ طبقات الارض کے ساتھ فلسطین کو آنے والا ہے تاکہ قدیم یہودی بادشاہوں کے مقبروں کا پتہ نکالے۔ درپردہ اس سفر کا متصد اپنی نوآبادی کو قائم کرنا اور یہودی سلطنت کے بنانے کا ہے۔ اِسی طرح اخبار میں یہ خبر بھی گرم ہے کہ ینگ ٹرکش پارٹی کو یہودیوں سے مدد ملی ہے اور اب وہ آئینی حکومت کے قیام میں مالی مدد دینے کو تیار ہے۔''[۵۸]

80

یکم مارچ کو انجمن اسلامیہ پنجاب نے عید میلادالنبی منعقد کیا۔ اس کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا تھا جس میں اقبال نے بھی ایک روپیہ دیا تھا۔[۵۹]

81

۳ مارچ کو اکبر الٰہ آبادی نے اقبال کو خط لکھا۔ اُس فارسی محاورے کا ذکر کیا جس کا مطلب تھا، وقت کے ساتھ چلو۔ ''بازمانہ بساز صحیح ہے لیکن بے ضرورت بازمانہ بساز کیوں؟'' اُنہوں نے لکھا۔ ''میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں...'' اُنہیں خوشی تھی کہ اقبال کم عمر ہو کر بھی معاشرے کو اُسی گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں جو اکبر کا خاصہ تھی۔

وہ اقبال کے اُس قطعے سے متاثر ہوئے تھے جو 'شکوہ' سے پہلے سنایا گیا تھا۔[۶۰]

82

ظفر علی خاں کی شعلہ بیانی بالآخر رنگ لائی اور اُن کی کسی تحریر سے متاثر ہو کر حکومت نے زمیندار کی ایک ہزار کی ضمانت ضبط کر لی اور دو ہزار روپے کی تازہ ضمانت طلب کی۔

کامریڈ نے ۲۳ مارچ کے اداریے میں زبردست احتجاج کیا اور بڑی پتے کی

بات کہی، ''اگر زمیندار نے اٹلی یا روس کے رویے پر اور ان مسائل پر گفتگو کی تو ہم شاہ جارج کی رعایا ہیں، اٹلی یا روس کی نہیں۔''[61]

83

ظفر علی خان کو بہت عرصے سے خیال تھا کہ جاپان میں اسلام کی تبلیغ ہونی چاہیے۔ اب اُنہوں نے اقبال کو وہاں بھیجنے کی تجویز پیش کی۔

۲۸ مارچ کو پیسہ اخبار نے لکھا کہ تجویز محض جوش میں پیش کی گئی ہے اور خود اقبال کہتے ہیں کہ جب مولوی برکت اللہ بھوپالی تین سال جاپان رہ کر اور اخبار نکال کر بھی دو تین سے زیادہ جاپانیوں کو مسلمان نہ بنا سکے تو میں کیا کر لوں گا۔

پیسہ اخبار کی رائے تھی کہ اقبال اپنے ملک میں رہتے ہوئے ہی قوم کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔[62]

84

اپریل میں فوق کے اخبار کشمیری کسی غلام محمد امرتسری کے قلم سے جو لاہور میں رہتے تھے اور کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے اقبال کی اُس تقریر کا خلاصہ شائع ہوا جو اقبال نے ۱۹ فروری والے جلسے میں مسلم یونیورسٹی کے موضوع پر کی تھی۔

امرتسری نے لکھا کہ اقبال کی خصوصیت صرف یہی نہیں کہ وہ کشمیری ہیں بلکہ اُن کا علم و تبحر بھی مسلمہ ہے۔[63]

85

۱۱ اپریل کو نظم 'شمع اور شاعر' کے کچھ بند زمیندار میں تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے۔[64]

۱۶ اپریل کو جب لندن کے اخباروں میں پہلے پہل یہ خبر شائع ہوئی کہ پچھلے روز دُنیا کا سب سے بڑا بحری جہاز ٹائٹینک بحرِ اوقیانوس میں غرق ہو گیا ہے تو لاہور میں اُس وقت اسلامیہ کالج کے سامنے بڑے میدان میں انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہو رہا تھا۔

منتظمین نے اقبال سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنی طویل نظم دو نشستوں میں سنائیں تاکہ انجمن کے دو بڑے سرپرستوں کی یہ خواہش پوری ہو جائے کہ نظم ان کی صدارت میں پڑھی جائے۔

پہلی نشست کی صدارت کے لیے فقیر سید افتخار الدین ہوشیارپور سے آئے ہوئے تھے۔ظفر علی خاں دس ہزار کاپیاں چھپوا کر لائے تھے اور ایک کاپی کی قیمت پچاس پیسے تھی۔اپنی دھواں دھار تقریر میں انہوں نے کہا کہ نظم کی فروخت سے جو پانچ ہزار روپے جمع ہوں گے وہ ڈاکٹر اقبال صاحب کو دے کر اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے جاپان بھیجا جائے گا۔[۱۵]

اقبال جلسہ گاہ میں پہنچے تو گوجرانوالہ کے حافظ جھنڈا پنجابی میں اپنی نظم پڑھ رہے تھے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مولانا ظفر علی خان کو اُردو میں اس کا ترجمہ کر کے بتا رہے تھے۔کہتے ہیں کہ جلسے سے پہلے طلبہ کے درمیان تقریروں اور نظموں کا مقابلہ ہوا تھا اور انعامات میں سے ایک آئینہ بھی تھا جو میز سے گر کر ٹوٹ گیا۔اقبال نے یہ دیکھا تو اپنی نظم سے پہلے سنانے کے لیے جو غزل لائے تھے اُس میں ایک اور شعر کا اضافہ کر دیا۔[۱۶]

جس طرح نو برس پہلے فریادِ اُمت لکھنے سے پہلے ایک غزل اُس کی تمہید میں کہی تھی اُسی طرح آج کی غزل کا بھی اُن کی نظم سے کوئی خاص تعلق محسوس ہو رہا تھا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز

میں

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمہائے سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نظم کی تمہید میں اقبال نے ایک مختصر تقریر کی۔

''جو نظم پچھلے سال لکھی تھی وہ شکوہ تھا،'' اُنہوں نے حاضرین سے کہا۔ ''اور اُس میں خدا سے شکایت تھی اور بعض لوگوں نے اُسے برا خیال کیا اور یہ سمجھا کہ یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ میں نے بھی یہی خیال کیا لیکن تو بھی وہ اِس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک کئی ہزار خطوط اس کی تعریف کے میرے پاس آچکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بات جو کہ لوگوں کے دلوں میں تھی وہ ظاہر کر دی گئی لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ میرا شکوہ خدا کو بھی پسند آیا۔ خیر اگر وہ نہ بھی بخشے تو میں تو یہی کہوں گا:

یہ بھی رحمت ہے تیری تُو نے دیا دوزخ مجھ کو
میرے مکافات کی تو یہ بھی جگہ نہ تھی

''اِس کے لیے میں نے خود ایک سزا تجویز کی ہے کہ میں اپنی شکایت کروں تا کہ معاوضہ ہو جائے۔ میں اپنی نظم پر خاص توجہ انگریزی یافتہ نوجوانوں کو دلاتا ہوں۔ میرا شعر لکھنا خاص خاص احساس کا ایک نمونہ ہے۔ میری آج کی نظم ایسی جامع ہے جس میں مشکلات کی تصویر اور اس کے حل کرنے کا نسخہ درج ہوگا۔ اس لیے آپ اس کو دونوں حیثیتوں سے دیکھیں۔ ایک شاعرانہ پہلو سے، دوسرے تجاویز نسخے کے لحاظ سے اور اس لیے عرض ہے کہ تعلیم یافتہ خاص کر توجہ فرمائیں۔

''یہ زمانہ اہلِ اسلام کی تاریخ میں سخت پولیٹکل ٹائم ہے۔ خدا کے واسطے تم توجہ کرو اور

اسلام کی عزت بڑھانے کے لیے پوری سرگرمی سے کام لو۔میری نظم کا عنوان 'شمع اور شاعر' کا مناظرہ ہے۔''

نظم شروع ہوئی تو پچھلے برس کی طرح اس دفعہ بھی حاضرین نے ترنم سے پڑھنے کی فرمائش کی مگر اس دفعہ بھی اقبال نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود بہتر سمجھتے ہیں کہ نظم کیسے پڑھنی چاہیے۔دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو ایک شخص جو پشاور سے آیا تھا اور دُور کھڑا تھا اُس نے فارسی شعر میں اقبال سے اونچا پڑھنے کو کہا جس پر اقبال نے نظم پڑھنا بند کر دی اور شعر ہی میں کہا کہ اگر تمہارے کان سُنتے ہیں تو سنو، دوسروں کو بدمزہ مت کرو۔ مجمع میں پہلے شور ہوا اور پھر مکمل خاموشی جس پر اقبال نے دوبارہ نظم پڑھنا شروع کی۔

''پورا جلسہ جو ہزاروں افراد پر مشتمل تھا، بالکل حیرت زدہ سا معلوم ہوتا تھا۔وقتاً فوقتاً واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی تھیں،'' غلام رسول مہرؔ کا بیان ہے۔چھ بند سنانے کے بعد اقبال تھک کر بیٹھ گئے۔وقفے کے بعد دوسری نشست شروع ہوئی جس کی صدارت مرزا سلطان احمد کر رہے تھے۔وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بڑے صاحبزادے تھے مگر احمدی نہیں تھے۔عمر باسٹھ برس تھی مگر ہر عمر کے اہلِ ذوق میں گھل مل جاتے تھے۔اردو، عربی اور فارسی میں لکھتے تھے۔

اُنہوں نے رسمی تقریر کرنے کے بعد یا اُس سے پہلے اقبال کی طرف دیکھ کر ازراہِ مذاق کہا، ''اقبال بڑا ہرجائی ہے۔کبھی فقیر کا ساتھ دیتا ہے اور کبھی سلطان کا!'' شاید انہوں نے لفظ ''اقبال'' سے اُسی طرح کھیل کھیلا تھا جس طرح اقبال خود کھیلتے تھے، یعنی اسے لغوی معنوں میں استعمال کیا تھا۔

اقبال نے وہیں کھڑے کھڑے فارسی میں ایک قطعہ بنا کر پڑھ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میرے مخلص ہم نشیں نے مجھ سے کہا کہ انجمن میں ہرجائی مت کر بیٹھو کہ کبھی فقیر کے ساتھ ہو اور کبھی سلطان کے ساتھ، مگر میں نے جواب دیا کہ ظاہری فرق کے طلسم سے باہر آئیے کہ میری روح میں عشق کی شمع جل اٹھی تو اُس نے مجھے بھی جلا دیا اور دوئی

کے اسباب کو بھی راکھ کر دیا!

قطعہ برجستہ تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ آخر میں شمع ہی کا استعارہ آیا تھا جو اقبال کی اُس روز کی نظم کا موضوع تھا۔ یہ شاید آخری موقع تھا کہ اقبال نے اپنے آپ کو مٹانے کی بات کی۔

''اِس نظم کے پڑھتے وقت حاضرین کی جو کیفیت تھی اُس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے،'' انجمن کی رپورٹ میں لکھا گیا۔ ''فی الحقیقت... ڈاکٹر صاحب تو شاعری کی شمع بنے ہوئے تھے اور حاضرین پروانے۔ رقت اور اس وجدانی کیفیت کی تصویر کا حال وہی خوب جانتے ہیں جو اس مجمع میں اپنے پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتے تھے اور ذوقِ سلیم سے بہرہ ور تھے۔''[۶۷]

87

۱۹ اپریل کو زمیندار میں اکبرالہ آبادی کا خط شایع ہوا۔ 'شمع اور شاعر' کے جو بند آٹھ روز قبل زمیندار میں شائع ہوئے تھے اکبر نے ان کی تعریف کرکے یہ رباعی لکھی تھی:

اِس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نُور
ہر حرف سے ہے تجلّی کا ظہور
اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور[۶۸]

88

اُسی مہینے کسی وقت بیگم صاحبہ بھوپال نے دو برس کے لیے شبلی کے لیے دو سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تا کہ وہ سیرۃ النبیؐ لکھنے کے منصوبے پر عمل کر سکیں۔ بیگم صاحبہ کے بیٹے نوابزادہ حمید اللہ خاں نے اپنی طرف سے دو ہزار روپے کتابوں کی خریداری کے لیے منظور کیے۔

کتاب لکھنے کا سامان ہو گیا۔

89

۱۲ مئی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا جس میں تعلیم کے بارے میں اُس قرارداد پر غور کرنے کے بعد جو اقبال نے فروری کے جلسے میں منظور کروائی تھی بارہ ارکان پر مشتمل ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی جس میں اقبال بھی شامل تھے۔''

90

ولیم روتھن اسٹائن ایک انگریز مصور تھے۔ ادبی حلقوں میں کافی پہنچ رکھتے تھے۔ اُس سال رابندرناتھ ٹیگور انگلستان آئے تو راستے میں اپنی بنگالی کتاب 'گیتان جلی' کی بہت سی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرلیا۔ روتھن اسٹائن سے ملاقات کر کے اُنہیں یہ ترجمہ دکھایا تو روتھن اسٹائن نے اپنے گھر ایک محفل سجائی جس میں آئر لینڈ کے شاعر اور نقاد ولیم بٹلر ییٹس نے یہ ترجمہ ایذرا پاؤنڈ، مے سنکلر، ارنسٹ رہس اور دوسرے دانشوروں کو پڑھ کر سنایا۔ سب بہت متاثر ہوئے۔

91

''میکلوڈ روڈ پر اُس وقت کے میلارام تالاب کے سامنے ایک کوٹھی تھی جس میں اُن دنوں مولانا ظفر علی خاں مقیم تھے،'' پروفیسر حمید احمد خاں کا بیان ہے۔ ''میرے بچپن کا کچھ حصہ اسی مکان میں گزرا... شدید گرمی کی اس دوپہر کی بعض کیفیتیں میرے حافظے پر نقش ہیں... اقبال اُس وقت ننگے سر فرش پر بیٹھے ایک سفید براق قمیص اور اتنی ہی براق شلوار میں ملبوس تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اقبال کا ہنستا ہوا سرخ و سفید چہرہ سنجیدگی سے کوسوں دُور ہے۔ لطیفوں پر قہقہے گونج رہے ہیں اور بارہا اقبال ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔''

92

اپنے اوپر طنز کر کے اُس کا جواب دینا اقبال کا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ اب جو ایک عرصے سے ان کی شاعری گزرے ہوئے زمانے کی مصور بن کر رہ گئی تھی اُس کا بھی احساس تھا چنانچہ جون میں 'مسلم' کے عنوان سے نظم لکھی جس میں بظاہر کسی دوسرے کی زبانی خود کو مخاطب کروا کے کہا تھا کہ شمعیں جلا کر گزری ہوئی رات کو روشن نہیں کیا جا سکتا۔ پھر خود ہی جواب دیا کہ میں تو ماضی کے آئینے میں مستقبل کے نقوش دیکھتا ہوں۔

93

جون میں الندوۃ میں جہاد پر مضمون شائع ہوا جسے لکھنے والے رسالے کے نئے مدیر مولوی عبدالکریم تھے جبکہ شبلی پچھلے مہینے رسالے سے استعفٰی دے چکے تھے۔

ندوۃ العلماٗ کی انتظامیہ نے مولوی عبدالکریم کو انگریز سرکار کے خلاف باغیانہ خیالات لکھنے پر چھ ماہ کے لیے نوکری سے نکال دیا۔

94

رسول اکرمﷺ کی سیرت پر جن یورپیوں نے لکھا تھا شبلی کے خیال میں ان میں سے کچھ عربی زبان و ادب سے ناواقف تھے، بعض مذہبی لٹریچر اور سیرت نگاری کے فن سے آگاہ نہیں تھے اور بعض ان سب پر عبور رکھتے تھے جیسے مارگولیوس اور اسپرنگلر مگر شبلی کو حیرت تھی کہ ان کا بھی 'دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں' والا حال تھا۔

شبلی نے تصورات کی فہرست بنائی جو واقف اور ناواقف یورپین مصنفوں کی کتابوں میں مشترک تھے:

ا۔ آنحضرتﷺ کی زندگی ملّہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے لیکن مدینہ جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو پیغمبری دفعتہً بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ کثرتِ ازدواج اور میل الی النساَ

۳۔ مذہب کی اشاعت، جبر اور زور سے

۴۔ لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل

۵۔ دُنیا داروں کی سی حکمتِ عملی اور بہانہ جوئی

چونکہ یورپ میں سب سے پہلے وہ مصنف میدان میں اُترے تھے جنہیں مسلمانوں کی کتابوں سے واقفیت ہی نہیں تھی۔ اُنہوں نے رسولِ اکرمؐ کے بارے میں جو تصورات بغیر تحقیق کے رائج کیے بعد میں آنے والے یورپی مصنفین اپنی قابلیت اور واقفیت کے باوجود ان تصورات کے پابند رہے۔

دل آزاد نہ ہو تو ذہن بھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ صرف معلومات صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا سکتیں کیونکہ صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے صحیح اور غلط کا تعین کیا ہوا نہ ہو۔ دوسری صورت میں انسان درست معلومات کو بھی غلط تصورات کے سانچے میں ڈھال کر غلط نتائج اخذ کرسکتا ہے۔

95

اقبال کی طبیعت فارسی مثنوی کی طرف آ کر پلٹ جاتی تھی:

رفت و زخاکِ رہش برقِ تجلی دمید۱؎

96

اقبال گرمیوں کی تعطیلات میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے اور دوپہر کے وقت اپنی والدہ امام بی بی کے کمرے میں آرام کر رہے تھے جو گلی کی طرف تھا۔ عین کمرے کے نیچے میدان میں اعجاز احمد، آفتاب اور دوسرے لڑکے کھیل رہے تھے۔

پڑوس میں آٹھ نو برس کی ایک قبول صورت لڑکی اللہ رکھی، یتیم ہونے کی وجہ سے اپنی پھوپھی کے پاس رہتی تھی۔ اُسے دیکھ کر آفتاب کی زبان سے نکل گیا:

رکھی۔ رکھی۔ رکھی۔ تیرے منہ تے بیٹھی مکھی

لڑکی نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا اور اس کی آواز سن کر اُس کی زبان دراز پھوپھی پہنچ گئی۔ ''آفتاب بھائی کی قافیہ آرائی کا حال سن کر اُس نے نثر میں 'شاعر' کی سات پشتوں کو پن ڈالا'' اعجاز احمد کا بیان ہے۔ ''یہ ہنگامہ برپا تھا کہ ملازم لڑکا ہماری طلبی کا حکم لے کر آیا۔ ہم سب ڈرتے ڈرتے چچا جان [اقبال] کے حضور حاضر ہوئے۔ یقین تھا کہ آج سب کی پٹائی ہوگی...''

اقبال خاموشی سے اُٹھے، کھونٹی پر بہن کا سفید ململ کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ اُسے لے کر آفتاب کے دونوں ہاتھ باندھ کر کمرے کے کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا۔ کچھ دیر بعد امام بی بی نے آ کر آفتاب کی جان چھڑائی۔

''آفتاب بھائی نے اپنی حیات میں فلسفہ، قانون اور نہ جانے اور کس کس میدان میں اپنے اشہبِ طبع کو دوڑایا لیکن قافیہ آرائی کے میدان کی طرف پھر رُخ نہیں کیا،'' اعجاز احمد کا بیان ہے۔[۴۲]

97

عطا محمد اُن دنوں کیمبل پور میں تعینات تھے۔ اتفاق سے کیمبل پور کے کوئی صاحب اقبال کو وکیل کرنے سیالکوٹ پہنچ گئے۔ اقبال سفر سے گھبراتے تھے مگر بھائی سے ملاقات کا بہانہ سمجھ کر قبول لیا۔

اعجاز احمد کی عمر تیرہ برس تھی۔ اقبال نے اُنہیں بھی ساتھ لے لیا۔

کیمبل پور میں مولوی احمد دین نے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی جس میں بہت لوگ شامل تھے۔ غالباً یہ وہی موقع تھا جس کے بارے میں اعجاز احمد کا بیان ہے کہ انگریز حکام بھی مدعو تھے لہٰذا شراب میسر تھی مگر اقبال نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس چیز کو یورپ میں رہ کر منہ نہ لگایا اُسے اب کیا پیوں گا۔

تین چار دن بعد کیمبل پور سے واپسی ہوئی۔ گاڑی آدھی رات کے قریب وزیر آباد جنکشن پہنچی جہاں سے سیالکوٹ کے لیے دوسری گاڑی لینی تھی جو دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور صبح پانچ بجے روانہ ہونے والی تھی۔ اقبال اور اعجاز اُس میں بیٹھ گئے تو اقبال کو حقے کی طلب ہوئی اور قلی سے ایک روپیہ انعام کا وعدہ کیا۔ وہ کچھ دیر بعد ایک بوسیدہ سا حقہ لے آیا جس کا پیندا مٹی کا تھا اور چلم بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔

اقبال بہت خوش ہوئے، اپنا بستر جو بستر بند میں بندھا ہوا تھا پلیٹ فارم پر رکھوا کر اُس پر بیٹھ گئے اور قلی کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ دیر تک دونوں باری باری حقے کے کش لگاتے رہے اور بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔

اقبال ڈبے میں واپس آئے تو اعجاز نے سیٹ پر بستر لگا دیا۔ وہ لیٹ گئے تو اعجاز نے کہا کہ حقہ تو بہت ہی گندا تھا۔ اقبال نے کہا، ''جس کو تمباکو نوشی کی عادت ہو جائے اُسے طلب کے وقت اِن نفاستوں کا خیال ہی نہیں آتا۔'' پھر ذرا ٹھہر کر کہا، ''تم اِس کی عادت نہ ڈالنا۔''

''اِس واقعے سے میرے ذہن پر پہلا اثر تو یہ ہوا کہ باوجود اپنے رُتبے اور علم کے چچا جان نے ایک غریب مزدور کے ساتھ بیٹھ کر بے تکلفانہ گفتگو کرنے اور حقہ نوشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی،'' اعجاز احمد کا بیان ہے۔ ''دُوسرا تاثر یہ تھا کہ تمباکو نوشی اچھی عادت نہیں کہ حقے کے صاف اور نا صاف ہونے کا خیال بھی نہیں رہتا۔''[۴۳]

معلوم ہوتا ہے اقبال نے جون کے آخر میں خواجہ حسن نظامی کو کچھ رقم نیاز کے لیے بھجوائی تھی کیونکہ ان کے نام اقبال کا ایک خط ۲۴ جون ۱۹۱۲ء کا لکھا ہوا موجود ہے، ''مکرمی! ۱۲ روپیہ جس طرح آپ کے خیال میں آئے خرچ کر دیجیے۔ حلوا پکا دیجیے یا خانقاہ کے متعلقین میں تقسیم کر دیجیے۔ آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے مگر کیا کروں، علائق نہیں چھوڑتے۔ روٹی کا دھندہ لاہور سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ کیا کروں، عجب طرح کا

قفس ہے۔"

ممکن ہے یہ بارہ روپے عطا محمد نے بھجوائے ہوں کیونکہ انہیں نیاز دلوانے کا شوق تھا۔

99

۴ جولائی کو اقبال نے جامع مسجد دہلی کی تصویر والا پوسٹ کارڈ ایما کے نام ارسال کیا۔

"آپ کے خط کے لیے بہت شکریہ" انہوں نے لکھا۔ "براہِ کرم مجھے لکھیے کہ آپ کیسی ہیں؟ ان دنوں لاہور میں بے حد گرمی ہے۔ ہم ایک دوزخ میں رہ رہے ہیں۔ میں جرمنی کو کبھی نہ بھول سکوں گا...محترمہ پروفیسر صاحبہ کا کیا حال ہے؟ میرے خیال میں گھر بھرا ہوا ہوگا۔ یہ دلّی کی جامع مسجد ہے۔"

100

ابوالکلام آزاد کچھ عرصہ الحاد سے قریب رہنے اور پھر کسی کے عشق سے گزرنے کے بعد دو برس پہلے اِس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی جوڑ نہیں چنانچہ مذہبی عقاید اور عقل کو ذہن کے الگ الگ خانوں میں رکھنا چاہیے۔ ایمان پختہ ہو گیا۔

سیاست میں اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لینا چاہیے۔

۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو انہوں نے کلکتہ سے الہلال اخبار جاری کیا۔ اس کی نثر حیرت انگیز تھی۔ لفاظی بہت تھی اور لب و لہجہ بائیس سالہ مدیر کی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کی وجہ سے گراں بھی گزرتا تھا مگر عام اخباری زبان کے مقابلے میں یہ نثر الہلال کو ایک آسمانی شان عطا کرتی تھی۔[۴]

101

۸ اجولائی کو پیسہ اخبار نے اپنے اداریے میں لکھا کہ عنقریب منتخب ہونے والی نئی کونسل میں بھی بیرسٹر جناح کو شامل ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنے لکھے ہوئے مسودے کی وضاحت کر کے وقف بل کو منظور کروالیں۔ مسلمان انہیں منتخب نہ کریں تو حکومت خود نامزد کردے۔

''افسوس ہے کہ آنریبل مسٹر جناح نے امپیریل کونسل میں اسلامی فوائد کی کافی نگہداشت نہ کی اور اکثر معاملات پر اُن سے خلافِ توقع رائیوں کا اظہار ہوا،'' اداریے کے آخر میں لکھا گیا تھا۔ ''خصوصاً آنریبل مسٹر باسو کے مسودہ شادی پر انہوں نے شرع اسلام کی ترمیم میں کوئی حرج نہ دیکھا جس پر اہلِ اسلام کا اُن سے کبیدہ خاطر ہونا بالکل سچا ہے اور اُن کے انتخاب کی بہت ہی کم اُمید لگائی جاسکتی ہے۔''

یہ عجیب منطق تھی کہ اگر ایک رہنما کو مسلمان خود ووٹ نہ دیں تو حکومت مسلمانوں کی دلجوئی اس طرح کرے کہ اُسی رہنما کو خود مسلمانوں کی اضافی نشست کے لیے نامزد کر دے۔ یہ سیاسی شعور کا وہی فقدان تھا جسے محمد علی جوہر جذباتی اقدامات کی مدد سے دُور کرنا چاہتے تھے، شبلی نعمانی سمجھنے سے قاصر تھے اور اقبال جس کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھا رہے تھے۔

102

مولوی میر حسن کے چھوٹے بھائی سید عبدالغنی جن کے بیٹے احسان کی وجہ سے طالب علمی کے زمانے میں اقبال کی زبان سے میر حسن کے سامنے یہ مصرع نکل گیا تھا، ''تیرا احسان بہت بھاری ہے،'' اُن دنوں پنجاب کے قصبے دینا نگر میں تھے جہاں انہوں نے آریہ سماجی ہندوؤں کے مقابلے پر ایک انجمن نصرت الاسلام بنائی تھی جو مختلف علماٗ کو دینا نگر آنے کی دعوت دیتی تھی۔

اُنہوں نے جولائی میں اقبال کو بھی دعوت دی مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ ''میں

نے تو پبلک لائف بوجوہ ترک کر دی ہے،'' اقبال نے ۲۰ جولائی کو سید عبدالغنی کے نام اپنے مختصر خط میں لکھا۔

سید عبدالغنی کے چھوٹے لڑکے سید نذیر نیازی اُس وقت کم سن تھے۔

103

اقبال نے کئی لوگوں کو الہلال کا مستقل خریدار بنا کر اُن کے پتے اخبار کے دفتر روانہ کر دیے۔ ۵۷

104

بہت دنوں سے گرامی کا کوئی خط موصول نہیں ہوا تھا۔ اقبال نے بڑے مزے سے انہیں لکھا:

لاہور

۳ ستمبر ۱۲ء

مخدومی جناب مولانا مولوی گرامی صاحب

آپ کا تخلص گرامی کی جگہ ''نومی'' ہونا چاہیے تھا کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راون لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔

حیدر آباد کی شاہی میں تبدیلی ہوئی، وزارت بدل گئی مگر آپ ابھی اونگھ رہے ہیں۔ برائے خدا کبھی خیریت سے مطلع کیا کرو۔ آپ کے بہت سے لاہوری دوست استفسار کرتے ہیں تو مجھے یہی جواب دینا پڑتا ہے کہ مولانا گرامی آرام میں ہیں۔ اکثر تو یہ کہتے ہیں کہ ان کو خط لکھ کے جگائیے مگر اس کے لیے شورِ محشر کی ضرورت ہے، خطوں سے کیا ہوتا ہے۔ کب تک لاہور آنے کا قصد ہے؟ ہم نامِ اقبال سلام قبول کریں، نیز اُن سے درخواست ہے کہ مولوی گرامی یعنی ''شیخِ نامی'' سے جس طرح بن پڑے خط لکھوائیں۔

والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال از لاہور

ہم نامِ اقبال سے مراد گرامی کی بیگم تھیں جن کا نام اقبال تھا اور ترک تخلص کر کے شعر بھی کہتی تھیں۔

105

ضلع لائل پور کے چک جھمرہ میں کوئی شاکر صدیقی تھے جنہیں شعر کہنے کا شوق تھا۔ مخزن کے معاون مدیر کیسر اسنگھ نے انہیں اقبال سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا۔

''شاعرانہ خیالات و سوز و گداز، یہ سیکھنے سکھلانے کی شے نہیں، قدرتی بات ہے،'' اقبال نے ۷ ستمبر کو یا اس کے قریب شاکر کے خط کے جواب میں لکھا۔ ''...مجھ کو اپنے ضروری مشاغل سے فرصت کہاں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اپنے سر پر لوں۔ میں نے آپ کے اشعار پڑھے ہیں، میری رائے میں آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں تو اچھا ہے۔''

106

یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے
باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے

غزل ۶

107

ستمبر ۱۹۱۲ء میں شیخ عطا محمد ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔

اُن کے تینوں لڑکے ابھی اسکول میں پڑھتے تھے اور اُن سے چھوٹی دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادی کے فرائض ابھی باقی تھے جبکہ نوکری سے بچائی ہوئی کوئی رقم اگر تھی تو وہ مکان کی تعمیر پر صرف ہو چکی تھی۔ چنانچہ عطا محمد کوئی دوسری نوکری

تلاش کرنے کی فکر میں رہنے لگے اگرچہ اقبال اس کے حق میں نہیں تھے۔

اقبال اس بات کو اپنے ذمے اخلاقی قرض سمجھتے تھے کہ بھائی کی اولاد کے لیے کم سے کم اُتنا ضرور کر دیں جتنا بھائی نے اُن کے لیے کیا تھا۔‘‘

108

ایک دن محمد دین فوق نے اقبال سے اسلامی احکام کے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ اقبال نے اپنے جوابات میں دو باتوں پر زور دیا۔

پہلی بات یہ تھی کہ اسلامی احکام کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ پر قابو پانا سیکھے۔ چنانچہ نماز کے اوقات کے تعین میں اور روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کے فرض کرنے میں ایک طرح سے مسلمانوں کا بہت بڑا امتحان ہے کہ وہ دن کے ہر مرحلے پر اور زندگی کے ہر موڑ پر خدا کے احکام کی خاطر کس حد تک قربانی دینے پر تیار ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ اقبال کے نزدیک اسلامی تصوف دراصل شریعت کی ایسی ہی پابندی کا نام تھا۔ بعد کے لوگوں نے جس طرح شریعت سے روگردانی کے لیے شاعرانہ تاویلیں دریافت کی تھیں وہ نہ صرف اسلام کے خلاف تھیں بلکہ حقیقی تصوف سے بھی دُور تھیں۔

’’غرض ارکانِ اسلام کی پابندی مسلمانوں کا عظیم امتحان ہے،‘‘ اقبال نے کہا۔ ’’اور دراصل اسی کا نام اسلامی تصوف ہے کیونکہ شعائرِ اسلام کی پابندی سے رُوح کو وہ تدریجی تربیت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں تبتل الی اللہ کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔‘‘[۸]

109

۱۶ اکتوبر کو اقبال انجمن حمایت اسلام کی تالیف و اشاعت کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے۔ کالج کمیٹی کے رکن وہ پہلے ہی سے تھے مگر اب اس تقرر کی توسیع بھی ہوئی۔[۹]

110

علیحدہ مسلم قومیت کے خلاف شبلی نعمانی کی قومی جنگ زور شور سے جاری تھی۔

۱۹ اکتوبر کو مسلم گزٹ میں 'مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ' کی چوتھی قسط شائع ہوئی جس میں شبلی نعمانی نے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی بت شکنی اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ بدسلوکی کا تذکرہ بھی کیا۔ اب اکبرِ اعظم اُن کا ہیرو تھا۔

اُسی روز الہلال میں اُن لوگوں کے ناموں کی فہرست شائع ہوئی جنہوں نے خریدار مہیا کیے تھے۔ دہلی کے کسی بزرگ نے سب سے زیادہ یعنی بارہ خریدار مہیا کیے تھے مگر اپنا نام چھاپنے سے منع کیا تھا۔ دوسرے نمبر پر اقبال کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جنہوں نے دس خریدار مہیا کیے تھے۔[۸۰]

اُسی مہینے کسی وقت امام بی بی بیمار ہوئیں اور اقبال سیالکوٹ چلے آئے۔ بیماری نے طول کھینچا تو کئی روز وہیں رہنا پڑا۔

111

اُس زمانے میں لاہور میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ "ایک مسلمان رئیس نے اپنے آبائی قبرستان کو فروخت کر کے بہت سا روپیہ پیدا کیا،" اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کا بیان ہے۔ "لاہور کے مسلمانوں میں اس وجہ سے اس شخص سے اس قدر نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ خود اس کے اعزہ نے اس سے قطع تعلق اور عدمِ تعاون کر لیا تھا۔"[۸۱]

112

عثمانی سلطنت مشرقی یورپ کی چار عیسائی ریاستوں کے نرغے میں تھی۔ اکتوبر کے آغاز میں مونٹینگرو نے حملہ کیا تھا اور چند روز بعد سربیا، بلغاریہ اور یونان بھی جنگ میں شامل ہو گئے تھے۔ ان سب کا مطالبہ تھا کہ بلقان کے ان علاقوں کو ان کے حوالے کر دیا

جائے جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی اور جنہیں عثمانی شہنشاہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں فتح کیا تھا۔ عام طور پر شکایت کی جاتی تھی کہ تُرک یہاں کے باشندوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

چند روز کی جنگ کے بعد نہ صرف عیسائی علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے بلکہ خود دارالحکومت قسطنطنیہ کی حفاظت کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ جو سپاہی ایک سال سے طرابلس میں اٹلی کا مقابلہ کر رہے تھے اُنہیں واپس بلانے کی ضرورت پڑی اور ۱۸ اکتوبر کو عثمانی سلطنت نے طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔

بلقان میں جنگ جاری رہی۔

113

شبلی نے دردناک نظم لکھی جس میں خدشہ ظاہر کیا کہ سلطنتِ عثمانیہ مٹ گئی تو اسلام مٹ جائے گا اور دنیا سے توحید ختم ہو جائے گی۔ 'شہر آشوبِ اسلام' خاص و عام کی زبان پر جاری ہو گئی:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

114

''خط و کتابت سے بھی معذور ہوں بلکہ ضروری مشاغل بھی بوجہ [والدہ] کی علالت چھوٹ گئے ہیں،'' اقبال نے ۲ نومبر کو اسمٰعیل میرٹھی کے نام خط میں لکھا جن کے اردو گرامر کے بارے میں کچھ سوالات کئی روز پہلے موصول ہوئے تھے۔ ''لاہور جاؤں گا تو آپ کے سوالات کا جواب لکھنے کی کوشش کروں گا مگر میں تو اردو زبان کا ماہر نہیں، اور بالخصوص گرامر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے خیال میں آپ مولوی فتح محمد صاحب جالندھری سے خط و کتابت کریں جنہوں نے حال میں ایک کتاب اردو گرامر پر تصنیف

کی ہے اور وہ کتاب اچھی ہے۔"

115

۳۱ اکتوبر کو شتلجہ کا اہم قلعہ عثمانی سپاہیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ حملہ آوروں کے خلاف قسطنطنیہ کے دفاع میں یہ آخری محاذ تھا۔

116

۱۳ نومبر کو الہلال میں گیارہ سالہ عرب بچی فاطمہ بنت عبداللہ کی تصویر اس سرخی کے ساتھ شائع ہوئی کہ یہ مجاہدہ 'غزوہ طرابلس' میں شہید ہوئی۔

جن دنوں ترک طرابلس میں اٹلی کا مقابلہ کر رہے تھے انہوں نے مقامی عرب آبادی کی مدد بھی حاصل کی تھی جس میں عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں۔ کم سن لڑکیاں سپاہیوں کو پانی پلانے کا کام کرتی تھیں۔ انہی میں فاطمہ بنت عبداللہ تھی۔ دو ترک ڈاکٹر جنہوں نے اسے میدانِ جنگ میں زخمیوں کی خدمت کرتے دیکھا تھا ان کا بیان تھا کہ جون کے ایک معرکے میں وہ کسی زخمی ترک سپاہی کو پانی پلا رہی تھی جب ایک اطالوی نے اسے گریبان سے پکڑ لیا مگر اس نے کہیں سے تلوار اٹھا کر ایسا وار کیا کہ اطالوی کی کلائی کٹ کر لٹکنے لگی۔ اس کے بعد فاطمہ دوبارہ پانی پلانے پلٹی تو اطالوی نے فاطمہ کا نشانہ لے کر بندوق چلا دی۔

الہلال کے اسی شمارے میں شبلی نعمانی کی نظم بھی شائع ہوئی جس میں علی گڑھ والوں کو برا بھلا کہا گیا تھا۔

117

اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ پر نظم لکھی:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

فاطمہ کی خاموش قبر میں کوئی ہنگامہ چھپا ہوا تھا۔ وہاں ایک نئی قوم پرورش پاتی دکھائی دے رہی تھی جس کے مقاصد کی وسعت ابھی ایک راز تھی جیسے کچھ ستارے امکانات کے اندھیرے سے اُبھرے ہوں مگر ابھی صبح و شام کی گردش کا حصہ نہ بنے ہوں۔ جن کی چمک میں نیا انداز بھی ہو، پرانا بھی اور فاطمہ بنت عبداللہ کے لہو کا عکس بھی۔

نظم میں آٹھ آٹھ اشعار کے دو بند تھے۔[۸۲]

118

مولانا ظفر علی خاں نے بین الاقوامی خبر رساں ادارے رائٹر سے رابطہ کر کے انگریزی اخباروں کی طرح تازہ خبریں منگوانے کا بندوبست کیا۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اعلان کر دیا کہ جنگ میں ترکوں کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کیا جائے گا جس کے لیے ۳۰ نومبر کو موچی دروازے کے باہر باغ میں مغرب کی نماز کے بعد جلسہ ہو گا اور اقبال نظم پڑھیں گے۔

119

مسلم یونیورسٹی کے مطالبے میں حکومت کے پاس کوئی وفد بھیجنے کے لیے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کو تین ارکان منتخب کرنے تھے۔

۱۹ نومبر کو ان کا چناؤ ہوا اور میاں فضل حسین ۲۵ ووٹوں سے، اقبال ۲۱ ووٹوں سے اور ملک عمر حیات خاں ۲۰ ووٹوں سے منتخب ہوئے۔

120

اٹلی کے خلاف ردِعمل زوروں پر تھا۔ موچی دروازے کے باہر محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں اٹلی کی بنی ہوئی ترکی ٹوپیوں سے گریز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم نے جو بٹالہ کا رہنے والا تھا سب سے پہلے اپنی ٹوپی اتار کر زمین

پر پھینکی۔ پھر ٹوپیوں کا ڈھیر لگ گیا۔[۸۳]

121

۲۵ نومبر کو عطیہ فیضی کی شادی ہوئی۔ دولہا یہودی آرٹسٹ سیموئیل رحمین تھا۔ مشہور ہوا کہ مسلمان ہو گیا ہے۔

122

وہ مایوسی جو یورپ سے واپسی کے بعد سے اقبال کے ساتھ لگی رہی تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی یا پھر 'جوابِ شکوہ' لکھتے ہوئے اقبال اُس سے باہر نکل آئے۔ اس میں انہوں نے خدا کی زبان سے کہلوایا کہ ایران مٹ بھی جائے تو مسلمان قوم کا وجود ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ تیرہویں صدی میں بغداد کے خاتمے کے بعد بھی یہی خطرہ پیدا ہو تھا مگر ہوا یہ کہ جن تاتاریوں سے خطرہ پیدا ہوا تھا اُنہوں نے خود ہی اسلام قبول کر لیا۔ یہ گویا اقبال اپنی اُس بات کا جواب دے رہے تھے جو علی گڑھ والے لیکچر میں انہوں نے ایران کی اہمیت کے حوالے سے کہی تھی۔

'جوابِ شکوہ' میں 'شکوہ' جیسی اٹھان پیدا نہیں ہو سکی تھی اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اقبال نے یہ نظم اُن دنوں لکھی جب وہ اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے کافی پریشان رہے تھے۔ اس کے علاوہ 'شکوہ' میں انسان کی ترجمانی تھی جو ہمیشہ سے ادب کا موضوع رہا ہے۔ 'جوابِ شکوہ' میں خدا کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ مشکل موضوع تھا اور اقبال کو اس میں زیادہ کامیابی کئی سال بعد جاوید نامہ اور بالِ جبریل میں حاصل ہوئی۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ 'جوابِ شکوہ' کو کسی ایک مرکزی خیال تک محدود رکھنا مشکل تھا۔ 'شکوہ' میں صرف ایک بات کی شکایت تھی، 'شمع اور شاعر' میں شکایت کے جواب میں صرف ایک بات کہی گئی تھی چنانچہ اُن نظموں میں خیال کی وحدت کی وجہ سے

شدت پیدا ہوئی تھی۔ 'جوابِ شکوہ' میں خدا کی طرف سے مفصل جواب تھا چنانچہ مسلمانوں کے سیاسی طاقت سے محروم ہونے کی تمام وجوہات کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری تھا۔ یہاں وہ شدت پیدا کرنا مشکل تھا جو خیال کی وحدت سے آتی ہے۔ اس نظم میں جو بھی تاثیر ہے وہ الفاظ کے خوبصورت انتخاب اور منفرد تشبیہوں کی وجہ سے ہے، مثال کے طور پر ہم عصر زمانے کو رات اور مسلمان کو دھندلا سا ستارا کہنا جو دنیا میں خدا کی کشتی کا واحد سہارا ہو۔ اسی طرح اقبال بہت دنوں سے اسلامی تمدن کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے تھے وہ یہاں اس طرح سامنے آیا تھا کہ اسلام کے درخت کو آبرومندی کا نمونہ اور سیکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا پھل قرار دیا گیا۔[۸۳]

'جوابِ شکوہ' کو صرف ایک اعتبار سے 'شکوہ' پر برتری حاصل ہے اور وہ افکار کا معاملہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب پر بات کرتے ہوئے تصویر کا وہ دوسرا رُخ سامنے آ گیا ہے جو 'شکوہ' میں نہیں آ سکتا تھا۔ شاعر کی شکایت کے جواب میں خدا اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ مسلمان اخلاقی اور تہذیبی کمزوریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ اُن کے رہنماؤں میں کردار کی توانائی موجود نہیں ہے، مفکروں میں غزالی والی بات نہیں رہی ہے اور عوام میں قومی زندگی کا شعور نہیں ہے۔

عورتوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے جو کوششیں ہو رہی تھیں اُن پر تنقید کرتے ہوئے اقبال کے ذہن میں شاید سجاد حیدر یلدرم کا قصہ 'لیلیٰ مجنوں' تھا کیونکہ اقبال نے طنز کیا کہ اگر قیس صحراؤں کو چھوڑ کر شہر کی تن آسانی کا عادی ہو جائے تو پھر یہی ہونا ہے کہ لیلیٰ بھی لکھنا لکھانا شروع کر دے اور رسالوں میں مضامین چھپوا کر پردے میں رہ کر بھی بے پردہ ہو جائے۔

دُوسری طرف مغربی اقوام نے اُن باتوں کو اپنا لیا ہے جو خدا کے مقاصد کی ترجمانی کرتی ہیں چنانچہ خدا کے انصاف نے انہیں انعامات سے نوازا ہے۔ یہ گویا وہی بات تھی جو اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے 'شکوہ' والے اجلاس میں اپنے لیکچر کے دوران

بھی کہی تھی کہ جدید تہذیب صحیح تمدنی اصولوں پر مبنی ہے۔

'جوابِ شکوہ' کا آغاز 'شکوہ' کی طرح براہِ راست نہ تھا مگر اس میں شاعر کی آواز کے عرش پر پہنچنے کی جس طرح منظر کشی کی گئی تھی وہ بعد میں اقبال کے سب سے بڑے شاہکار جاوید نامہ میں اور سنورنے والی تھی۔

جوابِ شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
اُڑ کے آواز مری تابفلک جا پہنچی
یعنی اس گل کی مہک عرش تلک جا پہنچی
جب مئے درد سے ہو خلقتِ شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش
کشورِ دل میں ہوں خاموش خیالوں کے خروش
چرخ سے سوئے زمیں شعر کو لاتا ہے سروش
قیدِ دستور سے بالا ہے مگر دل میرا
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا
پیرِ گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی
بولے تارے کہ سرِ عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا، نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا
تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا!
آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا!
غافل آداب سے سکان زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!
اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک' یہ وہی آدم ہے!
عالِم کیف ہے' دانائے رموزِ کم ہے
ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو
آئی آواز' سنی ہم نے کہانی تیری
پھونک ڈالے نہ تجھے شعلہ بیانی تیری

...

ہے عجب چیز مگر نغز زبانی تیری
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندے کو خدا سے تو نے
ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں
جس طرح احمدِ مختار ہے نبیوں میں امام
اس کی امت بھی ہے دنیا میں امامِ اقوام
کیا تمہارا بھی نبی ہے وہی آقائے انام؟
تم مسلماں ہو؟ تمہارا بھی وہی ہے اسلام؟
اس کی امت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
مے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اِس خُم میں نہیں
ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
کہیں تہذیب کی پُوجا کہیں تعلیم کی ہے
قوم دنیا میں یہی احمدِ بے میم کی ہے!
کِشورِ ہند میں کلیۂ ناکام کا بُت
عربستاں میں شفاخانۂ اسلام کا بُت
اور لندن میں عبادت کدۂ سام کا بُت
لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بُت
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، تم بھی نئے
یعنی کعبہ بھی نیا، بُت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا
نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا' اللہ کا سودائی تھا
کبھی معشوق تمھارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملتِ احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو!
کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمھی کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں
جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا ہو!

کیا کہا بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارکِ آئین رسولِ مختارؐ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب

نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمھارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے
واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے
شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود!
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!
دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک
عدل اس کا تھا قوی لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک
”خودگدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود“

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمھیں موت کا ڈر اُس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!
ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نَے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
تم ہو آپس میں غضب ناک وہ آپس میں رحیم
تم خطاکار و خطابیں وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا سریرِ کے بھی
یونہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟
خودکشی شیوہ تمھارا وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

عالمِ حاضر بھی پڑھا زائرِ لندن بھی ہوئے
مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے
صفتِ طائرِ گم کردہ نشیمن بھی ہوئے

حال ان کا مۓ نَو اور زبوں کرتی ہے
شبِ مہ سایہ کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے

قیس زحمت کشِ تنہائیِ صحرا نہ رہے
شہر کی کھائے ہوا بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے حجابِ رُخِ لیلا نہ رہے
شوقِ تحریرِ مضامیں میں کُھلی جاتی ہے
ہیچ کر پردے میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

عہدِنو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

یعنی ہونے کو ہے کانٹوں سے بیاباں خالی
گل برانداز ہے خونِ شہدا کی لالی
ساحلِ بحر پہ رنگِ فلک عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے
امتیں گلشنِ ہستی میں ثمرچیدہ بھی ہیں
اور محروم ثمر بھی ہیں خزاں دیدہ بھی ہیں
سیکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں
سیکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا
پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیرِ یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
"نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو"
تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خود داری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفَسِ اعدا سے
چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے
ہو نہ افسردہ اگر حل گئی تعمیر تری
رازِ توحید! حکومت نہیں تفسیر تری
تو وہ سرباز ہے اسلام ہے شمشیر تری
نظمِ ہستی میں ہے کچھ اور ہی تقدیر تری
کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

وسعتِ کون و مکاں ساز ہے مضراب ہے یہ
دہر مسجد ہے سراپا خمِ محراب ہے یہ
جامِ گردوں میں عیاں مثلِ مئے ناب ہے یہ
رُوحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے یہ
صوت ہے نغمۂ کُن میں تو اِسی نام سے ہے
زندگی زندہ اِسی نُور کے اتمام سے ہے

دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

انجم اُس کے فلک اُس کے ہیں زمیں اُس کی ہے
کیا یہ اغیار کی دُنیا ہے؟ نہیں اُس کی ہے

سجدے مسجود ہوں جس کے وہ جبیں اُس کی ہے
وہ ہمارا ہے امیں قوم امیں اُس کی ہے
طوف احمدؐ کے امینوں کا فلک کرتے ہیں
یہ وہ بندے ہیں ادب جن کا مَلَک کرتے ہیں
مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بردوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا!
بول اس نام کا ہر قوم میں بالا کر دے
اس شبِ مادہ پرستی میں اجالا کر دے[۸۵]

123

البانیہ مسلمانوں کا علاقہ تھا مگر وہ بھی ترکوں سے آزادی چاہتے تھے۔ ۲۸ نومبر کو وہاں خودمختار حکومت قائم ہو گئی۔

124

''عدن' کے عنوان سے جناب قبلہ آنریبل مولوی جسٹس شاہ دین صاحب جج عدالتِ عالیہ پنجاب کی ایک نظم جو نہایت معنی خیز ہے، اتفاق سے میرے ہاتھ آ گئی ہے...'' ۲۹ نومبر کو زمیندار اخبار میں جسٹس شاہ دین کی نظم کے ساتھ اقبال کا تعارفی خط شائع ہوا۔

شاہ دین، جو ہمایوں تخلص کرتے تھے، اُنھوں نے یہ نظم تین چار مہینے پہلے انگلستان جاتے ہوئے لکھی تھی جب بحری جہاز عدن کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ پانچ بند میں مسدسِ حالی کا خلاصہ کر کے اُس میں فلسفہ ملایا تھا:

بنی آدم بنا انساں جہاں میں انقلاب آیا
سوالِ اولیں کا عرشِ اعظم سے جواب آیا

آخر میں کہا تھا کہ اے ہمایوں، کیا عجب اِس چمن میں پھر بہار آئے اور گرد سے نکل کر ایک شہسوار نمودار ہو۔

125

۳۰ نومبر تک عثمانی حکومت حملہ آوروں سے امن کی درخواست کر چکی تھی جن کی فوجیں قسطنطنیہ کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ امن کی شرائط پر گفتگو شروع ہو گئی۔

اُس روز لاہور میں موچی دروازے کے باہر تقریر کرتے ہوئے ظفر علی خاں نے کہا، ''ہم لوگ بھی نظمیں کہتے ہیں مگر ڈاکٹر اقبال کی اور ہی بات ہے۔ وہ کبھی کبھی نظم کہتے ہیں مگر اس میں جبرئیل کی پرواز کا رنگ ہوتا ہے۔''

''فرشِ زمین کے علاوہ اردگرد کے درختوں اور نالے کے باہر مکانوں کے در و بام پر لوگوں کا ہجوم تھا،'' اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کا بیان ہے۔ چودھری شہاب الدین کرسیِ صدارت پر بیٹھے تھے۔ ایک روایت کے مطابق مولانا محمد علی جوہر بھی موجود تھے۔ آغا حشر کاشمیری نے مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق پر تقریر کی مگر جب اقبال نے 'جوابِ شکوہ' پڑھنی شروع کی تو ایک ایک صفحہ بکنے لگا۔ قومی جذبات اور قیمتیں پچاس روپیہ فی صفحہ تک بھی پہنچیں یہاں تک کہ وطن اخبار والے مولوی انشاء اللہ خاں نے دو صفحے ایک سو دس روپے میں خریدے۔ کہتے ہیں کہ عورتوں نے اپنے زیور تک دے ڈالے۔

شعلہ بیان مقرروں اور اقبال کی نظم نے ملا جلا کر چار ہزار سے کچھ اوپر روپیہ جمع کر لیا۔[۸۱]

126

کسی بیرونی یونیورسٹی سے پروفیسر صاحب آئے تھے۔ محمڈن ہال میں جلسہ ہوا جس میں اقبال نے معروضی اور موضوعی کیفیات کے موضوع پر انگریزی میں لیکچر دیا:

Subjective mind and objective mind

اقبال نے یورپ کے بعض مشہور فلسفیوں کی اغلاط کی نشاندہی کی، منطق کی پہلی شکل پر اعتراض کیے اور جنگِ طرابلس پر بھی گفتگو کی۔

''اس لیکچر میں فلسفے کے بعض طلبہ نے بھی حصہ لیا اور مولوی صدرالدین صاحب نے بھی اشارات پیش کیے،'' عبداللہ چغتائی کا بیان ہے مگر معلوم نہیں طلبہ کے حصہ لینے کی نوعیت کیا تھی۔ ممکن ہے سوال پوچھے ہوں یا اقبال نے لیکچر کے دوران اُنہیں اسٹیج پر بلایا ہو۔[۸۷]

127

''میری والدہ اور ڈاکٹر صاحب [قبال] کی والدہ چچیری بہنیں تھیں،'' اقبال کے ایک رشتہ دار جمشید راٹھور کا بیان ہے۔ ''میری والدہ کے والدین ذرا غریب تھے، ڈاکٹر صاحب کے والدین کی حالت ذرا اچھی تھی۔ میری والدہ غیور تھیں، اس خیال سے اپنی چچیری بہن کو ملنے نہیں جاتی تھیں کہ مبادا یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ کسی غرض سے آ رہی ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب کی والدہ اکثر آیا کرتی تھیں۔ آخری عمر میں کمزور ہو چکی تھیں۔ اُس زمانے میں دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں پر رکھے ہوئے آہستہ آہستہ چلا کرتی تھیں۔

''ایک دفعہ خدا جانے دونوں بہنوں میں کیا بات چیت ہوئی کہ ڈاکٹر اقبال کی والدہ نے میری والدہ سے کہا، 'میرے اقبال جیسا بچہ پیدا کرو تو میرے مقابلے پر آؤ!'''[۸۸]

128

جنگ بلقان سے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ دہلی میں ڈاکٹر

مختار احمد انصاری جو کانگریس کے سرگرم رکن تھے ایک طبی وفد لے کر ترکی جانا چاہتے تھے تاکہ جنگ میں زخمی ہونے والے ترکوں کی مرہم پٹی کریں۔ اس نیک کام کے لیے جن لوگوں نے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا اُن میں مولانا محمد علی سب سے آگے تھے۔

129

شبلی نعمانی اگر تیمور تھے تو رسالہ الندوۃ اُن کا سمرقند تھا جسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

آخر مولوی عبدالکریم کے اُس مضمون کی طرف ذہن گیا جو انہوں نے جون میں لکھا تھا اور رسالے کی انتظامیہ نے انہیں چھ ماہ کے لیے معطل کیا تھا مگر افسوس کہ شبلی کے صحیح مقام کی قدر کر کے اُن سے دوبارہ ادارت سنبھالنے کی درخواست نہ کی تھی۔ اب یہ انتظامیہ کے پاس گئے اور مطالبہ کیا کہ مولوی عبدالکریم کے مضمون سے جو حکومت کی ناراضگی کا خطرہ ہوا ہے اُس پر غور کرنے کے لیے ۱۳ جنوری کو اجلاس بلایا جائے ورنہ گورنر سے کہہ دیں گے۔[۸۹]

130

مغربی مورخوں کا طریقہ تھا کہ کسی بھی واقعے کو درج کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری خیال کرتے تھے کہ اُس واقعے کی وجہ کیا تھی اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس طریقے کی خوبیاں تو ظاہر تھیں مگر خامی یہ تھی کہ جہاں کسی واقعے کا سبب معلوم نہیں ہوتا تھا وہاں مصنف کو اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ بات بنانی پڑتی تھی۔

''اِس میں بہت کچھ اُس کی خودغرضی اور خاص مطمحِ نظر کو دخل ہوتا ہے،'' شبلی نے اُس مضمون میں لکھا جسے وہ سیرۃ النبی مکمل ہونے پر دیباچے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ''وہ اپنے مقصد کو محور بنالیتا ہے۔ تمام واقعات اُسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ بخلاف اِس کے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرفداری سے

واقعات کو ڈھونڈھتا ہے۔ اُس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اُس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا۔ اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہوگئی ہے۔ اس بات سے بچنے کے لیے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعے کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔''

شبلی کے ذہن میں یہ خیال جنم لے چکا تھا کہ اگر ان دونوں طریقوں کو ملا دیا جائے تو سوانحِ حیات لکھنے کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جو دُنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہوگی۔

131

بیس برس پہلے الفاروق لکھتے ہوئے شبلی نے ذرا جلد بازی سے کام لے کر لکھ دیا تھا کہ اسلامی مورخ ہر معلومات کے بارے میں یہ تحقیق کر لیتے تھے کہ اس کا راوی کون ہے۔ اب اُنہیں تسلیم کرنا پڑا کہ صرف حدیث لکھنے والے ایسی تحقیق کرتے تھے۔ عام مورخین اور سیرت نگاروں کا یہ حال تھا کہ رسولِ اکرمؐ کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اس اصول سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

شبلی نے حقیقت پسندی سے کام لے کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اسلامی دَور میں حدیث پر تحقیق کرنے والے، قانون بنانے والے اور سیرت لکھنے والے اپنے اپنے میدان تک محدود رہے اور کسی نے دوسرے کے طریقِ کار سے فائدہ نہ اٹھایا۔ خاص طور پر مسلمان مورخین اور سیرت نگار تو بہت ہی لاپرواہ تھے کہ انہوں نے عباسی خلفاؑ کی عیاشیوں کا جواز پیدا کرنے کے لیے رسولِ اکرمؐ سے بھی بہت سی نازیبا باتیں منسوب کر دی تھیں۔

132

ٹیگور کی گیتان جلی کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا تھا۔ انتساب روتھن اسٹائن کے نام تھا جنہوں نے سرورق کے لیے اسکیچ بنایا تھا۔ ییٹس نے دیباچہ لکھا تھا۔

دسمبر میں شکاگو سے اذرا پاؤنڈ نے اپنے رسالے *Poetry* میں گیتان جلی کے انگریزی ترجمے کی چھ نظمیں شائع کیں۔

133

اقبال فارسی ادب کا نصاب مرتب کر رہے تھے۔ ''قدیم و حال کی تصانیف دونوں کے نام مطلوب ہیں،'' انہوں نے گرامی کو ۴ دسمبر کو لکھا۔

134

بلقان فنڈ لبریز ہو گیا۔ ظفر علی خاں نے فیصلہ کیا کہ پہلے پیرس اور لندن جا کر ترکوں کی حمایت کریں اور پھر قسطنطنیہ جا کر فنڈ کی رقم جمع کروادیں۔

۱۱ دسمبر کو وہ بمبئی سے پانی کے جہاز پر روانہ ہوئے۔

135

انجمن حمایت اسلام کے تحت چلنے والے منصوبوں میں حکومت سے مالی امداد کی درخواست کرنے کے لیے میاں نظام الدین کی صدارت میں تیرہ ارکان کا وفد حکومت کے پاس بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔

۱۵ دسمبر کو اقبال اس میں شامل ہوئے۔ عرضداشت میں جن مسائل کا ذکر کرنا تھا ان میں اسلامیہ کالج کے بورڈنگ ہاؤس کی توسیع، اسکول اور یتیم خانے کے لیے گرانٹ، صوبہ پنجاب میں مسلمانوں کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کی حالت شامل تھے۔ اس کے علاوہ درخواست کرنی تھی کہ پنجاب یونیورسٹی میں مسلمان فیلوز کی تعداد بڑھائی جائے۔

136

۱۶ دسمبر کو لندن میں عثمانی سلطنت اور بلقانی حملہ آوروں کے درمیان صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے کانفرنس شروع ہوئی۔

یورپی طاقتیں جن میں انگلستان بھی شامل تھا بلقان کی جنگ میں مداخلت کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں کیونکہ خطرہ پیدا ہوا تھا کہ اگر عثمانی سلطنت بالکل ہی ختم ہوگئی تو اس کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے یورپ کی تمام بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے الجھ جائیں گی اور عالمگیر جنگ شروع ہو جائے گی۔

137

۲۲ دسمبر کو یونیورسٹی فاؤنڈیشن والے جلسے کے لیے انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل میں ایک وفد نامزد کیا گیا جس میں اقبال شامل تھے۔ جلسہ پانچ روز بعد ہونے والا تھا۔۰۰

138

مہاراجہ کشمیر دوبارہ لاہور آئے تو کشمیری مسلمانوں کا وفد پھر پہنچا۔ اس دفعہ اقبال بھی وفد میں شامل تھے۔ مہاراجہ کو بتایا گیا تھا کہ وہ شعر کہتے ہیں چنانچہ فرمایا، ''ڈاک دار صاحب، سنا ہے آپ بیت بناتے ہیں؟''

نہیں معلوم اُن کے کہنے میں غلطی ہوئی تھی یا اقبال اُن کی رعونت سے بھڑک اٹھے تھے، چڑھ کر کہنے لگے، ''سرکار! یہ نہ کبھی میں نے بنائے ہیں نہ میرے باپ دادا نے۔ اِس کے علاوہ میں ڈاک دار بھی نہیں۔ نہ میں نے کبھی ڈاک کا کام کیا نہ میرے بزرگوں نے!''

مہاراجہ حیرانی سے اقبال کے دوستوں کا منہ دیکھنے لگے۔ اُن میں سے کسی نے بات سنبھالنے کے لیے کہا، ''حضور، یہ شاعر ہیں اور شعر تحریر کرتے ہیں۔ شعر کو بیت بھی کہتے

ہیں مگر انہوں نے بیت کو وہ بید سمجھا جس سے کرسیاں بنائی جاتی ہیں۔‘‘

مہاراجہ نے اقبال سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ بادلِ نخواستہ اقبال نے کچھ اشعار پڑھنے شروع کیے تو مہاراجہ نے کہا، ’’یوں نہیں۔ گا کر پڑھیے!‘‘

اقبال کے جی میں آئی کہ کہہ دیں میرے دوستوں کے پاؤں میں گھنگھرو باندھیے تو میں گاؤں مگر بہر حال چند اشعار ترنم سے پڑھے جس کے بعد مہاراجہ نے بھی فارسی کے کچھ اشعار سنائے۔ پھر اقبال سے پوچھا کہ ڈاکٹری کا کون سا امتحان پاس کیا ہے تو انہوں نے وضاحت کی کہ وہ فلسفے کے ڈاکٹر ہیں۔[۹]

139

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا اور میاں شاہ دین صدارت کر رہے تھے۔ اقبال اور مرزا جلال الدین کو بھی دعوت نامے ملے۔

140

۲۳ دسمبر کو وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کا جلوس دہلی میں چاندنی چوک سے گزر رہا تھا جب کسی نے اُن کے ہاتھی پر بم پھینک دیا۔ چوبدار ہلاک ہو گیا اور وائسرائے زخمی ہوئے۔

وائسرائے چاہتے تھے کہ جلوس جاری رہے مگر بیگم نے اُنہیں سلامتی کا خیال کرنے پر راضی کر لیا۔

ہندوستان کے عام پریس میں اس دہشت گردی کو برا کہا گیا۔

141

’’ہم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے،‘‘ مرزا جلال الدین کا بیان ہے، ’’اجلاس کے ایام میں ایک شام ایسی بھی تھی کہ ہم فارغ تھے۔ اقبال کی طبیعت جب بیکاری سے گھبرانے لگی تو وہ مجھ سے فرمانے لگے، چلو کہیں چل کر گھڑی

دو گھڑی گانا ہی سن آئیں۔ میں پہلے تو آمادہ ہو گیا مگر بعد میں کسی اچانک کام کی وجہ سے رُک گیا۔ وہ چل کھڑے ہوئے۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے، لو آج تمہیں تماشا دکھائیں۔ میں نے استعجاب کے عالم میں دریافت کیا، آخر ہوا کیا؟ فرمانے لگے، ہونا کیا تھا، بس آج ایک مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا۔ جس طوائف کے ہاں ہم گانا سننے گئے تھے، وہیں کہیں اس کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب بھی ہمارے جانے سے قبل دل بہلا رہے تھے مگر آپ جب وہاں سے چمپت ہوئے تو اپنی بوکھلاہٹ کے عالم میں کانفرنس کا دعوتی رقعہ وہیں پھینک آئے تھے۔ ہم پہنچے تو طوائف نے ہم سے کہا کہ جس طرح بھی ہو ہم مولوی صاحب کو تلاش کر کے اُن کی امانت بحفاظت اُن تک پہنچا دیں۔ مگر ہم نے یہ سوچا ہے کہ یہ رقعہ نواب وقار الملک بہادر صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ لوٹائیں تاکہ ضابطہ کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب بہادر بھی دیکھ لیں کہ دنیا بھلی سے بھلی ہے۔ اتنا کہہ کر اقبال نے کاغذ کا تختہ نکالا اور قلم پکڑ کر نواب صاحب کے نام طوائف کی طرف سے ایک مفصل خط لکھ ڈالا۔ اس میں شام کے واقعے کی تمام تفصیل بے کم و کاست بیان کرنے کے بعد لکھا کہ چونکہ بندی قبلہ مولوی صاحب کے پتے سے واقف نہیں، اس لیے آپ سے التماس کرتی ہے کہ اُن کا کھوج نکال کر اُن کے کاغذات اُن تک پہنچا دیں۔ اس خط کی بھنک مولوی صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی اور وہ ہانپتے کانپتے اقبال کے پاس آئے اور لگے بے طرح منّت خوشامد کرنے اور اُن کی جان و مال کو دعائیں دینے۔ مگر اقبال تو گویا اسی وقت کے انتظار میں تھے، اب آئے ہو تو جاتے کہاں ہو کے مصداق انہوں نے حضرت کو وہ رگیدا دیا کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ نہ جانے آپ نے ناک سے کتنی لکیریں کھینچیں تب جا کر آپ کی جان چھوٹی۔''[۴۲]

لکھنؤ میں اقبال کے اعزاز میں شاعری کی کوئی محفل بھی منعقد کی گئی جس میں وہاں

کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید بھی آئے۔ اقبال نے میر مجلس کی درخواست پر اپنی چند نظمیں سنائیں تو پیارے صاحب کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔

''مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''کبھی اُن کی بھنویں تنتی اور پھیل جاتی تھیں، کبھی یکبارگی کھلتیں اور پھر بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سنا چکا تو اُن کے پاس بیٹھ کر ادب سے پوچھا کہ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی لیکن جو کچھ عرض کیا ہے آپ نے ملاحظہ فرمایا؟

''اُنہوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا، ہاں صاحب سنا ہے لیکن سچ پوچھیے تو ایسی اُردو ہم نے نہ آج تک پڑھی ہے نہ سُنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اُردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔''"

تیسرا حصہ

143

''[میں] کالج کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو ہر روز مشن کالج کے دروازہ سے باہر والی سڑک پر اپنی مختصر سی [گھوڑا] گاڑی میں چیف کورٹ سے واپس آتے دیکھتا تھا،'' ایک لڑکے کا بیان ہے جو اُس وقت لاہور کے ایک مشن کالج میں پڑھتا تھا۔ ''چہرہ سرخ، سنہری مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ سوٹ، ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ۔ غرض اسی شان سے ہر روز تفریح کی گھنٹی میں مجھے دُور سے اُن کی زیارت نصیب ہو جاتی تھی۔''

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اکثر اپنی گھوڑا گاڑی خود ہی چلایا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں یہ باذوق نوجوانوں کا شوق سمجھا جاتا تھا۔

شام کو اگر وہ گھر پر ہوں تو دوست اور شاگرد اُن کے پاس آجاتے تھے۔ ''اقبال کے مکان کے ایک کمرے میں ایک عریاں تصویر تھی،'' اقبال کے ایک شاگرد نعیم الرحمان کا

بیان ہے۔ ''ایک دن حاضرینِ محفل نے دیکھا کہ وہ غائب ہے۔ اقبال سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اُن کے چند دوست اس پر معترض تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اسے ہٹائیے۔ آخر کار اقبال نے اُن سے کہا کہ اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو کسی دن میری غیر موجودگی میں اسے اُتار کر لے جائیے۔ چنانچہ دوستوں نے ایسا ہی کیا۔''

نعیم الرحمان ہی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اقبال نے کہا کہ وہ ہر طرح کا نشہ اُس نشے کے کہنہ مشقوں کی مصاحبت میں کر چکے ہیں، ''لیکن محض یہ آزمانے کے لیے کہ ہر الگ نشے کے اثرات جسم پر، ذہن پر اور جذبات پر کیسے ہوتے ہیں اور کتنے دیر پا ہوتے ہیں۔ جب اُنہیں ان باتوں کا مکمل علم ہو جاتا تو وہ اُس نشے کو چھوڑ دیتے اور کچھ عرصے بغیر کوئی نشہ کیے کسی دوسرے کو آزمانا شروع کر دیتے۔'' نعیم الرحمان نے دریافت کیا کہ کیا اُس زمانے میں وہ کوئی نشہ آزما رہے ہیں تو اقبال نے اُس تکیے کا نام اور مقام بتایا جہاں جا کر وہ اُن دنوں مختلف شکلوں میں بھنگ پی رہے تھے۔"

144

۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو ندوہ میں وہ اجلاس ہوا جس کا شبلی نے مطالبہ کیا تھا۔

انتظامیہ نے اعتراف کیا کہ مولوی عبدالکریم صاحب سے غلطی ہوئی مگر اُنہیں تو اس کی سزا مل چکی تھی، اب اور کیا ہو سکتا ہے؟ اجلاس اس بات پر متفق ہو گیا کہ مولوی صاحب کی باقی سزا منسوخ کر کے انہیں واپس بلا لیا جائے اور شبلی کے مخالفوں نے شبلی کی یہ پریشانی مسلم گزٹ تک پہنچا دی۔

مسلم پریس میں شبلی کا جو حلیہ سامنے آیا وہ ایک ایسے خود غرض بوڑھے کا تھا جو اس نازک دور میں اپنی اَنا کی تسکین کے لیے مسلمانوں میں تفرقے پیدا کر رہا تھا۔

145

فوق نے اخبار کشمیری لاہور سے نکالا تھا۔ ۱۴ جنوری کو اس میں 'مسلمانوں کا

امتحان' کے عنوان سے اقبال کی اُس گفتگو کا خلاصہ شائع ہوا جو اقبال نے ضبطِ نفس کے موضوع پر کچھ عرصہ پہلے ابوظفر کے ساتھ کی تھی۔

146

حکومت ظفر علی خاں سے خوش نہیں تھی۔ پچھلے برس دو ہزار کی ضمانت جو انہوں نے جمع کروائی تھی وہ جنوری ۱۹۱۳ء میں ضبط ہوئی اور زمیندار کا پریس بھی سیل کر دیا گیا۔

اُنہیں ۱۴ جنوری کو لندن میں رائٹر کے ذریعے خبر ملی کہ ہندوستان میں وہ اخبار ضبط ہو گیا ہے جو سب سے زیادہ چھپتا ہے اور جس نے پان اسلام ازم کی تحریک چلا رکھی تھی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ اُنہی کا اخبار ہے جس کے کسی مضمون میں غلطی سے پان اسلام ازم کا ذکر ہوا۔

یہ لندن کے صحافیوں سے ملے، پارلیمنٹ کے ممبروں سے بات کی اور سبھی نے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ کیمبرج سے پروفیسر براؤن نے لکھا کہ مضمون کے جن حصوں پر حکومت کو اعتراض ہوا ہے اُن کا انگریزی ترجمہ انگلستان کے اخباروں میں چھپوا دو۔ کانگریس نے ہندوستان سے کہلوایا کہ اپنا بیان بھجوایئے وہاں جلسہ کر کے اُسے پیش کیا جائے گا۔

ظفر علی خاں نے بیان کی بجائے منشور تیار کیا اور دفتر لکھ بھیجا کہ حکومت کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے۔

147

جنوری میں کسی وقت اقبال الہ آباد گئے تا کہ چند گھنٹے اکبر الہ آبادی سے مل سکیں۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔[۹۵]

148

کوئی شیخ عبدالحق تھے جن کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ اقبال نے کبھی اُن کی تاریخِ وفات کہی۔ مادۂ تاریخ غفران تھا جس سے ہجری سال ۱۳۳۱ھ یعنی ۱۹۱۳ء کے اعداد برامد ہوتے تھے اور تین اشعار کے فارسی قطعے سے معلوم ہوتا تھا کہ شیخ عبدالحق نے اپنی قوم کی بہت خدمت کرنے کے بعد اُس برس جوانی ہی میں شہادت پائی:۹۰

سالِ تاریخِ وفاتِ اُو ز غفران آشکار

149

تاریخِ ہند اُسی برس شائع ہوئی اور آج تک اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے معمہ بنی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے دو نسخے موجود ہیں۔ دونوں پر سالِ اشاعت ۱۹۱۳ درج ہے اور مصنفین کے نام ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لأ اور لالہ رام پرشاد صاحب ایم اے پروفیسر ہسٹری گورنمنٹ کالج لاہور درج ہیں۔ البتہ ایک نسخہ جو زیادہ ضخیم ہے اُس میں مسلمان فاتحین کے بارے میں ایسی باتیں درج ہیں جن میں سے کم از کم اورنگزیب کے متعلق اقبال اِس قسم کی رائے نہ خود دے سکتے تھے نہ ہی اس کی توثیق کرسکتے تھے۔ اس میں اورنگزیب کو متعصب، ظالم اور کم ظرف بتایا گیا تھا جسے ''بری طرح بھی کچھ ہاتھ لگتا تو کبھی نہ چوکتا تھا۔''

دوسرے نسخے کی ضخامت کچھ کم ہے اور اُس میں محمود غزنوی، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے علاوہ اورنگزیب کے بارے میں رائے کچھ بہتر ہوگئی ہے۔ ''اگر مسلمانوں کی خوشامد اور ہندوؤں کی مذمت سے قطعِ نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اورنگزیب سخت گیر اور اعلیٰ درجے کی لیاقت کا آدمی تھا...ایک نامی انگریز شاعر نے اپنے ایک نہایت نفیس ناٹک میں اورنگزیب کو ہیرو بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ جیتے جی کہانیوں کا ہیرو مشہور ہوگیا تھا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف لالہ رام پرشاد نے لکھی تھی۔ اُن کے فائدے کے لیے اقبال نے شریک مصنف کے طور پر اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دی ہوگی۔ یہ معلوم نہیں کہ معاوضے میں حصہ بھی تھا یا نہیں۔

اُن دنوں کتاب شائع کروانے کے بعد نصاب میں شامل ہونے کے لیے پیش کی جاتی تھی۔ تاریخ ہند کے ایک ہی سال میں دو نسخوں کی اشاعت کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے نمونے کو محکمے سے منظوری نہ ملی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلا نسخہ چھپنے کے بعد اقبال کے سامنے آیا ہو اور اُنہیں اعتراض ہوا ہو۔ مگر اصلاح شدہ کتاب بھی پوری طرح اُن کے خیالات سے میل نہیں کھاتی اور یہ ایک معمہ ہے کہ اقبال نے اس کتاب پر اپنا نام دینا کیوں گوارا کیا۔[۹۷]

150

اُس برس شائع ہونے والی کتابیں جو کبھی اقبال کے مجموعے میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[۹۸]

Newman. *Newman's Apologia Provita Sua (the two versions of 1864 and 1865 preceded by Newman's and Kingsley's pamphlets with an introduction by Wilfrid Ward)*. London, Oxford University Press.

Roy, Sripti. *The Law Relating to Bad Livelihood*. Calcutta, Wilkins Press.

Waterfield, William. *Indian Ballads*. Allahabad, Panini Office.

151

پنجاب میں ہیر رانجھا کے موضوع پر کئی شاعر مشق کرتے تھے۔ انہی میں مولا بخش کشتہ تھے جن کی کتاب ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد اقبال کو پیش کی گئی چنانچہ اُنہوں نے رائے لکھی، ''کشتہ صاحب کی نظم موسوم بہ ہیر رانجھا بڑی خوبی سے جدید طرز پر لکھی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مقبولِ عام ہوگی۔''

152

اقبال کے دوست سردار امراؤ شیر گل کی شادی مس گوٹسمین سے ہوگئی تھی۔ وہ یورپ میں رہتے تھے۔ بڈاپسٹ میں ۳۰ جنوری کو اُن کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امرتا شیر گل رکھا گیا۔

153

۳۱ جنوری کو ترکی میں ینگ ٹرک پارٹی نے بغاوت کر دی کیونکہ عثمانی حکومت لندن کانفرنس میں یورپی طاقتوں کی شرائط پر صلح کرنے پر تیار ہوگئی تھی جبکہ خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ ترکوں سے چھینے ہوئے علاقوں میں خاص طور پر سرب سپاہی مسلمان شہریوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔

محبِ وطن باغیوں نے وزیرِ اعظم کامل پاشا کو ہٹا دیا اور اُن کی جگہ جنرل شفقت پاشا مقرر ہوئے۔ ''ہم قومی وقار بچائیں گے یا ختم ہو جائیں گے،'' ینگ ٹرک پارٹی کے نمائندے طاعت بے نے کہا۔ ''ہم جنگ جاری رکھنا نہیں چاہتے مگر ہم ادرنہ دینے پر تیار نہیں ہیں۔''

ادرنہ کا اہم قلعہ بلغاریہ کے محاصرے میں تھا اور صلح کی شرائط میں یورپی طاقتوں کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ ادرنہ اُن کے حوالے کر دیا جائے۔

154

معلوم ہوا تھا کہ دو ماہ پہلے وائسرائے پر بم پھینکنے والا امیر چند تھا جو کبھی دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں پڑھاتا تھا۔

لاہور کے لالہ ہردیال اب کیلی فورنیا میں ہوتے تھے۔ اُنہوں نے امیر چند کی تعریف میں مضمون لکھا۔ ''اُس نے ہمیں نیند سے جگا دیا،'' اُنہوں نے لکھا۔ ''ہندوستان خوف سے گونگا ہوا بیٹھا تھا۔ صرف اُسی نے آواز بلند کی۔''

155

۷ فروری کو محمد علی جناح امپیریل کونسل میں اپنی ممبر شپ کی مدت ختم ہونے کے بعد خصوصی طور پر مسلمانوں کی طرف سے وقف بل کے لیے اضافی رکن بنائے گئے۔ کہتے ہیں سر علی امام نے بھی وائسرائے سے سفارش کی تھی۔

156

مولانا محمد علی اب دہلی سے اردو میں اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ ہمدرد نام تجویز کیا تھا اور بیروت سے ٹائپ منگایا تھا جس کے آنے میں ابھی دیر تھی مگر ان سے صبر کہاں ہوتا۔ ۲۳ فروری کو ایک ورق کا اخبار ہی جاری کر دیا جسے لوگ نقیبِ ہمدرد کہنے لگے۔

157

اقبال پچھلے ڈیڑھ سال سے پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس کے سیکرٹری تھے جس کا انجمن حمایت اسلام سے بھی تعلق ہو گیا تھا مگر اب انہوں نے استعفیٰ دیا جس کی وجہ معلوم نہیں ہے۔

استعفیٰ ۲ مارچ کو جنرل کونسل کے اجلاس میں منظور کیا گیا مگر اقبال نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر غور کرنے والی پانچ ارکان کی سب کمیٹی میں شامل ہونا قبول کر لیا۔[۱۰۰]

158

۵ مارچ کو وقف بل منظور ہوا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بڑی کامیابی بیرسٹر جناح کی وجہ سے ہوئی تھی۔

159

ساقی

نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی![۱۰۱]

160

جدّہ میں انگریزی شفاخانہ بنانے کی تجویز ہوئی تھی جس کے لیے انگریز حکومت پانچ لاکھ روپے دینے پر تیار تھی اگر باقی رقم مسلمان چندے سے اکٹھی کر سکیں۔ بعض مسلمان رہنماؤں کو خیال ہوا کہ اس طرح انگریز عرب میں اپنا اثر بڑھانا چاہتے ہیں۔

اقبال کا بھی یہی خیال تھا۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں زمیندار میں اُن کی نظم 'شفاخانہ حجاز' شائع ہوئی۔ اس میں ایک پیشوائے قوم اقبال کے پاس آ کر کہتا ہے کہ آپ کو حجاز کی سرزمین سے بڑی محبت ہے چنانچہ شفاخانے کے لیے چندہ دیجیے تاکہ مریض کی نبض عیسیٰ کے پنجے میں دی جا سکے...

میں نے کہا کہ موت کے پنجے میں ہے حیات

پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مےِ عمرِ دراز میں
اَوروں کو دیں حضور! یہ پیغامِ زندگی
میں موت مانگتا ہوں زمینِ حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

نظم کے آخری مصرعے میں لفظ ''مسیحا'' ذو معنی ہے۔ بظاہر تو مطلب یہ ہے کہ درد کی لذت جاننے والے معالج سے رابطہ نہیں کرتے مگر مسیحا سے مراد یسوع مسیح بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے حوالے سے مسیحیت اور انگریز![۱۰۲]

161

کچھ یونیورسٹی میں ڈوبا، جو باقی تھا بلقان گیا
کیا تم سے کہیں اپریل میں جلسہ سالانہ بھی آتا ہے
پر جیب ہماری خالی ہے اب چندوں سے کچھ کام نہیں
ہاں گاہے بگاہے بہرِ بقایا لیگ کا وی پی آتا ہے[۱۰۳]

162

اتوار ۲۳ مارچ کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کے دوسرے جلسے کی صدارت ڈپٹی کمشنر شیخ اصغر علی روحی کر رہے تھے۔

انجمن کی رپورٹ میں درج ہے، ''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی کھڑے ہوئے تو حاضرین نے اظہارِ مسرت میں تالیاں بجا کر وہ شور مچایا کہ الامان! بعد ازاں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ میں اس سال

علالتِ طبع کی وجہ سے کوئی نظم نہیں لکھ سکا، مولوی احمد الدین صاحب بی اے جو میرے دوست ہیں مجھے اس وقت گھر سے اٹھا لائے ہیں تاہم میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ایک فارسی نظم جو ابھی غیر مکمل ہے، آپ کو سناتا ہوں۔ اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس نظم کے مضمون کو اردو میں بیان کر کے اپنی بے بدل فارسی نظم سنائی جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔''

حاضرین کے بہت محظوظ ہونے کا اضافہ رپورٹ لکھنے والے نے اپنی مروّت میں کیا ہو گا ورنہ اُس زمانے کی نئی نسل جس نے بڑے جوش سے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کے جلسوں میں اقبال کی نظم خوانی کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں وہ ۱۹۱۳ء کے اجلاس کے بارے میں خاموش ہے۔

163

۲۶ مارچ کو بلقانی حملہ آوروں نے ۱۵۵ دن کے محاصرے کے بعد ادرنہ فتح کر لیا۔

معلوم نہیں یہ خبر کس حد تک درست تھی کہ محاصرے کے دوران ایک دفعہ خوراک کی قلت ہوئی اور ترک جنرل نے حکم دیا کہ غلّے کے تمام ذخیرے قبضے میں کر لیے جائیں تو شہر کے قاضی نے فتویٰ جاری کر دیا کہ مسلم حکومت جن غیر مسلموں سے جزیہ لے کر اُنہیں ذمّی کا درجہ دے چکی ہو اُن کی ملکیت نہیں لے سکتی چنانچہ ترک سپاہیوں کو بھی شریعت کے اس حکم کی پابندی کرنی پڑی۔

بہر حال یہ واقعہ اقبال نے سنا تو انہوں نے اِسے نظم کر دیا۔ بائیس اشعار کا عنوان تھا 'محاصرۂ ادرنہ':

اقبال اُس پیمبرِ اُمّی کے میں فِدا
ایثار جس کی قوم کا دستور ہو گیا
دُنیا میں جس کی مشعلِ خُلقِ عظیم سے
ہر ذرّہ شرحِ سُورۂ والنُّور ہو گیا

164

سات برس پہلے مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب بہشتی زیور میں، جو اب بہت مشہور ہو چکی تھی، لکھا تھا کہ گھر میں اخبار نہیں آنے چاہییں کیونکہ انہیں پڑھنے سے وقت برباد ہوتا ہے مگر اقبال اخبار کا مطالعہ مسلمان خواتین کے لیے بھی ضروری خیال کرتے تھے۔

ضلع علی گڑھ میں دتاولی کے رئیس محمد اسماعیل خاں نے جغرافیے پر ایک آسان کتاب لکھ کر اُن کے پاس روانہ کی تو ۱۱ اپریل ۱۹۱۳ء کو اقبال نے اپنے جواب میں لکھا کہ اس کی وجہ سے خاص طور پر مسلمان عورتوں کو بہت آسانی ہو گی جو جغرافیے سے ناواقفیت کی وجہ سے اخبار پڑھ کر سمجھ نہیں پاتیں۔

اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیماری کا سلسلہ جس کی وجہ سے وہ انجمن حمایت اسلام کے لیے بھی کوئی اردو نظم نہیں لکھ سکے تھے وہ ابھی جاری تھا۔

165

بیگم صاحبہ بھوپال لاہور تشریف لانے والی تھیں۔

اُن کے استقبال کے لیے انجمن حمایت اسلام نے ۱۳ اپریل کو مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی جس میں اقبال بھی شامل تھے۔

چھ برس پہلے امیر حبیب اللہ نے اسلامیہ کالج کی جس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا وہ اسی برس مکمل ہوئی اور کالج کی جماعتیں ریواز کالج کے مغربی حصے سے یہاں منتقل ہو گئیں۔[۱۴۳]

166

قسطنطنیہ میں ظفر علی خاں نے محمود پاشا کو ایک لاکھ پانچ روپے کا چیک پیش کیا جس کی رسید انہوں نے زمیندار کے نام روانہ کر دی۔

دہلی کے ڈاکٹر انصاری بھی پہنچے ہوئے تھے۔ اُن کے ہمراہ ظفر علی خاں بالآخر عثمانی خلیفہ سلطان محمد پنجم کے حضور پیش ہوئے۔ مشرقی درباروں کا قاعدہ تھا کہ رعایا میں سے کوئی فرد حاضر ہو تو نذر پیش کرے۔ ظفر علی خاں نے جو نذر پیش کی اُس میں زمیندار کا کوئی خاص نمبر اور اقبال کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ شامل تھیں۔[۱۰۵]

167

مولانا ظفر علی خاں کا بیان ہے کہ انہی دنوں انہوں نے شیخ عبدالعزیز شاویش اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ مل کر کسی مدینہ یونیورسٹی کے منصوبے کا خاکہ بھی بنایا۔ اقبال کو نصاب مرتب کرنے کی دعوت دی گئی۔[۱۰۶]

168

نواب ذوالفقار علی خاں اور جوگندر پٹیالہ سے واپس آ چکے تھے۔ اقبال، مرزا جلال الدین، جوگندر سنگھ اور سردار امراؤ سنگھ اکثر نواب صاحب کی موٹر میں گھومنے نکلتے تھے جو دوسری گاڑیوں کی نسبت کم شور مچاتی تھی۔

ایک روز جوگندر سنگھ نے موٹر کی خاموشی پر رائے ظاہر کی۔ اُس وقت تو کوئی خاص بات نہ ہوئی مگر بعد میں اقبال نے دوستوں کو ایک نظم دکھائی جس میں جوگندر کی بات کو نظم کر کے اپنی طرف سے اس تبصرے کا اضافہ کیا تھا کہ دنیا میں ہر تیز رفتار خاموش ہے۔ صراحی میں سے قلقل کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے چنانچہ صراحی جہاں ہوتی ہے وہیں رہتی ہے مگر جام جس کی کوئی آواز نہیں، وہ ہاتھوں ہاتھ کہاں سے کہاں جا پہنچتا ہے۔[۱۰۷]

169

سردار بیگم قانونی طور پر اقبال کی بیوی تھیں مگر گمنام خطوط کی وجہ سے جو شبہات ذہن میں ابھرے تھے وہ ابھی مٹے نہ تھے۔ ارادہ نہ تھا کہ سردار بیگم کو رخصتی کروا کے گھر لائیں

بلکہ نکاح بھی منسوخ کرنے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے، مگر شاید اس معاملے میں بھی اپنی مشہور کاہلی ہی سے کام لے رہے تھے۔

کرنال کے کوئی مولوی صاحب مصر ہو گئے کہ شریف گھرانے کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے جس سے اقبال کو ضرور شادی کرنی چاہیے۔ آخر اُن خاتون کو مرزا جلال الدین کے گھر بلایا گیا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئیں۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں بھی آئے۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر اقبال رخصت ہو گئے۔

اگلے روز ان خاتون کو بھی سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا گیا۔[۱۰۹]

170

اقبال کے دوست سید بشیر حیدر خبر لائے کہ لدھیانے میں ایک گھرانہ جس کی دولت مندی کی وجہ سے اُسے نولکھوں کا گھرانہ کہا جاتا ہے اُس کے سربراہ ڈاکٹر سبحان علی اپنی لڑکی کا رشتہ اقبال سے کرنا چاہتے ہیں۔

مختار بیگم نرم طبیعت کی فراخ دل اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ اس سے پہلے لدھیانہ ہی کے کسی محمد یعقوب کے ساتھ اُن کی بات طے ہوئی تھی مگر شادی نہیں ہو سکی تھی اگرچہ یہ بات اقبال کے علم میں نہیں تھی۔[۱۰۹]

رشتہ طے ہو گیا تو بارات لاہور سے لدھیانہ گئی جہاں ریلوے اسٹیشن پر اسکول کے طالب علموں نے ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' اور اقبال کی دوسری نظمیں گا کر استقبال کیا۔

ڈاکٹر سبحان علی یا ان کے گھر والوں میں سے کسی کی طرف سے شہر بھر کے دکانداروں کو ہدایت کر دی گئی کہ بارات والے جو کچھ خریدیں اس کی قیمت اُن سے نہ لی جائے بلکہ اس کا تخمینہ نولکھوں کے گھرانے بھجوا دیا جائے۔

نکاح کے بعد اقبال کے دوست واپس لاہور چلے آئے اور اقبال کو کچھ دن گزارنے

لدھیانہ ہی میں چھوڑ آئے۔

شادی کے بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ جس لڑکی سے ان کا رشتہ ہوا ہے وہ ڈاکٹر سبحان علی کی بیٹی نہیں بلکہ اُن کی بیوی کی بھانجی ہے جس کا باپ فوت ہو چکا ہے اور بڑا بھائی غلام محمد سرپرست ہے۔ اس قسم کے مغالطے اُس زمانے میں پیش آجایا کرتے تھے جب شادی بیاہ کے مراحل میں دلہا دلہن کا براہِ راست بات چیت کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور اس کے علاوہ بھی بہت سے تکلفات کی پابندی واجب تھی۔

بہرحال اقبال کو کوئی شکایت نہ تھی۔

171

لدھیانہ میں ایک بہت مشہور بزرگ تھے جو اپنی پھوس کی بنی ہوئی لنگوٹی کی وجہ سے بابا پھوس والے کے نام سے مشہور تھے۔

اقبال نے دیکھا تو یہ رائے قائم کی کہ اگر مے توحید اپنی ہمت سے بڑھ کر پی لی جائے تو یہی انجام ہوتا ہے۔[10]

172

مختار بیگم کو لے کر اقبال لدھیانہ سے سیالکوٹ گئے اور وہاں کچھ دن گزارنے کے بعد اُنہوں نے پہلی بیوی کریم بی بی کو بھی لاہور چل کر رہنے کی دعوت دی۔

''چنانچہ دونوں بیگمات لاہور آگئیں اور کچھ عرصہ انارکلی والے مکان میں ساتھ ساتھ رہیں،'' اعجاز احمد کہتے ہیں۔[11]

173

حسن نظامی کی طبیعت نے پلٹا کھایا تھا۔ رسالہ حلقہ نظام المشائخ اپنے مرید دوست ملا واحدی کے سپرد کر کے خود میرٹھ سے ایک نیا ہفت روزہ توحید کے نام سے

نکالنا شروع کیا۔ اس کے سرورق پر اقبال کے ترانے کا وہ شعر لکھا ہوتا تھا جس میں لفظ 'توحید' آیا تھا۔

حسن نظامی نے اعلان کیا کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی یاد میں ۸ جون کو رسالے کا خواجہ نمبر نکلے گا جس میں بہترین تحریروں پر تمغے دیے جائیں گے۔ اکبر الہ آبادی، عبدالحلیم شرر اور اقبال منصفین قرار دیے گئے۔[۱۲]

174

۲۸ مئی کو Civil And Military Gazette میں وائسرائے کا بیان شائع ہوا کہ ٹیگور ایشیا کے ملک الشعراء ہیں جن کے محسوسات، وجدان اور جذبات پوری انسانیت پر محیط ہیں۔

بم والے واقعے کے بعد وائسرائے نے ڈیرہ دُون میں آرام کیا تھا جہاں آریا سماجی ماہرِ تعلیم منشی رام اور ٹیگور کو اُن کے قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔

175

اکبر الہ آبادی کے بیٹے ہاشم نمونیا میں مبتلا ہوئے۔ چند روز بیمار رہ کر فوت ہو گئے۔

176

اقبال بیمار تھے۔ وہ حسن نظامی کو خواجہ نمبر والے مضامین کے بارے میں اپنی رائے نہیں بھیج سکے۔[۱۳]

177

۳۰ مئی کو لندن میں عثمانی سلطنت اور بلقانی ریاستوں کے درمیان صلحنامے پر دستخط ہو گئے۔ جنگِ بلقان اختتام کو پہنچی مگر ایک نئی جنگ کا آغاز دُور معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ بلغاریہ اور سربیا کے درمیان عثمانیوں سے چھینے ہوئے علاقے مقدونیہ کے بندوبست پر

ابھی سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔

178

جس ٹائپ کا انتظار تھا وہ بیروت سے دہلی پہنچ گیا اور یکم جون سے ہمدرد اخبار با قاعدہ نکلنے لگا۔

آٹھ صفحے ہو گئے مگر مولانا محمد علی کے جوہر دکھانے کو کم پڑتے تھے۔ خود کہتے تھے، مجھے اتنی فرصت کہاں ہے جو مختصر لکھوں! کارکنوں کے لیے اخبار وقت پر نکالنا مشکل ہو رہا تھا اور کامریڈ والی مقبولیت ملتی نظر نہیں آتی تھی۔

179

لکھنؤ کی فضا اِس حد تک شبلی نعمانی کے خلاف ہوئی کہ وہ گھبرا کر بمبئی آ گئے اور پھر ندوۃ سے استعفیٰ دے دیا۔

''۳ جون ۱۹۱۳ء'' عطیہ نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ ''اس شام کو تمام شام مولانا شبلی نے ہمارے ہاں گزاری۔''

شبلی نے عطیہ اور ان کے شوہر رحمین کے لیے شعر بھی کہے۔ عطیہ کی زبان سے رحمین کو کہلوایا:

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لیے ننگِ قرابت سے مجھے دُوری تھی
آپ نقاش ہیں اور حُسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے مجھ کو جو ''کھینچا'' تو یہ مجبوری تھی

180

۸ جون کو توحید کا خواجہ نمبر شائع ہوا۔ حسن نظامی نے لکھا کہ شہر کی رائے پہنچ چکی ہے مگر اکبر الہ آبادی اپنے بیٹے کی وفات کی وجہ سے اور اقبال اپنی بیماری کی وجہ سے

رائے نہیں دے سکے ہیں۔ ان کی رائے ملتے ہی جیتنے والوں کو تمغے روانہ کر دیے جائیں گے۔[۱۱۴]

181

غالباً توحید میں حسن نظامی نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بیداری کے پانچ اسباب گنوائے تھے جن میں اقبال کا ذکر نہیں کیا تھا بلکہ شاید کہیں بین السطور یہ بھی لکھ گئے تھے کہ باقی گرم نوائی جو کہیں نظر آتی ہے وہ انہی پانچ اسباب میں سے کسی نہ کسی کی خوشہ چین ہے۔

حسن نظامی کی نظر میں یہ اسباب ظفر علی خاں کا اخبار زمیندار، محمد علی جوہر کا اخبار کامریڈ، بلقان اور طرابلس کی لڑائیاں اور نواب وقار الملک کی حق گوئی تھی۔

182

''شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کام برا بھلا جو کچھ بھی ہو غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر بین آنکھیں مرئیات کی طرف قدرۃً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں،'' اقبال نے حسن نظامی سے شکایت کرتے ہوئے لکھا، ''اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کام کا اشتہار ہو۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ ایک واقفِ حال دوست کی غلط فہمی دُور ہو تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اُس نے مسلمانانِ ہند کی بیداری میں حصہ نہیں لیا۔''

آخر میں اُنہوں نے بیدل کا ایک شعر درج کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر بیدل کا کلام تمہیں ملے تو انصاف کی راہ سے مت ہٹنا کہ تم سے داد کے سوا اور کچھ طلب نہیں کرتا:

بکلامِ بیدل اگر رسی مگذر زجادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفریں

183

کانپور میں سڑک کشادہ کی جا رہی تھی۔ ایک مندر اور مسجد اس کے راستے میں آتے تھے۔ ہندوؤں کے اصرار پر مندر کو سلامت رہنے دیا گیا مگر مسجد کے بارے میں مسلمانوں کی درخواست نہیں مانی گئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ مسجد کا جو حصہ سڑک میں شامل کرنا مقصود تھا وہ صرف وضو خانہ تھا جسے شرعی طور پر مسجد کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔

یکم جولائی کو گھڑسوار فوج کی موجودگی میں مسجد کی دیوار گرائی گئی۔ شہر کے مسلمان دیکھتے رہ گئے۔

184

جولائی میں ظفر علی خاں واپس آئے تو دہلی میں شاندار جلوس نکلا۔ ایک روایت کے مطابق لاکھوں لوگ شامل ہوئے۔ عقیدت مندوں نے ہاتھوں سے ان کی گاڑی کھینچی جس کے نیچے کچل کر دو بچے ہلاک ہو گئے۔ بعد میں مشہور ہوا کہ اُن میں سے ایک کی ماں نے کہا، اگر اس کے دس بیس بچے بھی ہوں تو ظفر علی خاں پر نچھاور کر دے گی۔

لاہور میں بھی ان کا شاندار استقبال ہوا۔ پنجاب مسلم کلب نے انہیں استقبالیہ دینا چاہا تو میاں محمد شفیع کو خیال آیا کہ وہ کوئی ایسی سیاسی بات نہ کہہ دیں جو مناسب نہ ہو۔

''ڈاکٹر صاحب [اقبال] نے کہا کہ جب ممبر دعوت دینا چاہتے ہیں تو آپ اختلاف نہ کریں، ہم مولوی صاحب کو سمجھا دیں گے کہ ایسی ویسی بات نہ کریں،'' مرزا جلال الدین کا بیان ہے۔ ''چنانچہ اُن کو سمجھا دیا گیا۔ دعوت میں کم و بیش ایک سو اصحاب شریک تھے۔ مولانا تقریر کے لیے اٹھے تو فرمایا: 'صاحبو! مجھے کہا گیا ہے کہ تیز بات نہ کروں۔' یہ کہہ کر بری طرح انگریزوں پر برستے رہے۔ میں اور ڈاکٹر صاحب بھی پریشان تھے اور [میاں] شفیع بھی مگر چونکہ وہاں کوئی رپورٹر نہ تھا اس لیے بات باہر نہ نکلی۔''

بات باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سی آئی ڈی پہلے ہی سے ظفر علی خاں کے پیچھے لگی

ہوئی تھی۔"[۵]

185

اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی لاہور میں بھی خوش نہ رہ سکیں اور کچھ عرصہ شوہر اور سوکن کے ساتھ رہنے کے بعد اپنے میکے گجرات واپس چلی گئیں۔

اقبال نے اپنے بھائی عطا محمد کو لکھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہیں اور یہ بات کریم بی بی کے والد حافظ عطا محمد صاحب پر بھی واضح کر دی جائے تا کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ساتھ ہی اس معاملے میں آخری فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

کریم بی بی نے کہلوا بھیجا کہ وہ طلاق نہیں چاہتیں۔ چنانچہ طے پایا کہ اقبال ہر ماہ اُنہیں گزارے کی رقم ادا کرتے رہیں گے۔

اِس کے بعد اقبال اور اُن کی پہلی بیوی کریم بی بی میں باقاعدہ علیحدگی ہو گئی۔"[۶]

186

بانسری سے سنو وہ کیا کہتی ہے، رومی نے اپنی مثنوی کے آغاز میں لکھا تھا۔ نادان جسے گانا سمجھتے ہیں وہ بانسری کی جدائی کی فریاد ہے کہ وہ اپنے کھیت سے جدا ہو گئی ہے۔

بانسری کی طرح انسان بھی فریاد کر رہا ہے مگر جو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بانسری کا ایک سرا فریاد کرتا ہے مگر دوسرا کسی کے لبوں میں دبا ہوا ہوتا ہے اور اس سرے سے جو آواز آتی ہے وہ بھی اُسی کی سانس سے پیدا ہوتی ہے جو دوسرے سرے پر موجود ہے۔

خدا اور انسان کا تعلق بھی ایسا ہی ہے۔

187

رومی کہہ رہے تھے، اقبال! مثنوی لکھو!

اقبال نے کہا، مثنوی کا حق تو آپ ادا کر گئے ہیں مگر رومی نے کہا نہیں تم بھی لکھو۔

خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ اس کے بعد اقبال نے کہا، آپ فرماتے ہیں خودی کو مٹاؤ اور مجھ کو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خودی قائم کرنے کی چیز ہے۔ رومی نے کہا، نہیں ہمارا مطلب بھی یہی ہے جو تم سمجھتے ہو۔

اقبال کی آنکھ کھلی تو زبان پر فارسی اشعار تھے جنہیں انہوں نے لکھنا شروع کر دیا۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیؐ است

آبروئے ما زنامِ مصطفیؐ است[۱۱۷]

رسول اللہؐ ہر مسلمان کے دل میں رہتے ہیں۔ ہماری آبرو آپؐ ہی کے نام سے ہے۔

ہم اگرچہ مختلف سرزمینوں سے ہیں مگر رسول کی امت ہونے کی وجہ سے اس طرح یکجا ہیں جیسے ایک صبح کی شبنم کے قطرے! جیسے دو نگاہوں کی مشترکہ روشنی! ہمارے لیے وطن کی قید نہیں۔

ہم رسول اللہؐ کے دل میں چھپا ہوا راز تھے۔ آپؐ نے نعرۂ بے باکانہ بلند فرمایا اور ہم ظاہر ہو گئے۔ آپؐ نے وہ آگ روشن کی جس میں نام و نسب کے امتیازات جل کر ختم ہو گئے۔

آپؐ نے غارِ حرا کی تنہائی میں ایک قوم، آئین اور حکومت کو جنم دیا۔ آپؐ بوریئے پر سوتے تھے مگر قیصر کا تاج آپؐ کی اُمت کے قدموں تلے تھا۔ تاریخ میں آپؐ جیسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ آپؐ نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھول دیا!

میری آغوش میں بھی سیکڑوں نغمے پرورش پا رہے ہیں کیونکہ میری خاموش بانسری میں آپؐ کے عشق کا شور بھرا ہوا ہے۔[۱۱۸]

شبلی لکھ رہے تھے۔

ایک دن جبکہ [آنحضرتؐ] حسبِ معمول غارِ حرا میں مراقبے میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپؐ سے کہہ رہا ہے، "پڑھ اُس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے، جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اُسے معلوم نہ تھیں۔"

آپ گھر واپس تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے۔

اس کے بعد شبلی نے اُس روایت پر بحث کی جس کے مطابق آنحضرتؐ پہلی وحی کے بعد خوف محسوس کر رہے تھے اور جب چند روز تک وحی رک گئی تو آنحضرتؐ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرانا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرئیلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے تھے۔ سیرت نگاروں نے اِس روایت کو قبول کر لیا تھا کیونکہ صحیح بخاری میں تھی مگر شبلی نے لکھا کہ صحیح بخاری میں وضاحت موجود ہے کہ اس حدیث کی سند کا سلسلہ امام زہری پر ختم ہو جاتا ہے۔

شبلی کا خیال تھا کہ اس روایت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

189

رومی کی بانسری میں خدا کا عشق بھرا ہوا تھا۔ اقبال کی بانسری میں رسولؐ کا عشق تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا عشق تنہائی اور خودشناسی کی طرف لے جاتا تھا اور رسولؐ کا عشق اخوت اور قومی یکجہتی کی طرف مگر کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے اقبال کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہ ہو۔

190

اگر موت چاہتے ہو تو ضرور اپنے آپ سے غافل ہو کر دیکھو لیکن اگر زندگی چاہیے تو اپنے آپ میں آباد ہو جاؤ، اقبال نے سوچا۔

اپنی خودی یعنی اَنا سے دُور مت ہو اور زندگی کا انعام حاصل کرو۔ قطرہ مت بنو بلکہ سمندر کو اپنے آپ میں سمو لو۔ تم سمجھتے ہو کہ موت جسم سے روح کی علیحدگی کا نام ہے مگر میں کہتا ہوں کہ موت انا سے محروم ہونے پر واقع ہوتی ہے۔ یقیناً تم نے زندگی کو حقیقت کو نہیں سمجھا ورنہ زندہ ہو کر موت سے خوف نہ کھاتے۔

جو بھی اپنی زندگی کا خود مالک نہیں بنا وہ نوکر ہے اور نوکری آدمیت کے مقام سے بہت نیچے ہے۔ نوکری کی روٹی سے بچو، اپنا رزق دوسرے کے ہاتھ سے وصول کرنے سے بچو!

جب اونٹ پر سواری کی حالت میں حضرت عمرؓ کا چابک ہاتھ سے گر گیا تو اُسے اٹھانے کے لیے آپ خود اونٹ سے اترے اور اس معمولی کام کے لیے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا۔ تم بھی کسی کا احسان لینے سے باز رہو کیونکہ بلند فطرت خواہ آسمانوں پر نظر رکھتی ہو وہ دوسرے کا احسان اٹھانے سے پست ہو جاتی ہے۔

تم جو دوسرے کے دسترخوان سے ٹکڑے جمع کر رہے ہو، اپنے آپ کو دکان سے خریدنے کی کوشش مت کرو۔ اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہی زندگی کی اصل ہے اور اپنے آپ سے غافل ہونے کا نتیجہ مجبوری ہے۔

اگر چاہتے ہو کہ دوسرے تم پر قابو نہ پائیں تو خود اپنے آپ پر قابو پا لو۔ زمین اپنے محور پر قائم ہے تو چاند اُس کے گرد طواف کرتا ہے۔ تم بھی اپنی ذات کا اقرار کر کے اپنے آپ کو حاصل کر لو۔ اپنے بہتے ہوئے پارے کو منجمد کر کے چاندی بنا لو۔ موتی کی طرح اپنے آپ میں غوطہ لگانا اور اپنی خلوت گاہ سے سربلند ہو کر باہر نکلنا، اپنی راکھ کے ڈھیر میں جنگاریاں جمع کر کے شعلہ بن جانا اور دیکھنے والی نظر کو چندھیا دینا، یہی زندگی کا راز ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں:[۱۹]

چوں خبر دارم زسازِ زندگی
با تو گویم چیست رازِ زندگی

191

اِن اشعار کے آخر میں اقبال نے اُن اشعار کا اضافہ کر دیا جنہیں دو برس پہلے لکھ کر چھوڑ دیا تھا:

نالہ را اندازِ نَو ایجاد کن

مثنوی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔

192

۲۱ جولائی کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں کانپور میں مسجد کی شہادت کے خلاف قرارداد منظور کی گئی۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ مسجد کی گری ہوئی دیوار کو دوبارہ تعمیر کرے۔

193

۲۳ جولائی کو مہاراجہ کشن پرشاد لاہور آئے۔ اقبال انجمن حمایت اسلام کی طرف سے یتیم خانے کے لیے چندے کی درخواست پیش کرنے والے وفد میں شامل تھے چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر ہی جا ملے۔

شام کو مہاراجہ کے اعزاز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں تین ہزار حاضرین موجود تھے۔ تقریر کرنے والوں میں اقبال، آغا حشر کاشمیری اور پنڈت دین دیال شرما بھی تھے۔

''صاحبان! پنجاب کے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے سلسلے میں آج کا جلسہ یادگار رہے گا،'' اقبال نے کہا۔ ''اختلاف کا ناگوار مسئلہ اہلِ پنجاب کے اطمینان اور سکون کا دشمن ہو رہا ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اختلاف کی چنداں وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ ہندوؤں کے مذہب، تاریخ لٹریچر اور فلسفے سے بخوبی روشن اور ظاہر ہے کہ غیر مذہب کے پیشواؤں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کی زبردست تائید فرماتے ہیں اور اسی طرح

مسلمانوں کے سرمایۂ حیات قرآن مجید میں بھی یہی ہدایت پائی جاتی ہے تو پھر اختلاف کے کیا معنی ہیں؟ اگر دونوں قومیں ایک دوسرے کی روایات سے آگاہ ہیں تو کسی کو ایک دوسرے سے وجۂ شکایت نہیں ہو سکتی اور اگر مغربی تعلیم، جس کو مادی تاریخ کہا جاتا ہے، کی وجہ سے بے دینی ہو گئی ہے تو اس حالت میں بھی کوئی وجۂ شکایت نہ ہونی چاہیے۔"

اس کے بعد اقبال نے اکبر کا شعر پڑھتے ہوئے کہا، یہ تو وہی بات ہوئی:

بوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضموں لکھا
میرا مضموں تو نہ پھیلا لیک جوتا چل گیا

"اگر سیاسی اختلاف ہے تو میں کہوں گا کہ دونوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ اب آہستہ آہستہ دونوں کو معلوم ہونے لگا ہے کہ اختلاف کی تہ میں پولیٹکل وجوہ بھی کوئی ہستی نہیں رکھتیں۔ جیسا جیسا ہندو مسلمان ملک کی حیثیت کو سمجھیں گے زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے۔"[۱۴۰]

اُسی روز لاہور سے دُور کانپور کے عیدگاہ میدان میں مسجد کی گری ہوئی دیوار کے لیے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اجلاس ہوا۔

194

۲۴ جولائی کو توحید کی اشاعت میں اقبال کی رائے شائع ہوئی۔ "نواب علی پروفیسر بڑودہ کالج کا مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند آیا کہ معنی خیز ہے۔ اس سے دوسرے نمبر پر 'زلفِ خواجہ کا اسیر' اور 'شہنشاہوں کی پیشانیاں اجمیری چوکھٹ پر'۔ موخر الذکر مضمون کچھ نتیجہ خیز نہیں ہے۔"

نظموں میں گرامی کی غزل اور اس کے بعد مولانا سید حسن شفق کا ترانہ اقبال کو سب سے بہتر لگے تھے۔[۱۴۱]

195

کشن پرشاد نے انجمن کے یتیم خانے کو ایک ہزار روپیہ چندہ دیا۔ لاہور میں اُن کا زیادہ تر وقت اقبال ہی کے ساتھ گزرا یہاں تک کہ دونوں اکٹھے آغا حشر کا تھیٹر دیکھنے بھی گئے۔

اِس کے بعد اُن کی اقبال کے ساتھ با قاعدہ خط و کتابت شروع ہوگئی۔ ان میں سے ابتدائی خطوط یا کم سے کم اقبال کا پہلا خط دستیاب نہیں ہے۔[۱۲۲]

196

۲۸ جولائی کو اخبار کشمیری نے لکھا کہ مہاراجہ کشن پرشاد پنجاب کی سیر کے بعد اب دہلی گئے ہیں۔ لاہور میں اُن کے استقبالیہ جلسے کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی تقریر شائع کی اور لکھا کہ کاش آریہ سماجی اخبارات پر مہاراجہ، اقبال اور پنڈت دین دیال کی تقریریں کچھ اثر کرسکیں اور وہ "باہمی اتحاد ہی میں اپنا اور ہندوستان کا فائدہ سمجھ سکیں۔"[۱۲۳]

197

رام

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں مَلک سرِشت
مشہور جن کے دم سے ہے دُنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اُس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا[۱۲۴]

198

ظفر علی خاں کو معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی اُن کے پیچھے لگی ہوئی ہے تو وہ پر اسرار طریقے پر غائب ہوئے اور واپس انگلستان چلے گئے۔[۱۲۵]

199

دوسری بلقان جنگ جاری تھی مگر اس دفعہ ترکی پر حملہ نہیں ہوا تھا بلکہ ترکوں سے چھینے ہوئے علاقوں کی تقسیم پر بلغاریہ نے اپنے پرانے ساتھیوں یونان، سربیا اور مونٹینگرو پر حملہ کر دیا تھا جس پر رومانیہ بھی بلغاریہ کے خلاف میدان میں آ گیا تھا۔

ترکی نے موقع مناسب سمجھ کر دوبارہ ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔

200

معلوم ہوا کہ سردار بیگم کے متعلق جو گمنام خطوط موصول ہوئے تھے ان کے پیچھے نبی بخش وکیل کا ہاتھ تھا۔[۱۲۶]

سردار بیگم اب اقبال کے سوا کسی اور سے شادی کرنے پر تیار نہیں تھیں خواہ ساری زندگی یونہی گزارنی پڑے۔ اُس زمانے میں جب بوڑھی عورتیں بھی اپنے مرحوم شوہروں کا نام لینے سے شرماتی تھیں، سردار بیگم نے بڑی جرات سے کام لے کر اقبال کو

خود خط لکھا۔

سردار بیگم نے خط میں لکھا کہ اقبال نے بے وجہ ان کے خلاف تہمت پر یقین کر لیا۔ نکاح ہو چکا ہے، اب وہ دوسری شادی نہیں کریں گی، زندگی اسی حالت میں گزاریں گی اور قیامت کے دن اقبال سے اپنا حق مانگیں گی۔

اقبال کو یہ خط ملا تو انہوں نے مختار بیگم کو دکھایا۔ اُن کی نرم دلی تو مشہور تھی، دل بھر آیا اور رونے لگیں۔ پھر اقبال کو بخوشی اجازت دے دی کہ وہ سردار بیگم کو بھی گھر لے آئیں۔

201

ایما ویگے ناست کے والد کے انتقال کی خبر ملی، شاید ایما ہی نے خط لکھا ہو گا۔ اقبال نے خلافِ معمول جرمن کی بجائے انگریزی میں جواب دیا اور اس کے بعد ایما کو سارے خطوط انگریزی ہی میں لکھے۔

لاہور

۳۰ جولائی ۱۳ء

ڈیر مس ویگے ناست

مجھے آپ کے والد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بے انتہا صدمہ ہوا ہے اور اگرچہ میرا خط اس افسوس ناک سانحے کے بہت دنوں بعد آپ تک پہنچے گا مگر اس نقصان میں مجھے آپ کے ساتھ جو ہمدردی ہے اس کی شدت کو نہ وقت کم کر سکتا ہے نہ فاصلہ۔ اس خبر سے مجھے حقیقتاً بڑا دکھ ہوا ہے اور میں خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اُس بزرگ اور قابلِ احترام ہستی پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔ ''بیشک ہم خدا ہی کے لیے ہیں اور خدا ہی کی طرف ہم لوٹ کر جاتے ہیں'' یہ وہ آیت مقدسہ ہے جو ہم کسی کی وفات کی خبر سن کر پڑھتے ہیں اور آپ کا غم واندوہ پڑھ کر میں نے یہ آیت بار بار دہرائی ہے۔ ایسے

سانحات ہر شخص کی زندگی میں ضرور آتے ہیں اور لازم ہے کہ ہم اپنے مصائب کا سامنا اُسی استقلال کے ساتھ کریں جیسا کہ اُن لوگوں نے کیا جن کی زندگیاں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ گوئٹے نے اپنی موت کے لمحے میں کیا کہا تھا: ''مزید روشنی!'' موت مزید روشنی کی طرف ایک نیا راستہ کھول دیتی ہے اور ہمیں اُن مقامات تک لے جاتی ہے جہاں ہم ابدی سچائی کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی اور مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی وہ پرمسرت ایام یاد ہوں گے جب ہم روحانی طور پر ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں، یہاں تک کہ میں روحانی لحاظ سے آپ کے غم میں شریک ہوں۔

جب آپ کا خط لکھنے کو جی چاہے تو براہِ کرم مجھے ضرور لکھیے۔ کاش میں جرمنی میں ہوتا تاکہ اپنی ہمدردی ذاتی طور پر آپ تک پہنچا سکتا۔

فی امان اللہ

ہمیشہ آپ کا

محمد اقبال ایڈووکیٹ

لاہور

202

سردار بیگم کے بارے میں تمام شبہات ختم ہو گئے تو اقبال کو ایک اور خدشہ لاحق ہوا یعنی اپنے دل میں نکاح ختم کرنے کا ارادہ کر چکے تھے تو کہیں اس طرح نکاح ختم نہ ہو گیا ہو۔

ویسے وہ خود بھی سمجھتے ہوں گے کہ شرعی اعتبار سے شبہے کا جواز نہیں کیونکہ اگر صرف اقبال کے سوچنے سے چیزیں ہو جایا کرتیں تو نہ جانے دنیا کیا سے کیا ہو گئی ہوتی مگر

بہر حال انہوں نے مرزا جلال الدین کو حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا جنہوں نے کہا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی لیکن اگر شبہ دُور نہیں ہوتا تو اپنی تسلی کے لیے دوسرا نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔[۱۴۸]

203

اقبال احمدی عقاید سے اختلاف رکھتے تھے تو پھر قادیان سے فتویٰ طلب کرنے کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یہ شرعی تحقیق کا مسئلہ تھا جس میں اقبال شاید پروفیسر آرنلڈ جیسے کسی مستشرق کی رائے کو بھی جس نے اسلامی شریعت کا وسیع مطالعہ کیا ہو کسی ایسے مفتی کی رائے پر ترجیح دے سکتے تھے جس کے فتوے کی بنیاد صرف کہے سنے پر ہو۔ نیک نیتی شرط تھی اور حکیم نورالدین کی نیک نیتی پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی جو اقبال کے اُستاد کے دوست ہونے کی وجہ سے خود اقبال کے لیے بھی ایک طرح سے بزرگ کا درجہ رکھتے تھے۔

204

یکم اگست کو حسن نظامی کے ہفت روزہ توحید میں اقبال کے وہ سینتالیس اشعار شائع ہوئے جو انہوں نے رومی کو خواب میں دیکھنے کے بعد کہے تھے۔ ان کا عنوان شاید حسن نظامی نے خود ہی تجویز کیا تھا، 'مثنوی اسرارِ خودی'۔

''یہ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شہرۂ آفاق اور ہر دلعزیز شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے،'' حسن نظامی نے تعارفی نوٹ میں درج کیا اور پھر اقبال کا رومی والا خواب بیان کرنے کے بعد لکھا، ''پہلی قسط اخبار توحید کے ذریعے شائع کی جاتی ہے... ناظرین نظرِ غور سے پڑھیں۔ نوکری کی نسبت جو کچھ جنابِ اقبال کے قلم سے نکلا ہے وہ اس قابل ہے کہ دَورِ حاضر کے وہ تمام نوکری پرست لوگ جو دوسروں کی غلامی کے لیے باہمی کشمکش میں مبتلا ہیں [یہاں شاید کچھ الفاظ چھپنے سے رہ گئے]... ہندو کہتے

ہیں کہ ہم غلام بنیں گے، مسلمان کہتے ہیں یہ حلقہ ہمارے کان میں ڈالنا چاہیے، ایسے دارو گیر کے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ہندوستانیوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرے گی ۔ میں چاہتا ہوں کہ ناظرینِ توحید اِس نظم کو خود بھی یاد کریں اور اپنے دوستوں کو بھی یاد کروائیں ۔''[۱۴۹]

205

انسانی نفس کی اصلاح شبلی کے خیال میں کائنات کا سب سے مقدس فریضہ تھا جسے زبان یا قلم کے ذریعے بھی انجام دے سکتے تھے اور طاقت کے زور پر بھی مگر [سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ...فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آ جائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو۔'' شبلی کے خیال میں یہ جامعِ کامل آنحضرتؐ کی ذاتِ مبارک تھی۔

206

اگست کی ۳ تاریخ تھی۔ کانپور والا واقعہ اب دیوار یا وضو خانے کا مسئلہ نہ تھا بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی اور قومی وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔ کلکتہ، پٹنہ، کراچی، لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں احتجاجی جلسے ہو چکے تھے۔

اُس روز کانپور کے عیدگاہ میدان میں ایک بار پھر جلسہ ہوا جس میں پچیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی اور آخر یہ سب مسجد کی طرف روانہ ہوئے تا کہ گری ہوئی دیوار کو دوبارہ تعمیر کر دیں۔ برطانوی فوج نے گولی چلائی اور ستر مسلمان ہلاک ہو گئے۔ بہت سے گرفتار کر لیے گئے۔

207

مولوی میر حسن کے پوتے سید محمد عبداللہ اقبال کے پاس آئے ہوئے تھے۔ اقبال نے کہا کہ وہ یورپ کے بڑے بڑے عالموں سے بے جھجک بات کر لیتے ہیں مگر نجانے کیا بات ہے کہ شاہ جی (مولوی میر حسن) سے بات کرتے ہوئے بولنے کی قوت جواب

دے جاتی ہے۔ اگر اُن کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہوتو اُسے باآسانی زبان پر نہیں لا سکتے۔

ایک روز عبداللہ نے اقبال کو اچھے موڈ میں دیکھا تو کہا، ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے کہ آپ اپنے اشعار شیخ عبدالقادر کو تو سناتے ہیں مگر ہمیں کبھی نہیں سناتے!

اِس پر اقبال نے انہیں کچھ نئے اشعار سنائے جو فارسی مثنوی کے لیے لکھے گئے تھے۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ رومی کہتے ہیں پتھر اُس وقت تک ہرا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی سطح کو مٹی نہ بنالے تاکہ اُس پر سبزہ اُگ سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا روم نے درست نہیں کہا مگر بات یہ ہے کہ جب تک تم اپنی خاک کی مٹھی کو اپنے قابو میں نہیں کرو گے تم محض دوسروں کے سبزے کے لیے کھیت بنے رہو گے۔

اِس کے بعد حضرت علی کی تعریف میں کہا تھا کہ کوہِ طور جس پر حضرت موسیٰ کو خدا کا جلوہ دکھائی دیا تھا وہ حضرت علی کے گھر کے غبار کی ایک موج تھا کہ آپ کا گھر خود کعبے کے لیے قبلہ گاہ ہے!

طور موجے از غبارِ خانہ اش

کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش[۱۲۹]

اقبال اُس واقعے کی طرف اشارہ کرنا چاہ رہے تھے جب حضرت علیؓ کو زمین پر مٹی پر لیٹے ہوئے دیکھ کر رسول اللہؐ نے انتہائی محبت کے ساتھ 'بوتراب' کا لقب دیا تھا۔ اقبال سمجھتے تھے کہ یہ رسول اللہؐ کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ حضرت علیؓ اپنے خاکی عناصر پر قابو پا کر اُن سے بلند ہو چکے ہیں۔

''موجے از غبار'' کی ترکیب پر عبداللہ سوچ میں پڑ گئے اور آخر ہمت کر کے کہہ دیا کہ یہ ترکیب پہلے کبھی نہیں سنی۔ اقبال نے سامنے رکھی ہوئی مولوی میر حسن کی لغت اٹھائی مگر ترکیب اُس میں بھی نہیں ملی تو اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے لغت بند کر دی کہ میں جس مفہوم کو بیان کرنا چاہتا ہوں اُس کے لیے یہی الفاظ موزوں ہیں۔

208

مرزا جلال الدین کے لڑکوں کو گجرات کے رہنے والے کوئی مولوی محمد حسین صاحب عربی پڑھایا کرتے تھے۔ مرزا صاحب نے پہلے سیالکوٹ والی ریل گاڑی میں دو افراد کا سلیپر بک کروایا (جسے اُن دنوں 'کوپا' کہا جاتا تھا) اور اس کے بعد مولوی محمد حسین صاحب کو اپنے دفتر میں بلوا کر اقبال اور سردار بیگم کا دوبارہ نکاح پڑھوایا۔

مختار بیگم کچھ دنوں کے لیے لدھیانے روانہ ہو گئیں اور اقبال کو سردار بیگم کے ساتھ سیالکوٹ بھیج دیا گیا۔

209

۱۰ اگست کو بلغاریہ نے یونان، مونٹینگرو، سربیا اور رومانیہ سے صلح کر لی۔ دوسری بلقان جنگ ختم ہو گئی مگر یہ معلوم ہو گیا کہ مشرقی یورپی ریاستوں کی آپس کی دشمنی گویا یورپ کے بارود خانے میں دبی ہوئی ایک چنگاری ہے۔

یہ پریشانی کی بات تھی۔

300

اقبال اور سردار بیگم نے آٹھ دس دن سیالکوٹ میں گزارے اور پھر ایک روز مرزا صاحب کو واپسی کا تار ملا۔ اگرچہ اقبال اپنے ہی شہر واپس آ رہے تھے مگر یہ اُن کا استقبال کرنے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔

اقبال نے انہیں دیکھا تو بڑی گرم جوشی سے ملے اور انگریزی میں کہا:

''میں بالکل مطمئن ہوں۔ میں جنت الفردوس میں آ گیا ہوں۔''[۱۲۰]

301

کچھ دن بعد مختار بیگم بھی میکے سے واپس آ گئیں اور دونوں بیویاں مل جل کر رہنے لگیں۔ اُن کی عمریں ایک سی تھیں، طبیعت ملنسار اور دونوں ہی یتیمی کے صدمے سے گزر

کر بڑی ہوئی تھیں چنانچہ سہیلیوں کی طرح رہتی تھیں۔

مختار بیگم کو بلی پالنے کا شوق تھا۔ انہوں نے ایک بلی پال رکھی تھی جس کا نام پُتّی رکھا ہوا تھا مگر اقبال کے وہ کبوتر محفوظ رہتے تھے جن کے لیے انہوں نے بڑے سے کمرے جیسا پنجرہ بنوایا ہوا تھا۔ سردار بیگم نے طوطا، مینا اور چوزہ پالے تھے جن میں سے طوطے کی باتیں اقبال کو اچھی لگتی تھیں اور وہ اُسے سیٹی بجا کر بلاتے بھی تھے مگر مینا جو زیادہ بولتی تھی اُسے وہ چغل خور کہتے تھے۔[۱۳۱]

اقبال کی چھوٹی بہن کریم بی بی جن کی اُن دنوں اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی تھی وہ بھی آ گئیں۔ انہیں پڑھنے لکھنے سے دلچسپی تھی، طبیعت میں مزاح بھی زیادہ تھا اور اقبال سے صرف تین برس چھوٹی ہونے کی وجہ سے بہنوں میں وہی اقبال سے قریب ترین رہی تھیں۔ سردار بیگم سیالکوٹ سے شیخ عطا محمد کی دو چھوٹی لڑکیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔ شاید احساس ہوا ہو گا کہ اقبال کے دل پر بھائی کے احسانوں کا بہت بوجھ ہے۔[۱۳۲]

اقبال شام کے فارغ اوقات میں گھر بیٹھ کر لوڈو کھیلتے یا کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑاتے تھے۔ ہر شام دوستوں کے گھر جانا بھی ختم ہو گیا۔ دوست اب زیادہ تر اُنہی کے گھر آتے تھے اور مردانے میں گپ شپ رہتی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب کے متعلق جتنے قصے مشہور ہیں، اُن کے صحیح یا غلط ہونے کا فی الحال سوال نہیں،'' جلال الدین کہتے ہیں۔ ''لیکن میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ [سردار بیگم] سے شادی کے بعد... اُن کے طور طریقے اور زندگی کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا۔''[۱۳۳]

اقبال کی بڑی لڑکی معراج بیگم اب سترہ برس کی تھیں۔ خوش شکل تھیں اور کافی ذہین

بھی۔

اُنہیں خناریز کا مرض ہو گیا جس کا کوئی حتمی علاج اُس زمانے میں موجود نہیں تھا۔ اُن کے نانا حافظ عطا محمد خود سرجن تھے، اُنہوں نے آپریشن کر کے متاثرہ غدود نکال دیا مگر کچھ عرصے میں تکلیف دوبارہ ہو گئی۔[۱۳۴]

303

''ایک دن سر علی امام نے مجھ سے کہا کہ مہاراجہ الور کو ایک قابل پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے،'' اقبال کا بیان ہے۔ ''میں منشی طاہر الدین اور علی بخش کو ساتھ لے کر الور پہنچ گیا۔ وہاں ہم مہمان خانۂ شاہی میں ٹھہرائے گئے۔

''دوسرے ہی دن صبح ایک مسلمان حجام ہماری خدمت کے لیے آیا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر اقبال آئے ہیں جو مسلمانوں کے بڑے مشہور شاعر اور رہنما ہیں۔ اُس نے میری حجامت بناتے بناتے مجھ سے پوچھ لیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اس کے بعد اُس نے بہت رک رک کر نہایت تامّل سے کہا، 'صاحب! آپ یہاں نوکری نہ کریں تو اچھا ہے۔' میں نے پوچھا، 'وجہ؟' اُس نے پھر تامّل کر کے کہا، 'صاحب! کچھ نہیں، ہم تو غریب رعایا ہیں، اپنے مہاراج کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ لیکن آپ کے لیے کوئی ضروری تو نہیں کہ یہاں کی نوکری کریں۔' جب میں نے اُس سے بہ اصرار وجہ پوچھی تو اُس نے ہزار تامّل کے بعد وہ ناگفتہ بہ باتیں سنائیں جو اُن اطراف میں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔''

مہاراجہ سے ملاقات ہوئی تو وہ اقبال کو ملازمت دینا چاہتے تھے مگر تنخواہ صرف چھ سو روپے ماہوار تھی۔ اقبال کو یہ بھی اندازہ ہوا کہ مہاراجہ پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ کسی ہندو کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنائیں۔

اقبال نے جواب سوچنے کے لیے مہلت طلب کی اور پھر پلٹ کر الور کی طرف نہ دیکھا۔

فارسی میں چار اشعار کی ہجو لکھی کہ الور میں انسانیت مت ڈھونڈو، یہ بیج اِس زمین میں بویا ہی نہیں گیا![135]

304

الور کے مہاراجہ تو خیر ویسے ہی بدنام تھے مگر اقبال کی زندگی میں یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ وہ ریاستوں میں ملازمت کے حصول کے لیے کوشش بھی کرتے رہے مگر جب کہیں سے کوئی پیشکش ہوئی تو راضی بھی نہیں ہوئے۔

305

کیا قوموں کے عروج و زوال سے کوئی سبق لیا جا سکتا ہے؟

جب ہندوستان میں تیموری مغلوں کی طاقت کمزور پڑی تو رہیل کھنڈ کے سردار غلام قادر نے جسے مغل بادشاہ نے کافی تکلیف پہنچائی تھی، اپنا انتقام اس طرح لیا کہ دارالحکومت پر حملہ کیا اور شاہی محل میں داخل ہو کر اپنے خنجر سے تیموری بادشاہ کی آنکھیں نکال دیں۔ اس کے بعد شاہزادیوں کو رقص کرنے کا حکم دیا۔

کہتے ہیں کہ جب شاہزادیاں رقص کر رہی تھیں تو رہیلہ اپنا خنجر سرہانے رکھ کر تخت پر سو گیا اور شاہزادیاں رقص کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد اُٹھا اور کہنے لگا کہ وہ سویا نہیں تھا بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا کوئی شاہزادی اُسے قتل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ معلوم ہوا غیرت اور حمیت اب تیمور کے گھر میں باقی نہیں رہی۔

اقبال اس واقعے کو نظم کرنے لگے۔

رہیلہ کس قدر ظالم، جفاجو، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

نظم: غلام قادر رہیلہ[136]

306

کانپور میں بچوں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا اور خبر مشہور تھی کہ گولیوں سے مرنے والوں میں بھی بچے شامل تھے۔ شبلی نعمانی نے نظم لکھی جس کے اس شعر پر بہت لوگ روئے:

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں

دیں

یہ بچے ہیں انھیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

بعض علماء نے یاد دلایا کہ مسجد کا جو حصہ منہدم ہوا وہ وضو خانہ تھا جسے شریعت میں مسجد سے الگ سمجھا گیا ہے مگر شبلی نے ایک اور نظم لکھ دی کہ کیا اب فرقہ بندی کا اثر دیواروں تک بھی پہنچ گیا ہے کہ مسجد اور وضو خانے کو الگ الگ قرار دیا جا رہا ہے؟

سرکردہ مسلمان کانپور کے مظاہرین کی رہائی کے لیے حکومت کے اہلکاروں سے ملنے لگے۔

307

اکبر الہ آبادی کے ایک عقیدتمند عبدالماجد دریابادی تھے۔ ایم اے کے طالبِ علم تھے مگر فلسفۂ جذبات پر کتاب لکھ رہے تھے۔ اکبر نے اُنھیں کانپور کے بارے میں یہ اشعار لکھ کر بھیجے:

شیخ صاحب تو یہاں فکرِ مساوات میں ہیں

بھائی صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں

قوم کے حق میں تو اُلجھن کے سوا کچھ بھی نہیں

صرف آنر کے مزے اُن کی ملاقات میں ہیں

سربسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف

بس ہمیں اس رزولیوشن کی خرافات میں ہیں

308

کسی چیز کی تقدیر اس بات پر منحصر ہے کہ وہ چیز کیا ہے۔ آئینے کی تقدیر یہ ہے کہ بالآخر اُسے ٹوٹنا ہے اور پتھر کی تقدیر یہ ہے کہ دوسروں کو اُس سے ٹکرا کر ٹوٹنا ہے۔

انسان کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ خود کو بدل سکتا ہے۔

ٹُوٹ کر آئینہ سکھلا گیا اسرارِ حیات
آبرو چاہے تو کر سختی خارا پیدا[۱۲۷]

309

مولانا محمد علی جوہر اپنے مسلم لیگی ساتھی سید وزیر حسن کے ساتھ لندن پہنچ گئے اور سید امیر علی سے مطالبہ کیا کہ لندن مسلم لیگ کانپور کے واقعے پر احتجاجی جلسے منعقد کروائے مگر امیر علی راضی نہ ہوئے۔

اُن دنوں بیرسٹر جناح بھی لندن آئے ہوئے تھے۔ محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن نے اُنہیں مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی تو اُنہوں نے شرط رکھی کہ وہ کانگریس سے علیحدہ نہیں ہوں گے اور نہ ہی کوئی ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ ہوں گے جو ہندوستان میں ایک متحدہ قوم کے تصور کے خلاف جاتا ہو۔

یہ شرط تسلیم کرنا اب کوئی مسئلہ نہ تھا کیونکہ مسلم لیگ بھی اب اسی راہ پر چل نکلی تھی۔

310

اقبال اور مرزا جلال الدین بھی کانپور گئے۔ اقبال ۶ ستمبر کو وہاں پہنچے اور حسن نظامی کے ساتھ شہر کے کلکٹر سے مسجد کے بارے میں گفتگو کی۔

اگلے روز وہ الہ آباد روانہ ہوئے تاکہ اکبر الہ آبادی سے ملاقات کر سکیں۔ اُن سے فرمائش کی کہ پٹنہ کے بیرسٹر مظہر الحق کی تعریف میں کوئی شعر کہہ دیں جو علی امام کے دوست تھے اور جنہوں نے بڑی محنت اور خلوص سے کانپور کے قیدیوں کی پیروی کی تھی۔

اکبر نے دو اشعار لکھے جو حسن نظامی کے ہفت روزہ توحید کو دے دیے گئے۔

اکبر سے ملاقات کے دوران کشن پرشاد کا ذکر بھی آتا رہا۔ ملاقات کی اور کوئی تفصیل معلوم نہیں۔

اقبال ۸ ستمبر کو الہ آباد سے روانہ ہو گئے۔[۱۳۸]

311

حکیم اجمل خاں سے اقبال کی راہ و رسم کب شروع ہوئی یہ تو معلوم نہیں مگر اس دفعہ کانپور سے واپس آتے ہوئے وہ علاج کی غرض سے حکیم صاحب کے پاس کچھ دن ٹھہرے۔

ظہیرؔ دہلوی کے نواسے اشتیاق حسین دہلوی ملے۔ معلوم ہوا مہاراجہ کشن پرشاد نے ظہیرؔ کے قصائد اور روزنامچے کی اشاعت کے لیے دو سو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اقبال نے مشورہ دیا کہ مسودے کی کانٹ چھانٹ اور طباعت کا کام حسن نظامی کے سپرد کر دیا جائے اور کشن پرشاد کو خط لکھا جائے کہ وہ روپیہ براہِ راست انہی کو بھجوا دیں۔

312

''کانپور سے واپس ہو کر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر، دہلی میں کئی روز مقیم رہے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے ان کے اعزاز میں عمائدِ شہر کو مدعو کیا تھا۔ شعر و شاعری کی وہ دلچسپ صحبت گرم رہی کہ دہلی کے دورِ گزشتہ کا لطف آ گیا۔ حاذق الملک کی غزل بھی پڑھی گئی۔ معلوم ہوا کہ حکیم صاحب شعر گوئی میں بہت اچھا ملکہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے فرمایا۔ حاذق الملک ہیں، محض طبیب نہیں ہیں یعنی ان کو حکمت جیسی بے مثل نعمت کا حصہ ملا ہے۔''

یہ خبر ہفت روزہ توحید میں ۱۶ ستمبر کو چھپی اور اکبر الہ آبادی کے اشعار بھی 'اکبری سارٹیفکیٹ مسٹر مظہر الحق کو حسبِ فرمائش حضرت اقبال' کے عنوان سے شائع ہوئے۔[۱۳۹]

لاہور واپسی کے بعد اقبال کو اُسی مہینے ایک مقدمے کے لیے فیروزپور جانا پڑا۔

''غرض کہ یہ تمام دن سفر میں گزرے اور اس وجہ سے آپ کی خدمت میں عریضۂ نیاز نہ لکھ سکا،'' اقبال نے یکم اکتوبر کو کشن پرشاد کے نام لکھا۔ ''اب خدا کے فضل و کرم سے لاہور میں ہوں اور شکر ہے کہ ہر طرح سے خیریت ہے...سنا ہے حیدرآباد میں پھر تغیرات ہونے والے ہیں۔ سالار جنگ بغرض تعلیم ولایت جاتے ہیں اور اُن کی جگہ مسٹر علی امام وزارت پر مامور ہوں گے۔ کیا اِس خبر میں صداقت ہے؟ مرزا جلال الدین صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔ بچوں کو میری طرف سے پیار!''

شاید کشن پرشاد کو اُن دنوں کوئی عہدہ یا خطاب وغیرہ ملا تھا کیونکہ اقبال نے یہ بھی لکھا کہ ''سرکار کی عزت افزائی کی خبر سے دل شاد ہوا۔'' اس کے علاوہ اپنے مفصل حالات لکھے تھے، ظہیر مرحوم کی کتابوں کی اشاعت کے لیے سفارش کی تھی اور ایک زیرِ تکمیل نظم کے دو اشعار انہیں بھیجے تھے۔

انسان دنیا میں مجبور نہیں ہے اور اپنی مرضی سے دنیا کو بدل سکتا ہے:

گم گشتۂ کنعاں ہے اے خوگرِ زنداں تُو
بستی کے خیاباں میں ہر پھول زلیخا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
تُو ہستیِ بینا ہے، دانا ہے، توانا ہے

پہلے شعر میں استعارے ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہو رہے تھے چنانچہ بعد میں اقبال نے اِسے منسوخ کر دیا۔ دوسرے شعر میں لفظی ترمیم کر کے ایک چھوٹی سی نظم اپنی پرانی بیاض کے ایک صفحے میں بچی ہوئی جگہ پر لکھ دی۔

یہ اُن کے خیالات کی بڑی اچھی عکاسی کرتی تھی یعنی دُنیا میں ہر چیز اپنے اپنے مقام کی پابند ہے جبکہ انسان ہی وہ ہستی ہے جس کی ہر جبلت اُسے فطرت سے ایک نیا تقاضا

کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اُسے دنیا میں جو کچھ پسند نہ ہو وہ اُسے بدل کر اپنی پسند کے مطابق بنا سکتا ہے۔ لیکن اگر اقبال کسی پیرِ مشرق، خاص طور پر اکبر الٰہ آبادی سے اس کا تذکرہ کرتے تو وہ ان سے اختلاف کرتے اور بتاتے کہ مشرقی روحانیت میں دنیا کو بدلنے پر اتنا زور نہیں دیا گیا۔

اقبال جانتے تھے مگر وہ اُس پورے نظامِ فکر کے خلاف جا رہے تھے اور شاید اُس وقت خود انہیں بھی اندازہ نہ رہا ہو کہ بالآخر یہ کتنی بڑی بغاوت بن جائے گی۔

انسان

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو
فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اِس ذرّے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرّہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

314

کشن پرشاد کی طرف سے اقبال کے خط کا جواب آیا۔ اپنے دو اشعار پر اقبال کی رائے طلب کرنے کے علاوہ انہوں نے بالآخر وہ پیشکش بھی کر دی جو کسی شاعر کی زندگی کا نصب العین ہو سکتی تھی۔

کشن پرشاد اقبال کو ایک شاندار وظیفہ دینے پر آمادہ تھے جو انہیں زندگی کی ضرورتوں سے بے نیاز کر دے تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ ادب اور فن کی خدمت کر سکیں۔

315

لاہور، ۲۶ اکتوبر ۱۳ء

سرکار والا تبار۔ تسلیم۔

آپ کا نوازش نامہ کئی روز سے آیا رکھا ہے لیکن میں بوجہ عارضہ گردہ ایک ہفتے تک صاحب فراش رہا۔ دو تین روز سے افاقہ ہے۔ خدا نے فضل کیا، مرض جاتا رہا، میں باقی رہ گیا۔

دونوں اشعار خوب ہیں۔ واللہ قبائے وزارت کے نیچے شاعری، درویشی، سپہ گری اور خدا جانے کیا کیا کمالات آپ نے چھپائے رکھے۔ اللہم زدفزد۔

جو عنایت آپ اقبال کے حال پر فرماتے ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو۔ دوست پروری اور غریب نوازی آپ کے گھرانے کا خاصہ ہے اور کیوں نہ ہو جس درخت کی شاخ ہو اس کے سائے سے ہندوستان بھر مستفیض ہو چکا ہے۔ الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی، سات آٹھ سو روپیہ ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لیے تو اس قدر رقم کافی بلکہ اس سے زیادہ ہے تاہم چونکہ میرے ذمہ اوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے اس واسطے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے۔ بڑے بھائی جان جنھوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا اب پنشن پا گئے، اُن کے اور اُن کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمہ ہیں اور ہونے چاہیے۔ خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔ تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی۔ ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے

ساتھ تین سال تک اُس کے لیے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں اُسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش دوسری بیوی کرنے سے پہلے یہ حال معلوم ہوتا۔ غرض کہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں رہنا میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ آہ! اس وقت ہندوستان میں ہنر کا قدر دان سوائے آپ کے کون ہے؟ میں تو بسا اوقات قحطِ خریدار سے تنگ آجاتا ہوں:

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

میں تو اپنا سامان یعنی قاش ہائے دلِ صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا ہوں جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا!! اللہ تعالےٰ آپ کو سلامت رکھے کہ آپ کی جانب سے ''بوئے کسے'' آتی ہے۔ متاعِ گرانمایہ اپنے دامن میں چھپائے رکھتا ہوں، حالات مساعد پاؤں تو دنیا کو دکھاؤں اور اگر حالات نہ ملے تو اقبال کو خیالاتِ ناگفتہ کا ایک متحرک مزار سمجھ لیجیے گا۔

آپ کی فیاضی کہ زمان و مکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے مجکو ہر کسی سے مستغنی کر سکتی ہے مگر یہ بات دیانت اور مروّت سے دُور ہے کہ اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے جس کی اہمیت بقدر اُس مشاہرے کے ہو۔ خدا کو منظور ہوا تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اقبال جو ہمیشہ سے معنوی طور پر آپ کے ساتھ رہا ہے صُوری طور پر بھی آپ کے ہمراہ ہوگا۔ آپ نے جس وسعتِ قلب سے اقبال کو یاد فرمایا، مروّت کی تاریخ میں یادگار رہنے کے قابل ہے اور بندۂ اقبال جس کو آپ ازراہِ کرم گستری لفظ دوست سے مفتخر فرماتے ہیں نہایت سپاس گزار ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مہاراجہ بہادر کے دلی مقاصد بر لائے اور اُن کے اعدا کو ذلیل و خوار کرے۔ آمین۔

بندۂ درگاہ محمد اقبال

کیا سرکار نے اپنا اردو دیوان مرتب کر لیا؟ اُسے ضرور شائع ہونا چاہیے۔

اِس طرح اقبال نے وہ پیشکش رد کر دی جسے مغل عہد کا کوئی بھی شاعر قبول کر کے بقیہ زندگی بے فکری سے گزارنے پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ وہ نئے زمانے کے شاعر تھے۔

316

چاند سورج سے روشنی مانگتا ہے اِسی لیے اُس کے دل پر شرمندگی کا داغ ہے، اقبال سوچ رہے تھے۔

کسی سے کچھ مانگنے پر خودی کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور یہ مقدس درخت خدا کی تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیا خوب ہے وہ شخص جو دھوپ میں پیاسا ہونے پر بھی خضرؑ سے پانی قبول نہ کرے بلکہ بلبلے سے خودی اور خودداری کا سبق سیکھے کہ وہ بھرے سمندر میں اپنا پیالہ اُلٹائے رکھتا ہے۔[۱۴۰]

317

محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن آندھی اور طوفان کی طرح پیرس جا کر لندن میں جلسوں کے لیے آغا خاں کی منظوری لے آئے تھے اور دوبارہ امیر علی سے مطالبہ کر رہے تھے کہ لندن مسلم لیگ اُن کے منصوبوں کا ساتھ دے۔

امیر علی جسے انتہاپسندی سمجھتے تھے اُس کے ساتھ بہ جانے کی بجائے ۲۷ اکتوبر کو استعفیٰ پیش کر دیا۔

318

اُسی روز اقبال نے رسالہ توحید میرٹھ کے مضامین کے انتخاب پر تقریظ لکھی۔

حسن نظامی کے طرزِ تحریر کی سادگی اور سوز و گداز کے بارے میں اُن کی رائے تھی،

''خواجہ صاحب موصوف نے مولانا آزاد مرحوم کی طرح اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی

ہے۔ یہ مجموعۂ مضامین جس میں خواجہ صاحب کے مضامین بھی شامل ہیں ادبی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔"[۱۴۱]

319

۱۳ نومبر کو ہندوستان میں خبر پہنچی کہ اس سال ادب کا نوبل پرائز ٹیگور کو دیا گیا۔

320

نومبر کے وسط میں وائسرائے ہارڈنگ نے مدراس میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ کچھ دن پہلے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی مزدوروں نے اپنے رہنما گاندھی کے کہنے پر نسل پرست قوانین کے خلاف ہڑتال کی تھی۔ اُنہیں جنوبی افریقہ کی حکومت نے کوڑوں کی سزا دی تھی۔

"اُنہیں صرف ہندوستانیوں کی گہری ہمدردی ہی حاصل نہیں ہے،" ہارڈنگ نے کہا۔ "بلکہ مجھ جیسے بہت سے اور لوگوں کی ہمدردی بھی حاصل ہے جو اگرچہ ہندوستانی نہیں ہیں مگر یہاں کے باشندوں کے دُکھ سُکھ میں شریک ہیں۔"

۱۶ نومبر کو *Tribune* میں وائسرائے کی تقریر شائع ہوئی تو ہلچل مچی۔

321

نومبر کے آخر میں کشن پرشاد کی طرف سے ایک خط ملا جس پر اُن کے دستخط نہیں تھے۔ ساتھ میں ایک اہل کار کا پیغام تھا کہ کشن پرشاد کا لڑکا راجہ عثمان شاد فوت ہو گیا ہے۔

۳ دسمبر کو اقبال نے تعزیت نامہ بھیجا۔ "اللہ تعالیٰ اس بچے کو جنّت نصیب فرمائے،" انہوں نے لکھا، "زندگی اور موت ایک عجیب راز ہے، خصوصاً بچوں کی موت تو ایک ایسا سربستہ راز ہے کہ اس کا انکشاف حضرتِ انسان سے ممکن نہیں۔"

322

۱۰ دسمبر کو اسٹاک ہوم کے گرانڈ ہوٹل میں نوبل پرائز کی تقریب منعقد ہوئی۔ سویڈش اکیڈمی کی نوبل کمیٹی کے چرمین نے ٹیگور کے بارے میں ایک طویل تقریر کی۔ ٹیگور موجود نہیں تھے۔ اُن کا ٹیلی گرام پڑھ کر سنایا گیا: ''میں سویڈش اکیڈمی کو اپنے ستائشی تاثرات پہنچانا چاہتا ہوں جس کے فہم کی وسعت نے دُور کو قریب اور ایک اجنبی کو بھائی بنا دیا ہے۔''

اُس سال انعام کی رقم ایک لاکھ تینتالیس ہزار دس سویڈش کراون تھی۔

323

۱۳ دسمبر ۱۹۱۳ء کو پنجاب یونیورسٹی کی اورینٹل فیکلٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا اجلاس سینیٹ ہال میں ساڑھے پانچ بجے ہوا۔ چرمین جسٹس شاہ دین تھے۔ انہوں نے اقبال اور مولوی محمد حسین کے ساتھ اجلاس میں شرکت کی۔[۱۴۲]

324

''علوم وفنون کی صنف میں سیرت (بیاگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے،'' شبلی نعمانی اُس مضمون میں لکھ رہے تھے جسے سیرۃ النبیؐ کے مکمل ہونے پر کتاب کا دیباچہ بننا تھا۔ ''ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لیے دلیلِ راہ ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ غرض سعی وعمل، جدوجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

''اِس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو 'شخص' کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں وہ کس وسعت اور استقصاو تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں تا کہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ وخم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آ جائیں۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے فردِ کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

''...کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اِس وجودِ مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے جس کا نامِ مبارک محمد ہے، اللھمّ صلِّ علیہِ وسلّم صلوۃً کثیراً کثیراً''

شبلی نعمانی کی بےقرار طبیعت کو سیرۃ النبی کے منصوبے میں قرار مل گیا۔ سر سید اور سید امیر علی پر تنقید کرنے کی پرانی عادت ختم ہو گئی۔ جہاں جہاں سے کوئی ایسی بات معلوم ہو سکی جس سے رسولؐ کی سوانح کی شان بڑھائی جا سکے، بے دریغ قائل ہوئے اور ذاتی پسند ناپسند سے بلند ہوتے چلے گئے۔

325

شبلی نے معلوم کر لیا کہ وہ طالب علم کون تھا جس نے تین سال پہلے ان کی کتاب الکلام پر تنقید کی تھی۔ عبدالماجد دریا آبادی جو اَب ایم اے کر رہے تھے اور فلسفۂ جذبات پر کتاب لکھ چکے تھے جو بہت جلد شائع ہونے والی تھی۔

شبلی نے عبدالماجد کو سیرۃ النبی کے لیے باقاعدہ معاون بننے کی دعوت دی جو اُنہوں نے قبول کر لی۔ سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی پہلے ہی شامل ہو چکے۔ مگر شبلی کتاب کا جو معیار چاہتے تھے اُس میں ہفتوں کی محنت کے بعد دو تین صفحوں کا مواد ہاتھ آتا تھا۔

شعرُ العجم کی پانچویں جلد لکھی ہوئی پڑی تھی مگر ہوش نہ تھا کہ مسودے کو

ترتیب دے کر شائع کروائیں۔ ایک روشن خیال، باذوق اور صاحبِ دل عالم اپنی زندگی کے سب سے بڑے منصوبے پر مصروف ہو گیا تھا:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اَب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

شبلی نعمانی

بیگم صاحبہ بھوپال سے سیرۃ النبی کے منصوبے کو جو وظیفہ مل رہا تھا اس کی مدت اگلے برس اپریل میں ختم ہونے والی تھی۔ دسمبر میں بیگم صاحبہ نے اُسے کتاب کی تکمیل تک جاری رکھے جانے کا حکم دے دیا۔

326

دسمبر کے آخر میں حسن نظامی کے دوست شیخ احسان الحق نے، جو رسالہ توحید میں اُن کے شریک بھی تھے اقبال کی شاعری کے بارے میں کوئی مضمون لکھنے کے لیے اقبال سے رابطہ کیا۔

اُس وقت یا تو اقبال اجمیر میں تھے یا حسن نظامی اجمیر گئے ہوئے تھے مگر بہر حال اقبال نے ۲۷ دسمبر کو حسن نظامی کو لکھا، ''شیخ احسان الحق سے درخواست کیجیے کہ وہ اقبال کا اشتہار نہ دیں۔ میں اُن کا اور آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے اس زحمت سے بچائیں گے۔ آخر شاعری کی وجہ سے میں مشاہیر میں شامل ہوں گا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے آپ کو شاعر تصور نہیں کرتا۔''[۱۴۴]

327

۲۷ دسمبر کو کراچی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں شرکت کے لیے بیرسٹر محمد

علی جناح بھی آئے۔ وہ یہیں پیدا ہوئے تھے مگر بیس برس پہلے بمبئی میں آباد ہونے کے بعد کبھی یہاں واپس نہیں آئے تھے۔

کانگریس کے اجلاس میں انہوں نے اپنی ترتیب دی ہوئی ایک قرارداد منظور کروائی جس میں ہندوستانی کونسل کی ساخت میں بہت سی تبدیلیاں تجویز کی گئی تھیں تاکہ ہندوستانیوں کی نمائندگی بڑھائی جا سکے۔

اُنہوں نے ایک اور قرارداد کی حمایت میں بھی تقریر کی جس میں مسلم لیگ کو مبارکباد دی گئی کہ بالآخر اُس نے بھی برطانوی سلطنت میں رہتے ہوئے ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔

328

۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس آگرہ میں ہو رہا تھا۔ جناح پہلی دفعہ لیگ کے ایک رکن کی حیثیت سے شرکت کرنے آئے۔ ہندوستان میں اُن سے پہلے کسی سیاسی رہنما کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ بیک وقت نہ صرف ہندوستان اور لندن میں انگریز حکومت کے اندرونی معاملات میں شریک ہو بلکہ کانگریس اور لیگ میں بھی ایک ساتھ نمایاں اہمیت رکھتا ہو۔

جناح نے لیگ پر زور دیا کہ وہ ہندوستان میں مذہبی بنیادوں پر نمائندگی کے اصول پر اصرار نہ کریں اور اس مطالبے کو کم سے کم ایک سال کے لیے ملتوی کر دیں ورنہ ہندوستان کے عوام کا اتحاد دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

لیگ نے تجویز رد کر دی۔[۱۴۴]

تتمہ

مثنوی اسرارِ خودی کے اقتباس پڑھ کر شاید کسی کو اندازہ نہ ہوا ہو کہ جب یہ کتاب مکمل

ہو گی تو اقبال کی ایسی پہچان بنے گی کہ 'ہمالہ' اور انجمن حمایت اسلام کی نظمیں اس کے سامنے مدھم نظر آنے لگیں گی۔

بعد میں دیکھنے والوں کو یہی نظر آیا جیسے اقبال ہمیشہ سے اس منزل کی طرف بڑھ رہے تھے مگر اُنہیں جاننے والوں میں ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال رہا کہ اگر اقبال کی زندگی اور شاعری کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی تو وہ کیا ہوتے؟ یہ عطیہ فیضی تھیں جنہیں اقبال کی پرانی نظمیں خوش گوار دکھائی دیتی تھیں اور بعد کی شاعری جس میں قوم نے امید کا پیغام تلاش کیا وہ تلخیوں کا ردِ عمل نظر آتی تھی۔

''اپریل ۱۹۱۰ء اور جولائی ۱۹۱۱ء کے دوران میں بہت سی ایسی باتیں ہوئیں جنہوں نے اُن کی زندگی کو اجیرن بنا دیا اور کوئی چیز ایسی نہ تھی اُنہیں اُس مصیبت سے بچا سکتی جس کی وجہ سے وہ زندگی کو تلخ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگ گئے تھے،'' عطیہ کا خیال تھا۔ ''خدا بہتر جانتا ہے کہ آیا قدرت ہی اُن کے تخیل کی دنیا کو بدلنا چاہتی تھی یا واقعات نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ اقبال کی تمام تر توجہ اُس سے زیادہ اور پیچیدہ مسائل پر لکھنے کی جانب متوجہ ہو گئی جن پر وہ اب تک لکھنے کے عادی تھے...

''وہ شدید قنوطیت پسند بن گئے اور اس حالت میں وہ خدا سے سوال کرتے تھے تا کہ وہ اُن کے شبہات دُور کرے۔ جو جواب اُنہیں ملا وہ اُن کی زندگی کے کارناموں سے ظاہر ہے اِس لیے کہ سوالات کا سلسلہ مناسب تسلی حاصل کیے بغیر جاری رہا۔ بہت سی باتوں میں اُنہوں نے نیٹشے اور شاپنہار جیسے فلسفیوں کے نظریات میں کشش محسوس کی اور شیلے اور بائرن جیسے شعرا اُن کے ذہن سے دُور ہوتے چلے گئے۔''

ایما ویگے ناست نے اقبال کے خطوط سنبھال کر رکھے اور ۱۹۶۰ء یا اِس کے کچھ عرصے بعد اِس ہدایت کے ساتھ پاک جرمن فورم کے حوالے کر دیے کہ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کو اِن سے استفادہ کرنے دیا جائے۔[۱۳۵]

۱۹۶۴ء میں ایما فوت ہو گئیں۔ اُنہوں نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔

ضمیمہ

اقبال کی بیاضیں

علامہ اقبال میوزیم (جاوید منزل) لاہور میں اقبال کی قلمی بیاضیں اور مسودات موجود ہیں جن کی فوٹو کاپی اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) کی لائبریری میں دستیاب ہے۔ ان میں سے دو بیاضوں کے حوالے اس کتاب کے حواشی میں بھی موجود ہیں۔ چونکہ عام طور پر قارئین واقف نہیں ہیں لہٰذا ان بیاضوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلی بیاض

علامہ اقبال میوزیم کے کیٹلاگ میں اِس کا نمبر شمار AIM.1977.219 ہے۔ اِسی کو قیامِ یورپ کے زمانے کی بیاض کہا جاتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کیمبرج کے آخری زمانے میں یعنی ۱۹۰۷ء کے موسمِ بہار میں صرف شناساؤں کے پتے، تین فارسی اور ایک اُردو غزل انگریزی کی طرف کے صفحات میں درج کیں۔ باقی نظمیں ہندوستان واپسی کے بعد اُردو کی طرف سے درج کرنا شروع کیں کیونکہ یورپ کے زمانے کی نظمیں اُس ترتیب میں درج نہیں ہوئیں جس ترتیب میں وہ لکھی گئی تھیں، اور یہ اُن پر لکھی تاریخوں سے ظاہر ہے۔ واپسی کے بعد کہی ہوئی نظمیں کم و بیش تاریخی ترتیب میں درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ براہِ راست بیاض میں درج ہوئیں اور اس نوٹ بک کو مستقل بیاض کے طور پر استعمال کرنا واپسی کے بعد شروع ہوا۔

منظومات کی فہرست درجِ ذیل ہے۔

نظم کا عنوان	پہلا مصرعہ	بانگِ درا میں عنوان
	آشکارا چشمِ عالم پر ہوں	×
	خاموش ہے چاندنی قمر کی	ایک شام
	جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے	سلیمیٰ
	ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا	اخترِ صبح
	اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے	شبنم اور ستارے
	کوہسار کی رفعت سے آتی ہوئی ندی	×
	جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے	وصال
	آئے جو قراں میں دو ستارے	دو ستارے
...کے نام	فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تابِ صبح	کوششِ ناتمام
انسان	منظر چمنستاں کے زیبا ہوں یا نا زیبا	انسان
سسلی کو دیکھ کر	رو لے اب کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار	صقلیہ
	تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں	فراق
	کیا شرارا چمک اٹھا مری خاکستر میں	×
	سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو	بزمِ انجم
پیامِ عشق	سن اے طلب گارِ دردِ پہلو	پیامِ عشق
صبح	ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار	صبح
عبدالقادر کے نام		عبدالقادر کے نام
چاند اور تارے	ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے	چاند اور تارے
بلادِ اسلامیہ	سرزمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے	بلادِ اسلامیہ
ستارہ	قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو	ستارہ
ایک حاجی مدینے کے راستے میں	قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دُور	

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

عاشقِ ہرجائی	ہے کوئی مجموعۂ اضدادِ اے اقبال تو	عاشقِ ہرجائی (۱)
گم شدہ دستانہ	رکھا تھا میز پر ابھی ہم نے اتار کر	×
سیرِ فلک	تھا تخیل جو ہم سفر میرا	**سیرِ فلک**
	گل نے بلبل سے کہا لے ہم صفیر آیا ترا	×
	عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے	عاشقِ ہرجائی (۲)
گورستانِ شاہی	آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے	گورستانِ شاہی
...کی گود میں بلّی دیکھ کر	تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے	...
کی گود میں بلّی دیکھ کر		
Dedication to...	نغمۂ رنگیں سمجھ یا نالۂ پیہم سمجھ	×
	جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر	حسن و عشق
	دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا	ترانۂ ملّی
شیکسپیئر	شاہدِ مے کے لیے حجلۂ جامِ آئینہ	شیکسپیئر
فلسفۂ غم		**فلسفۂ غم**
رات اور شاعر		رات اور شاعر
انسان	قدرت کا عجیب یہ ستم ہے	انسان
عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں	یہ شالامار میں کہتا تھا ایک برگِ زرد	
عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں		
شاعر	جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے	شاعر
نورِ محمدی	جو ہے خالقِ دہر اور دہر بھی	×
قربانیِ خلیل	افق پر ہویدا ہوئی شانِ صبح	×
Frl. Gottesman	وہ مستِ ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے	

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر		فرما رہے تھے شیخ طریقِ عمل پہ وعظ
	ظریفانہ (حصہ سوئم)	
چاند	اے چاند حسن تیرا گردوں کی آبرو ہے	چاند
تنہائی	تنہائی شب میں ہے حزیں کیا	تنہائی
	نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیامِ عیش و سرور	عشرتِ امروز
نوائے غم	زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش	نوائے غم
جلوۂ حسن	جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب	جلوۂ حسن
پھول	تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی	پھول
	نالہ را انداز نو ایجاد کن	× (اسرارِ خودی)
غرۂ شوال	غرۂ شوال اے نورِ نگاہِ روزہ دار	غرۂ شوال
سبز گنبد والے آقا کے حضور	گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا	حضورِ رسالتمآب میں
	جب دکھاتی ہے کلی عارضِ رنگیں اپنا	کلی
دعا	یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے	دعا
دارالسلطنت دہلی	ہو گیا زخمِ دلِ بنگال آخر مندمل	×
	اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا	غزلیات (حصہ سوم)
نویدِ صبح	آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر	نویدِ صبح
	ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے	مسلم
	کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں	غزلیات (حصہ سوم)
	رفت و زخاکِ رہش برقِ تجلی دمید	×
موڑ	کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی	موڑ
شفاخانہ حجاز	اک پیشوائے قوم نے کل مجھ سے یہ کہا	
شفاخانہ حجاز		

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے　　　مسلم

فاطمہ بنتِ عبداللہ　　　فاطمہ بنتِ عبداللہ

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو　　　غزلیات (حصہ سوم)

جوشِ عشق سے ہوا رخِ بہار بے حجاب　　　×

یہ سرو و قمری و بلبل فریبِ گوش ہے　　　غزلیات (حصہ سوم)

غزل　　　دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش　　　شمع اور شاعر (شاعر)

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے

غزلیات (حصہ دوم)

اے گل ز خارِ آرزو آزاد چوں رسیدۂ　　　×

از آتشِ عشق سوختم خاشاکِ احتیاج را　　　×

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی　　　× (پیامِ مشرق)

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے　　　غزلیات (حصہ دوم)

انگریزی کی طرف سے نوٹ بک کے آغاز میں کچھ لوگوں کے پتے اقبال کی اپنی تحریر میں درج ہیں:

1. Herr F. Mitzworth (Germany)

2. Frl. Emma Wegenast (Germany)

3. Rene Pradere-Niquet (Bangkok)

4. Frl. Rose Cadenet (France)

5. Miss Sizaret (France)

6. Miss Ch. Ran (USA)

7. Miss A. Fyzee (India)

8. Miss E. Farwel (UK?)

9. Sir Frederick Pollock (UK)

10. Miss V. Denise Adams (UK)

11. Miss M. Shain (UK)

12. Miss E. Ramelow (Germany)

دوسری بیاض

علامہ اقبال میوزیم کے کیٹلاگ میں اس کا نمبر شمار AIM.1977.195 ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ میں کسی وقت اقبال نے اس بیاض میں اپنی نظمیں اکٹھا کرنی شروع کیں مگر ۱۹۱۲ء تک نئی نظمیں پچھلی بیاض ہی میں درج ہوتی رہیں اور صرف انہیں صاف کرنے کے بعد یہاں درج کیا گیا۔ نظم 'شمع اور شاعر' سے نئی نظموں کے لیے بھی یہی بیاض استعمال ہونے لگی۔ اُس نظم کا زمانہ فروری ۱۹۱۲ء ہے۔

نظم کا عنوان	پہلا مصرعہ	بانگِ درا میں عنوان
پھر بادِ بہار	آئی اقبال غزل خواں ہو	غزلیات (حصہ سوئم)
	منظور شکایت کا نرالا مجھے ڈھب ہے	×
شکوہ	کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں	شکوہ
قطعہ	کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے	نصیحت
شمع اور شاعر	دوش می گفتم بشمعِ منزلِ ویرانِ خویش	شمع اور شاعر
جوابِ شکوہ	دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے	جوابِ شکوہ

اس کے بعد ایک صفحے پر مندرجہ ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں:

۱۔ خطاب بخود

۲۔ حقیقتِ خودی

۳۔ زندگی موت

۴۔ استحکامِ خودی

۵۔ نیک و بد

۶۔ مابعد الموت

یہ گویا اسرارِ خودی کی ابتدا ہے۔ سات صفحے اسرارِ خودی کے اس بیاض میں مندرجہ بالا ترتیب کے مطابق درج ہیں جن کے درمیان شاید بعد میں لکھنے کے لیے خالی صفحے بھی چھوڑے گئے ہیں۔ ان کے بعد دو اردو نظمیں بلا عنوان ہیں۔ یہ بانگِ درا میں شامل نہیں کی گئیں۔ پہلے مصرے بالترتیب یہ ہیں:

۱۔ کہا یہ ایک مرے مہرباں نے کل مجھ سے

۲۔ عجیب چیز ہے مغرب کی زندگی جس سے

حاشیے

باب ۱: نیا مندر

جنوری سے جولائی ۱۹۰۵ء تک

۱۔ اقبال کا مضمون 'قومی زندگی'، عبدالواحد معینی اور عبداللہ قریشی (۱۹۶۳) میں شامل ہے اگرچہ وہاں پورے مضمون پر مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء کا حوالہ ہے جو غلط ہے۔ مضمون دو اقساط میں تھا جنہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ پہلی قسط اکتوبر ۱۹۰۴ء اور دوسری اوائل ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُردو میں قوم کا لفظ کئی معانی میں استعمال ہوتا تھا اور ایک عرصے تک اقبال بھی اِسے کم سے کم تین مختلف معانی میں استعمال کرتے رہے: (۱) برادری، جیسے لاہور کے کشمیری مسلمان (۱۸۹۶ء کی ابتدائی نظموں سے لے کر ۱۹۰۹ء کے اخباری مراسلے تک قوم کے یہ معانی نظر آتے ہیں)۔ (۲) وطن اور نسل، جیسا کہ اقبال کے ایک متروک قطعے کے مصرعے میں مذہب کے بارے میں لکھا ہے: ''رنگِ قومیت مگر اِس سے بدل سکتا نہیں۔'' (۳) ہم مذہب، جیسے مسلمان قوم۔ عام طور پر خیال ہے کہ اقبال نے یہ آخری معانی بعد میں تلاش کیے مگر مضمون 'قومی زندگی' میں یہ معانی ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء ہی میں موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظ قوم خواہ محاورتاً جتنے بھی معانی میں استعمال کرتے ہوں مگر ایک حیاتیاتی اکائی کے طور پر کم سے کم مسلمان قوم کی تعریف اُس زمانے میں بھی مذہب کی بنیاد پر کرتے تھے۔

۲۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۸۸-۸۷

۳۔ یہ محلّہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں برباد ہو گیا۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) میں خواجہ عبدالوحید کی روایت۔

۴۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۸۴

۵۔ Muhammad Siddique (1983)

۶۔اس نظم کا ماخذ روزگارِ فقیر ہے جہاں یہ چھ اشعار کا ترکیب بند ہے۔عنوان موجود نہیں۔گیان چند کا خیال ہے کہ یہ وطن پرست نظموں کے دور میں لکھی گئی ہوگی۔

۷۔ شبلی کے داغ کی محافلِ نشاط میں شامل ہونے کا بیان ایس ایم اکرام (۱۹۹۲) سے ماخوذ ہے۔

۸۔اپریل ۱۹۰۵ء کے مخزن میں یہ مرثیہ شائع ہوا چنانچہ مارچ ہی میں لکھا گیا ہوگا۔

۹۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶) ص ۱۵۰ اور ۱۸۳

۱۰۔حنیف شاہد (۱۹۷۶) ص ۱۵۰ اور ۱۸۴

۱۱۔ غلام رسول مہر نے روزنامچے میں لکھا کہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اقبال نے انہیں یہ واقعہ سنایا۔امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) ص ۲۶۰

۱۲۔زمانہ کانپور میں 'تنقید علم الاقتصاد' یہ مضمون تحسین فراقی (۱۹۹۲) ص ۳۹۶-۳۷۳ میں شامل ہے۔

۱۳۔ یہ نظم بانگِ درا میں شامل نہیں کی گئی۔چونکہ گیان چند (۱۹۸۷) میں بھی کسی وجہ سے نظر انداز ہوگئی ہے لہٰذا باقیاتِ اقبال میں سے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

ابر

نمودِ ابر سے ہشیار ہو گیا سبزہ
اِسی کے ہجر میں گویا اُداس تھا سبزہ
ہوا کے نم سے ہوئی نرم سرو کی ٹہنی
جو آ کے فاختہ بیٹھی تو جھک گئی ٹہنی
ہلا رہی ہے سرِ شاخِ گل کو موجِ ہوا
بنا ہے باغ میں بلبل کے واسطے جھولا
نشیمنوں سے نکل کر پرند گاتے ہیں

ہوا سے کھیلتے پھرتے ہیں چھپاتے ہیں
مری نگاہ میں پھرتا ہے اور ہی نقشا
جو دیکھتا ہوں خرامِ سکوں نما اُن کا
کھڑے ہیں محفلِ قدرت کو دیکھنے والے
کسان کھیتوں سے اُٹھ اُٹھ کے جھونپڑوں کو چلے
جفا کشی کا خضر کہیے ان کسانوں کو
یہ سبز کرتے ہیں کہسار کی چٹانوں کو

۱۴۔عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

باب۲:شمع کے سامنے

اگست ۱۹۰۵ء

۱۔ ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷)،ص۱۳۴پر ڈاکٹر سعید اللہ کا بیان ہے کہ انہوں نے اقبال سے سنا۔

۲۔عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)،ص۵۸

۳۔اعجاز احمد(۱۹۸۵)،ص۱۶۰-۱۵۷۔اعجاز احمد کے بیان کے مطابق ان کتابوں کی تعداد تیئس تھی اور انہوں نے بعد میں یہ کتابیں نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں دے دیں۔اعجاز احمد نے اپنی کتاب میں ان کی فہرست بھی درج کی ہے:

1. R.A.Wilmot (1857): *The Poets of the Nineteenth Century*
2. Wordsworth (1885): *Ode To Immortality*
3. *The Poetical Works of Longfellow (1882)*
4. E. Myers (tr. 2nd Edition, 1884) *The Extant Odes of Pindar*

5. E. K. Chambers: *English Pastorals*

6. O. Smeaton: *English Satires*

7. W. C. Lawton (1898):*The New English Poets*

9. Mrs. S. Orr (7th Edition, 1896): *A Handbook to the Works of Robert Browning*

10. E. H. Plamptre (1878): *The Tragedies of Sophocles*

11. E. H. Plamptre (1881): *The Tragedies of Aeschylos*

12-13. *The Poetical Works of Lord Houghton* (Two Volumes; 1876)

14. Sir Edwin Arnold (1897): *The Light of Asia, Or the Great Renunciation - being the life and teachings of Gautama as told in verse by an Indian Buddhist*

15. *The Poetical Works of James Beattie & The Poems and Plays of Oliver Goldsmith*

16. S. Colvin (1883): *Selections From Walter Savage Landor*

17. John Keats: *The Eve of St. Agnes*

18. Elizabeth B. Browning: *Sonnets From the Portugese*

19. **E. S. Haldane (1897):** *The Wisdom and Religion of a German Philosopher - being selections from the writings of G. W. F. Hegal*

20. **T. W. Rhys David (1886):** *Buddhism - being a sketch of the Life and Teachings of Gautama, the Buddha*

21. **Dean Church (1874):** *The Sacred Poetry of Early Religions: Two Lectures on (1) the Vedas and (2) the Psalms*

22. **H. L. Sidney Lear (tr.):** *A Selection from Pascal's Thoughts*

23. **T. W. Arnold (tr. from Italian):** *The Little Flowers of Saint Francis*

اِس فہرست کی آخری پانچ کتابیں ٹامس آرنلڈ کبھی ٹامس آرنلڈ کی ملکیت رہی تھیں اور اُنہوں نے اقبال کو دی تھیں۔ آخری کتاب کے مترجم خود آرنلڈ تھے۔

۴۔ منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) کے مطابق نعیم الرحمان نے جو اقبال کے شاگرد تھے اپنے بانگِ درا کے نسخے میں 'کنارِ راوی' کے حاشیے میں لکھا تھا: ''ایک شام کو راوی کے کنارے پر احباب کے ایک جلسے میں میں نظارے سے متاثر ہو کر کہی گئی۔''

باب ۳: سمندر

ستمبر ۱۹۰۵ء

۱۔ نیرنگ (۱۹۵۷)، ص ۱۱ تا ۱۳

۲۔ اِس باب میں اقبال کے بیانات روزنامہ وطن کے اڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں کے

نام مکتوبات ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء سے لیے گئے ہیں۔ یہ دراصل اقبال کا سفر نامہ تھا۔

۳۔ یہ امیر خسرو کی غزل کا مطلع ہے جس پر اقبال نے بعد میں غزل کہی۔ زبورِ عجم میں اقبال کی غزل کا مطلع ہے:

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

یعنی دونوں جہاں جس میں دیکھے جا سکیں وہ صراحی میرے پاس ہے مگر وہ نگاہ کہاں ہے جو ایسا تماشا دیکھنا چاہے۔

۴۔ The best worship, however, is stout working (In a letter to his wife)

۵۔ اقبال اور عطیہ فیضی کی ابتدائی گفتگو میں بھی اس کی مثال دیکھی جا سکتی ہے۔

۶۔ مسدس حالی کے مشہور اشعار سے ماخوذ ہے: جسے معمار رد کر چکے تھے وہ پتھر، وغیرہ۔

۷۔ اس سے پہلے نظم 'ابر گہر بار' (۱۹۰۳ء) میں بھی یہی خیال پیش کیا گیا تھا کہ رسولؐ اللہ کی صورت میں خدا خود اپنے حسن کا خریدار بن کر دنیا میں نمودار ہوا۔ بعد میں جاوید نامہ میں لفظ 'عبدہٗ'' کی بحث میں حلاج کی زبان سے یہ بات نسبتاً محتاط انداز میں کہلوائی۔ ''کاش میرے بدکردار جسم کی خاک...'' یہ وہی خواہش ہے جس کے متعلق بارہ برس بعد 'رموزِ بیخودی' کے آخر میں رسولِ اکرمؐ کے حضور عرض کی کہ آپؐ کے روضے کے قریب دفن ہونے کی خواہش دل میں ہمیشہ رہی ہے۔

۸۔ مکتوب کے آخر میں تحریر ہے: مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء، عدن۔

۹۔ یہ غزل پہلے دکن ریویو اور پھر اخبار وطن میں شائع ہوئی۔ کلیم والا شعر ان اشعار میں سے تھا جن کی وجہ سے ۱۹۲۵ء میں اقبال پر کفر کا فتویٰ لگا۔

۱۰۔ مکتوب بنام نگم مارچ ۱۹۰۶ء

۱۱۔ جس کاغذ پر اقبال سفر کے نوٹ لکھتے آئے تھے اور وہ کاغذ بھی جس پر پورٹ سعید سے نئے عربی الفاظ درج کیے تھے کہیں گم ہو چکے تھے۔

باب ۴: تثلیث کا مدرسہ

ستمبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۸ء

۱۔ اس باب میں اقبال کے زمانے کی کیمبرج یونیورسٹی کے بارے میں معلومات زیادہ تر سعید اختر درّانی (۱۹۸۴) سے ماخوذ ہیں جو اِس موضوع پر سب سے زیادہ گراں قدر کتاب ہے۔ دوسرے ماخذوں کی نشاندہی متعلقہ حوالوں میں کی گئی ہے۔

۲۔ تصور کیا جاتا ہے کہ کیمبرج میں تاریخ پیدائش درج کرنے کے بعد انہوں نے گھر والوں سے خط لکھ کر دریافت کیا ہوگا اور وہاں سے جواب آنے پر پی ایچ ڈی کے مقالے پر درست تاریخ لکھی ہوگی۔

۳۔ جہان آرا شاہنواز (۱۹۷۱ء)، ص ۳

۴۔ یہ خیالات اقبال کے لیکچر 'Islam As a Moral And Political Ideal' سے لیے گئے ہیں جو انہوں نے ۱۹۰۹ میں لاہور میں دیا تھا۔ یہ لیکچر Sherwani (1944/1995) میں شامل ہے۔

۵۔ یہ معلومات اقبال کے مضمون 'McTeggart's Philosophy' سے لی گئی ہیں جو میک ٹیگرٹ کی وفات کے بعد اُن کی سوانح پر تنقید کے طور پر لندن کے *Indian Art & Letters* کے ۱۹۳۲ء کے پہلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ میرا ماخذ Latif Sherwani (1944/1977), pp. 178-188 ہے۔

۶۔ محمد حسین عرشی کی روایت۔ ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷ء)، ص ۶۲

۷۔ سعید اختر درّانی۔ نوادرِ اقبال یورپ میں۔ ص ۲۰۰

۸۔ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ابتدائی دنوں میں کیا خاکہ رہا ہوگا مگر ڈیڑھ سال بعد مقالہ مکمل ہوا تو بنیادی خاکہ یہی تھا۔

۹۔ مقالے کا نسخہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تو اُس میں اقبال نے انیس مخطوطوں کی فہرست پیش کی جن میں سے تین جرمنی میں تھیں:

۱۔ تاریخ الحکما از بیہقی (رائل لائبریری برلن)

۲۔ شرحِ انواریہ (مع متن) از محمد شریف ہراتی (رائل لائبریری برلن)

۳۔ حکمت العین از کاتبی (رائل لائبریری برلن)

۴۔ شرح حکمت العین از محمد ابن المبارک البخاری (انڈیا آفس لائبریری)

۵۔ شرح حکمت العین از حسینی (انڈیا آفس لائبریری)

۶۔ عوارف المعارف از شہاب الدین (انڈیا آفس لائبریری)

۷۔ مشکوۃ الانوار از الغزالی (انڈیا آفس لائبریری)

۸۔ کشف المحجوب از علی ہجویری (انڈیا آفس لائبریری)

۹۔ رسالۂ نفس ترجمۂ ارسطو از افضل کاشی (انڈیا آفس لائبریری)

۱۰۔ رسالۂ میر سید شریف (انڈیا آفس لائبریری)

۱۱۔ خاتمہ از سید محمد گیسو دراز (انڈیا آفس لائبریری)

۱۲۔ منازل السائرین از عبداللہ اسماعیل ہراتی (انڈیا آفس لائبریری)

۱۳۔ جاویدان نامہ از افضل کاشی (انڈیا آفس لائبریری)

۱۴۔ تاریخ الحکما از شہزوری (برٹش میوزیم لائبریری)

۱۵۔ کلیاتِ ابنِ سینا (برٹش میوزیم لائبریری)

۱۶۔ رسالہ فی الوجود از میر جرجانی (برٹش میوزیم لائبریری)

۱۷۔ جاویدانِ کبیر (کیمبرج یونیورسٹی لائبریری)

۱۸۔ جامِ جہاں نما (کیمبرج یونیورسٹی لائبریری)

۱۹۔ مجموعۂ فارسی نسفی، رسالہ نمبر ۱، ۲ (ٹرنٹی کالج لائبریری)

۱۰۔ غنی کے اس شعر کو اقبال نے اپنی نظم 'خطاب بہ نوجوانانِ اسلام' (۱۹۱۴ء) میں تضمین

کیا:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مُسَلَّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

۱۱۔ شبلی کے مضمون کا حوالہ ایس ایم اکرام (۱۹۹۲)، ص ۳۲۰ سے لیا گیا ہے۔ ابن حزم کے مضمون کا ترجمہ اُردو میں حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قصص القرآن میں بی بی مریم کے باب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ عام طور پر دستیاب ہے۔

۱۲۔ مولانا ظفر علی خاں کے مضمون کے اقتباس نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۶۵ سے ماخوذ ہیں۔

۱۳۔ غلام رسول مہر نے روزنامچے میں لکھا کہ ۲۹ جنوری ۱۹۲۷ کو یہ واقعہ اقبال نے سنایا۔ امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) ص ۲۶۸

۱۴۔ درانی (۱۹۸۵) ص ۱۴۶ کے سامنے

۱۵۔ مکتوب بنام نگم، مارچ ۱۹۰۶ء

۱۶۔ ''لندن ایسی جگہ ہے جہاں کم آمیزوں کو بھی کہیں کسی سے ملنے کا وقت دینا پڑتا ہے اور ملاقات کا وعدہ لے کر کہیں منتظر رہنا ہوتا ہے۔ کسی ایسی ہی ملاقات کا اشارہ اِس شعر میں ہے:

نہ پوچھو اقبالؔ کا ٹھکانا، وہی ابھی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سرِ رہگزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہو گا''

حوالہ: شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال کی شاعری کا ابتدائی دَور' مطبوعہ روزنامہ امروز (اقبال نمبر) لاہور بابت ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء (ص ۴)۔ ہمارا ماخذ حنیف شاہد

(۱۹۷۲ء) ہے جس میں یہ مضمون شامل ہے۔

۱۷۔افضل حسین کی روایت ہے۔میرا ماخذ Raheem Bakhsh Shaheen کی *Mementos of Iqbal* ص ۳۵ ہے۔

۱۸۔نظم کی فنی خامیوں کی وجہ سے گیان چند (۱۹۸۸) کا خیال ہے کہ ۱۹۰۵ کی نہیں ہو سکتی۔کئی سال پہلے کی ہونی چاہیے۔لیکن اگر یہ نظم واقعی کہیں شائع نہیں ہوئی تو ممکن ہے ۱۹۰۵ء ہی کی ہو کیونکہ اگر ایسی نظم ابتدائی زمانے میں کہی ہوتی تو اُسے چھپوایا ہوتا مگر اَب ایسی ناپختہ نظم کو شائع کروانا انہیں گوارا نہ ہوا۔

۱۹۔عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)،ص ۱۹ پر سید محمد ذکی کی روایت۔

۲۰۔الطاف علی بریلوی اور ایوب قادری (۱۹۷۰)،ص ۲۵۷-۲۶۱

۲۲۔درانی (۱۹۸۴ء)،ص ۴۴۔ممکن ہے یہ ہنوور ہاؤس انہی یہودی میزبانوں کا گھر رہا ہو جن کا ذکر غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)،ص ۵۹ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت سے اقبال کی زبانی آیا ہے۔

۲۳۔عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸) صفحہ ۴۳۵

۲۴۔یہ نذر محمد وہی ہیں جو دہلی میں اقبال کے میزبان ہوئے تھے (دیکھیے باب ۳)۔ غزل کے بارے میں گیان چند نے لکھا ہے: ''اِس کا بنیادی وزن مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ہے۔اقبال نے عروضی کتابوں میں پڑھ لیا ہو گا کہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن یا مفاعلن یا مفعولن بھی لا سکتے ہیں۔اقبال اِس بات کو لے اُڑے۔اُنھوں نے اپنی عروض دانی دکھانے کے لیے تین نظموں: پیغامِ راز، طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام، کوششِ ناتمام میں کئی مصرعوں میں یہ کرتب دکھایا۔اُس وقت وہ یہ سمجھے کہ عربی عروض کی رُو سے اس کا جواز ہو سکتا ہے لیکن عروض کی غلاتِ غنائی ترنم یا موزونیت اس سے عنقا ہو جاتی ہے۔بعد میں اُنہیں شعور ہوا تو بانگِ درا میں ایسے سب مصرعوں میں اصلاح کر دی یا انہیں یک قلم خارج کر دیا۔'' یہ غزل بہت سی تبدیلیوں کے بعد

ایک نظم کی صورت میں بانگِ درا میں 'پیام' کے نام سے شامل کی گئی۔

۲۵۔Muhammad Siddique (1983)

۲۶۔عبدالمجید سالک (۱۹۵۴)ص ۲۱

۲۷۔برنی (۱۹۹۲)ص ۱۱۹

۲۸۔اس خط کی تاریخ صابر کلوروی نے متعین کی ہے کہ مارچ ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔ مطبوعہ متن میں بعض نقص ہیں۔سودیشی تحریک کو عملی صورت دینے کے لیے جن باتوں کی اقبال نے نشاندہی کی تھی اُس کا شمار الف سے 'ذ' تک کرنے کے بعد اگلے پیراگراف کو نمبر شمار ایک سے شروع کیا گیا ہے۔میرے خیال میں یہ سہو ہے چنانچہ میں نے ان سطور کو نمبر شمار 'ہ' سمجھتے ہوئے پچھلی بات کا حصہ سمجھا ہے۔

۲۹۔اِس غزل کے ۴ اشعار دستیاب ہیں۔زمانہ معلوم نہیں مگر گیان چند نے اسے یورپ میں کہی گئی غزلوں میں قیاس کیا ہے۔

۳۰۔چونکہ یہ خط اپریل ۱۹۰۶ء کے کشمیری میگزین میں شائع ہوا تھا لہٰذا صابر کلوروی نے اپنے ایک مضمون میں اِس کی تاریخ مارچ ۱۹۰۶ء متعین کی ہے۔

۳۱۔غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)،ص ۶۰-۵۹۔پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے۔

۳۲۔غزل کے ۷ اشعار دستیاب ہیں۔ایک شعر، جسے اقبال نے بانگِ درا میں شامل نہیں کیا:

ہے سلطنت جس کی دفن دلّی میں خود وہ کابل میں
سو رہا ہے
جہاں میں سب کچھ ہے اِک علاجِ قضائے چرخِ
کہن نہیں ہے

گیان چند نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ یہ شعر کس کے بارے میں ہے مگر شاید اُن کا دھیان دہلی کی مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کی طرف نہیں گیا جس کا مزار کابل میں

ہے۔ اِس غزل میں اُن اشعار میں سے بھی ایک شامل ہے جو بعد میں اقبال پر کفر کے فتوے کی وجہ بنے تھے:

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں
ہے

۳۳۔شیخ عبدالقادر، دیباچہ بانگِ درا

۳۴۔غزل میں پندرہ اشعار تھے۔

۳۵۔محمد دین فوق کی روایت، عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۱۹۸ میں ہے۔

۳۶۔یہ غزل غیر مطبوعہ ہے۔اس کے صرف یہی چار اشعار دستیاب ہیں۔

۳۸۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۴۱-۳۹ میں عاشق بٹالوی کی روایت ہے کہ انہوں نے اقبال سے سنا۔

۳۹۔ حمید احمد خاں (۱۹۷۴)، ص ۳۴

۴۰۔ دوسری بیاض (نمبر 195) کے آخری صفحے پر تین اشعار کا قطعہ درج ہے۔بیاض ۱۹۱۲ء کے زمانے کی ہے مگر ممکن ہے کہ پہلے کا کہا ہوا قطعہ بعد میں وہاں درج کیا ہو۔ شبہ ہوتا ہے کہ اتنی رواں بحر میں اقبال نے شاید زیادہ شعر کہے ہوں اور بعد صرف یہی یاد رہ گئے ہوں۔

۴۱۔ نذیر نیازی (۱۹۷۱) ص ۲۶۔اقبال نے خود یہ واقعہ ان سے بیان کیا۔

۴۲۔حامد جلالی (۱۹۹۶) ص ۸۳

۴۳۔حامد جلالی (۱۹۹۶) ص ۸۳

۴۴۔گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۰۰

۴۵۔عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) میں خواجہ فیروز الدین کا بیان ہے۔

۴۶۔عبدالرشید طارق نے یہ واقعہ خود اقبال کی زبانی سنا۔ابوالیث صدیقی (۱۹۷۷)،

۴۷۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام مکتوب ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء۔اقبال کے جواب سے غالب یاد آتے ہیں جنھوں نے کسی انگریز کے سامنے اپنے آپ کو آدھا عیسائی اور آدھا مسلمان بتایا تھا: ''شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا!''

۴۸۔ اِس غزل کے ۴ اشعار دستیاب ہیں۔ زمانہ معلوم نہیں مگر خیال ہے کہ لندن میں کہے گئے ہوں گے۔

۴۹۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۶۱-۳۰ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے کہ اقبال سے سنا تھا۔ ۱۹۱۰ میں مولوی صاحب کو دیکھا بھی تھا: ''لمبی ترکی ٹوپی، لمبی سفید ڈاڑھی، سیاہ مارننگ ڈریس، الغرض چھوٹے پیانے پر سرسید معلوم ہوتے تھے۔''

۵۰۔ یہ غزل دسمبر میں غالباً لکھنؤ کے گلدستے نشتر میں شائع ہوئی۔ کل ۷ اشعار تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت ہلکی کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اگر یہ اُسی زمانے میں کہی تو مخزن کی بجائے روایتی قسم کے گلدستے میں بھجوانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخزن کے پڑھنے والوں میں نئے خیالات کو شناخت بنانا چاہتے ہوں گے۔

۵۱۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۶۰ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے کہ اقبال سے سنا تھا۔

۵۲۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص ۱۹۷۔ عبداللہ چغتائی نے اپنی معلومات کا ماخذ نہیں بتایا مگر وہ چونکہ ۱۹۲۰ء کے بعد اقبال سے اس موضوع پر بہت زیادہ گفتگو کیا کرتے تھے چنانچہ ہوسکتا ہے کہ یہ بات بھی خود اقبال سے سنی ہو۔ یہ معلوم نہیں کہ تبصرہ کہاں شائع ہوا۔

۵۳۔ Wolpert, p.4-22

۵۴۔ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ بانگِ درا کی ترتیب سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ۱۹۰۶ء میں کہی گئی ہوگی۔ اِس کے کل ۵ اشعار دستیاب ہیں۔

۵۵۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۴۱

۵۶۔ دیکھیے خرم علی شفیق (۲۰۰۳)

۵۷۔ نظم 'سوامی رام تیرتھ' مخزن جنوری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۷ اشعار تھے۔ یہاں نظم کا آخری شعر درج کیا گیا ہے، جو بانگِ درا میں شامل نہیں ہے۔

۵۸۔ شاید اُنہی دنوں کی ایک غیر مطبوعہ نظم 'قطرۂ اشک' ہے۔ ۱۷ اشعار کی اس نظم میں ۳ بند ہیں اور محبت میں بہنے والے آنسو کی عظمت بیان ہوئی ہے۔ اس آنسو میں محبوب کے حسن کی قوسِ قزح نظر آتی ہے۔ آخر میں اپنے آنسو کو مخاطب کر کے کہا ہے:

وہ دل کہ جس میں جلوے تڑپتے تھے رات دن
ہر تار اب شکستہ ہے اُس دل کے ساز کا
آباد آ کے کر مری چشمِ خیال کو
میں تجھ سے دیکھتا ہوں کسی کے جمال کو

۵۹۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۵۹-۵۸۔ پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے۔

۶۰۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۵۷ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے کہ انہوں نے اقبال سے سنا۔

۶۱۔ Muhammad Siddiq (1983)

۶۲۔ درانی (۱۹۸۴ء)، ص ۱۵۲

۶۳۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۳۶ میں عاشق بٹالوی کی روایت

۶۴۔ مرزا ارشد کی تاریخ وفات کے لیے حوالہ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

۶۵۔ جلسہ مرزا فیاض علی کے مکان پر ہونے والا تھا۔ اقبال ریویو (حیدرآباد دکن)، اپریل تا جون ۱۹۸۴ء۔

۶۶۔ فقیر سید وحید الدین۔ شعر کا زمانہ معلوم نہیں

۶۷۔ یہ وہی نوٹ بک ہے جسے ہم اقبال کی پہلی بیاض کہتے ہیں اور جو اقبال میوزیم میں

نمبر ۲۱۹ کے طور پر محفوظ ہے۔ اِس میں انگریزی کی طرف سے شروع میں کچھ پتے لکھے ہیں۔ اِس کے بعد تین فارسی غزلیں اور ایک اُردو غزل ہے جو قیامِ انگلستان کے زمانے میں براہِ راست درج کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں مگر لگتا ہے کہ بیاض کی باقی نظمیں ہندوستان واپسی کے بعد اُردو کی طرف کے صفحات پر لکھی گئیں۔

۶۸۔ مکتوب بنام گوہر علی خاں، ۲۲ اگست ۱۹۱۰ء

۶۸۔ پوری غزل میں ۱۱۸شعار تھے جن کی ترتیب بانگِ درا سے مختلف تھی۔ یہاں منتخب اشعار پرانی ترتیب کے مطابق پیش کیے گئے ہیں۔ اِس کے شعر ''تمہاری تہذیب...'' کو عام طور پر جنگِ عظیم اول کی پیشین گوئی سمجھا جاتا ہے جو اِس نظم کے سات سال بعد شروع ہوئی۔ اگر شعر کہتے ہوئے اِس قسم کا کوئی خیال اقبال کے ذہن میں تھا تو اِس میں حیرت نہ ہونی چاہیے کیونکہ اُن دنوں یورپ میں عام طور پر اِس قسم کی جنگ کا خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا۔ شیخ عبدالقادر کا یہ کہنا درست نہیں کہ اُس وقت ''وہاں کے اچھے اچھے سوچنے والوں کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ جنگِ عظیم جیسی تباہ کن لڑائی قریب ہے۔'' (شیخ عبدالقادر کا مضمون 'چند پیش گوئیاں' مطبوعہ روزنامہ امروز ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ ص ۱۳ جس کے لیے میرا ماخذ حنیف شاہد (۱۹۷۲)، ص ۹۹-۹۵ ہے)۔

باب ۵: پری جمالوں کا شہر

مارچ سے جولائی ۱۹۰۷ء تک

ا۔ اس کتاب میں اقبال کے بارے میں عطیہ فیضی کے تمام بیانات عطیہ فیضی کی دو تحریروں سے لیے گئے ہیں۔ پہلی ان کی مشہور کتاب *Iqbal* ہے جو ۱۹۴۶ میں شائع ہوئی۔ اس کے اردو ترجمے میں عطیہ فیضی کی ڈائری سے انتخاب بھی شامل ہے۔ دوسری تحریر عطیہ فیضی کا مضمون ہے جو اخبار *Dawn* میں ان کی وفات کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۶۷ کو شائع ہوا۔ عطیہ نے اپنی ڈائری میں یہ بھی لکھا کہ اقبال نے پہلی

ملاقات میں کہا کہ وہ ایران میں رہ چکے ہیں۔ اقبال کی زندگی کے بارے میں جہاں تک معلوم ہے وہ کبھی ایران نہیں گئے تھے اور نہ ہی وہاں جاکر کچھ عرصہ رہنے کی بات کسی طرح درست تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اگر عطیہ کو ان کی بات سمجھنے میں غلطی نہیں ہوئی تو پھر اقبال انہیں متاثر کرنے کی کوشش میں کچھ زیبِ داستاں کے لیے بڑھا بھی رہے ہوں گے۔

عطیہ فیضی کا اخبار *Dawn* والا مضمون کسی مجموعے میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے نایاب ہے۔ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

Iqbal: A Reflection

By Atiya Faiyzee

Dawn, 21 April 1967

1907 London: Miss Beck Secretary of the National Indian Association called on me and said: "I want you to come to this reception and meet Prof Iqbal – he is wonderful." I said: "In what way is he wonderful?" She said: "O' he is so clever and Prof Brown praises him as very clever."

I had heard of Iqbal and he wrote a short note from Cambridge to me saying: "My dear Miss Fayzee – I am coming to London and looking forward to meeting you – Yrs. Sin. Iqbal. P.S. My address in London is Hammersmith."

At the reception at Miss Beck – the hostess ran up

to me followed by a serious looking man with deep set eyes – "Prof Iqbal this is Miss Fayzee" and took us to a seat where we sat and chatted freely – my first impression of "Iqbal" was that he was a "complex," a mixture of good and evil – extremely self-contained and fond of his own opinion – a bad sign, I said to myself! This was the result of his study at the universities and topping the list in everything and so easily that he gained a reputation of being a great scholar – and so he was.

Assertive

We met frequently – in Prof Arnold's study. Prof Arnold was so unassuming and selfless. On the other hand Iqbal was quietly assertive and certainly thought himself superior – at least the day Prof Arnold said: "I can teach you no longer. You will have to go to Heidelberg and take your Ph.D. there."

Iqbal turned around and said: "You will come with me I'll book you seat." I replied: "I have already planned to go to Heidelberg to meet the famous quartet who perform daily on the slopes of the flowered besprinkled hills and then proceed to

Munich to visit the immortal plateau of the 'Passion Play.'"

He was chagrined at classical music - and Classical Fine Arts was a sealed book to him but being rather fond of himself he never could acknowledge defeat in any sphere of life.

Ego

'Ego' was predominant in him and that was a failing he could have overcome had he stayed over in Europe and just visited India to go back -
particularly in Germany.

Germans are profound, sincere, learned, greatest musicians the world has produced. Iqbal looked upon women as 'inferior' but indispensable. This belief was knocked off and he received the shock of his life when he discovered that young, beautiful ladies were Professors in the universities and he was actually in the position of an inferior student to be coached and instructed by 'females' younger than himself!

He was much fond of himself as a man primarily - and a great scholar after. There was no getting out of it - so he plunged in the studies so deeply that he

astounded all by taking his Ph.D. in three months and in the German language – thanks were due to the clever young women teachers who helped Iqbal in every possible way – as they hardly came across such a brilliant mind.

Iqbal accompanied us to Munechen and then to the Bavarian Alps. The whole process of seating and listening to the deep music performed by hundreds of the villagers – the tragedy of the Holy Christ presented right before your eyes – the black minds – was enough to kill a novice by the physical tortures one was compelled to suffer.

Iqbal was not learned in music, but gradually the Music Sacred and stirring – looked its way – we returned exhausted mentally and physically. The next day again we started early and were at the most uncomfortable platform on earth to listen to Heavenly Music.

Iqbal was silent all throughout and wanted to know what prompted the villagers to suffer such physical tortures. When he heard the story of the tiny village he remarked sarcastically: "Religion has always been

the source of the bitterest bloodshed. It is hypocrisy and intolerance. God never came down to relieve the Crucified but the Dare Devil does!"

۲۔ یہ غزل پہلی بیاض میں موجود ہے۔ شعر 'محفلِ ہستی میں...' پر گیان چند نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ بانگِ درا میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اقبال نے اس میں مالی آسودگی کی خواہش کا اعتراف کیا تھا۔ میرے خیال میں اس شعر میں دنیا سے غربت کے ختم ہونے کی تمنا کا ذکر ہے جو علم الاقتصاد کے دیباچے میں بھی ظاہر کی گئی تھی۔

۳۔ ایس ایم اکرام (۱۹۹۴)، ص ۳۰۳ سے ۳۰۶ تک۔ وہاں شبلی نعمانی کا اپنا بیان نقل کیا گیا ہے۔

۴۔ میں نے اس غزل کے زمانے کا تعین اِس طرح کیا ہے کہ اقبال کی پہلی بیاض جو اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے، جو بظاہر اُنہوں نے یورپ سے واپس آ کر اپنی قیامِ یورپ کے دوران کی نظمیں جمع کرنے سے شروع کی تھی، اُس میں تین غزلیں ایک ساتھ درج ہیں۔ ایک یہی غزل ہے۔ ایک اور غزل وہ ہے جو اقبال نے ۲۴ اپریل کو عطیہ فیضی کو ایک خط کے ساتھ بھیجی (تفصیل اگلے نوٹ میں دیکھیے)۔ ان دونوں غزلوں میں بعض تراکیب اور تاثرات یکساں ہیں جن کی وجہ سے یہ گمان اور مضبوط ہوتا ہے کہ یہ اکٹھی لکھی گئی ہوں گی۔

۵۔ عطیہ فیضی (۱۹۴۶) ص ۲۰۔ اِس میں عروض کا وہی تجربہ کیا گیا تھا جو اس سے پہلے 'پیغامِ راز' میں کیا تھا۔ عروضی تجربے کی نشاندہی گیان چند (۱۹۸۸) ص ۳۱۵ پر جگن ناتھ آزاد کے حوالے سے کی گئی ہے۔ اس غزل میں اقبال کی آئندہ فارسی غزلوں کے بہت سے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں، خاص طور پر خدا سے بے تکلفی کا وہ انداز جو آگے چل کر اُن کی فارسی شاعری میں زیادہ نمایاں ہوا (اور اُردو شاعری میں قدرے احتیاط

کے ساتھ نظر آتا ہے)، وہ یہاں شروع ہی سے موجود ہے۔ غالباً اُنہی دنوں کا ایک قطعہ متروکات میں شامل ہے جس کا پہلا مصرع ہے: ''صحنِ گلشن سے ہوں گو میں آشیاں برباد دُور'' اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی فارسی شعر کی تضمین کی گئی ہے (دیکھیے گیان چند، ص ۳۰۳)

۶۔ نظم میں ۱۲ اشعار تھے۔ مخزن، جون ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔

۷۔ حنیف شاہد (۱۹۷۲)، ص ۱۱-۱۰

۸۔ نذیر نیازی (۱۹۷۱) ص ۶۷-۶۶

۹۔ سعید اختر درّانی

۱۰۔ سعید اختر درانی (۱۹۸۵) ص ۱۶۱

۱۱۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۶۵۔ معلوم نہیں کہ واقعہ کب ہوا مگر اعجاز نے اسے اپنے لڑکپن کے زمانے سے منسوب کیا ہے۔

۱۲۔ عطیہ فیضی (۱۹۴۶) ص ۳۱، ۱۰۴ اور مضمون (۱۹۶۷)۔ اس بارے میں خود عطیہ نے بظاہر متضاد روایات پیش کی ہیں۔ ان کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اور پروفیسر آرنلڈ نے انہیں جرمنی جانے کے لیے قائل کیا مگر ان کا مضمون جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا ایک ڈرامائی منظر پیش کرتا ہے: ''ہم پروفیسر آرنلڈ کی مطالعہ گاہ میں اکثر ملا کرتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ اس قدر منکسر اور بے غرض آدمی تھے۔ اس کے برعکس اقبال چپکے سے اپنی رائے دوسرے پر مسلط کرنے کے عادی تھے اور یقیناً اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ کم از کم اس روز جب پروفیسر آرنلڈ نے کہا۔ 'میں اب تمہیں مزید نہیں پڑھا سکتا۔ تمہیں ہائیڈل برگ جانا ہوگا اور وہاں سے پی ایچ ڈی حاصل کرنی ہو گی۔' اقبال مڑے اور مجھ سے کہا۔ 'آپ بھی میرے ساتھ آئیں گی۔ میں آپ کو سیٹ بُک کروا دوں گا۔' میں نے جواب دیا۔ 'میں نے پہلے ہی ہائیڈل برگ جانے کا ارادہ کیا ہوا ہے تاکہ اس مشہور گروپ سے ملاقات کرسکوں جو ہر روز پھولوں

سے لدی ہوئی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے بعد میں لافانی پیشن پلے (حضرت عیسیٰ کی زندگی پر مبنی ڈرامہ) دیکھنے میونخ جاؤں گی۔'' یہ بیان کم از کم اس لحاظ سے سہوِ نظر ضرور ہے کہ پروفیسر آرنلڈ لندن میں اقبال کو باقاعدہ تعلیم نہیں دے رہے تھے جس کا تاثر اس مکالمے سے ملتا ہے۔ ہائیڈل برگ جانے اور میونخ سے پی ایچ ڈی حاصل کرنے کا مشورہ یوں اچانک آرنلڈ نے نہیں دیا ہوگا بلکہ کیمبرج میں اقبال کی اپنے اساتذہ سے شروع ہی میں بات ہوئی ہوگی۔ بہر حال یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مضمون شاید ساٹھ سال بعد لکھا گیا تھا جب عطیہ ضعیف اور قریب المرگ تھیں۔ اگر ان سے حافظے کی غلطی ہوئی تو انہیں قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

۱۳۔ پولیٹکل اکانومی سے مراد اقبال کی پہلی تصنیف علم الاقتصاد تھی۔ فلسفۂ عجم والے مقالے کا جرمن ترجمہ ممکن ہے اُس وقت کروانے کا ارادہ ہو مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی عطیہ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ بہر حال میونخ یونیورسٹی نے اقبال کے مقالے کو انگریزی زبان ہی میں قبول کیا اور ترجمے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف زبانی امتحان جرمن میں ہوا۔

۱۴۔ یہاں نظم کا اولیں نقش استعمال کیا گیا ہے جو اقبال کی بیاض (علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977) میں ہے۔ وہاں ''دورۂ عصر'' والا شعر لکھ کر کاٹ دیا گیا ہے۔ اس شعر کا ذہنی پس منظر اقبال کے اِس فارسی شعر سے پیوستہ نظر آتا ہے:

طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

متروک اُردو شعر میں ''دورۂ عصر'' سے فارسی شعر والا ''حیرت خانۂ امروز و فردا'' ہی مراد ہے۔ فارسی میں اس کے خلاف خدا سے شکایت کر رہے ہیں، اُردو میں اسے مٹا کر ایک خیالی دنیا بنائی جا رہی ہے۔ (نوٹ: فارسی شعر پیامِ مشرق کی ''آشناہر خار را'' والی غزل میں ہے جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ اسی زمانے میں

لکھی گئی تھی)۔

باب ۶: نامعلوم دنیا

جولائی ۱۹۰۷ء سے جولائی ۱۹۰۸ء تک

۱۔میں نے ایما کے بارے میں معلومات عام طور پر سعید اختر درانی (۱۹۹۵) سے لی ہیں۔

۲۔سعید اختر درانی (۱۹۸۴ء)ص ۳۹، ۹۴

۳۔عطیہ فیضی (۱۹۴۶)

۴۔ان مخطوطوں کا ذکر مطبوعہ مقالے میں کتابیات کی فہرست میں کیا ہے اور مقام ''برلن اسٹیٹ لائبریری'' بتایا ہے۔اس کے علاوہ اُن کے برلن جانے کا اور کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔

۵۔کل گیارہ اشعار کی نظم تھی اور اس میں ۲ بند تھے۔ ہر بند کا آخری شعر فارسی میں تھا۔بیاض میں اقبال نے اِس پر مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۷ء درج کیا ہے۔

۶۔اقبال اور ایما کی داستان کے نقوش اس طرح مٹ چکے ہیں کہ اس کی تفصیلات کو اکٹھا کرنا اب ممکن نہیں رہا۔مگر بانگِ درا جسے اقبال نے کئی سال بعد مرتب کیا اُس کے دُوسرے حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس زمانے کے حوالے سے کم از کم تین جذباتی مرحلوں کا پتہ ملتا ہے: (۱) عشق میں خود کو محبوب کے سپرد کرنے کا زمانہ (حسن وعشق،...کی گود میں بلّی دیکھ کر، کلی، چاند اور تارے، وصال، سلیمیٰ)، (۲) کسی سے اپنی بےوفائی کا اعتراف (عاشقِ ہرجائی)، اور (۳) ہجر اور جدائی کا زمانہ (کوششِ ناتمام، نوائے غم، عشرتِ امروز، انسان، جلوۂ حسن، ایک شام، تنہائی، پیامِ عشق، فراق، عبدالقادر کے نام، صقلیہ)۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گیان چند نے ان میں سے تین نظموں کو بعد کے دَور کی نظمیں ثابت کیا ہے لیکن اگر یہ واقعی بعد کے دور کی نظمیں تھیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ انہیں بانگِ درا میں اس مقام پر شامل کرنے سے

اقبال کا مقصد ایک ذہنی سفر کے مراحل کی نشاندہی کرنا رہا ہو؟

۷۔پہلی بیاض (اقبال میوزیم نمبر 219) میں یہ نظم موجود ہے۔

۸۔ بیاض میں اسے یورپ کی نظموں کے ساتھ درج کیا ہے مگر زمانے کا تعین مشکل ہے۔بعد میں کاٹ کر دوبارہ لکھا گیا ہے:

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا تُو نے اُٹھا لیا
اُتار کر ابھی رکھا تھا میز پر ہم نے
نظر بچا کے ہماری چھپا لیا تُو نے
شریر سا جو تبسم ہے تیری آنکھوں میں

۹۔ پہلی بیاض (اقبال میوزیم نمبر 219) میں یہ نظم موجود ہے۔

۱۰۔ پہلی بیاض (علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977) میں یہ نظم یورپ میں لکھی گئی نظموں کے ساتھ لکھ کر کاٹی گئی ہے۔

۱۱۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)،ص ۶۱ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے کہ انہوں نے اقبال سے سنا۔

۱۲۔نظم میں ۱۹ اشعار تھے۔

۱۳۔بانگِ درا میں 'کوششِ ناتمام' کے نام سے شامل ہے۔اصل نظم میں دو بند تھے اور کل ۱۲ اشعار۔دو اشعار میں عروض کا وہی تجربہ کیا تھا جو اس سے پہلے 'پیام' اور 'طلبہ علی گڑھ کے نام' میں کر چکے تھے۔وہ دونوں اشعار اور ان کے علاوہ تین کمزور شعر بانگِ درا میں شامل نہیں کیے گئے۔

۱۴۔ اردو شاعری میں خضر کی طرف عام رویہ وہی تھا جو غالبؔ کے اس شعر میں نظر آتا ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ایک اور جگہ اس طرح طنز کیا تھا:

بے صُرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عُمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیے

اقبال نے اس سے پہلے جہاں خضر کا تذکرہ کیا تھا وہاں اپنائیت یا پسندیدگی کا کوئی پہلو نہیں تھا، مثلاً:

خضر سے چھپ کے مر رہا ہُوں میں
تشنہ کامِ مے فنا ہُوں میں

۱۹۰۲ء

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

۱۹۰۵ء

۱۵۔ بانگِ درا میں نظم کا آخری مصرع یوں درج ہے: ''آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اُس کا،'' چنانچہ اکبر حیدری کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ پہلے ''اے سلیمیٰ'' کی جگہ عطیہ کا نام رہا ہوگا (گیان چند ۱۹۸۷ء میں اس کا ذکر ہے)۔ یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ اقبال کی بیاض (علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977) میں اِس مصرعے کی اولین صورت وہی ہے جو میں نے یہاں درج کی ہے اور پھر اسے کاٹ کر ''آنکھوں میں اے حسینہ تیری کمال اُس کا'' بنایا گیا ہے۔

۱۶۔ اقبال کی سب سے پرانی بیاض (علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977) میں اس نظم پر ہائیڈل برگ، ستمبر ۱۹۰۷ء کی تاریخ درج ہے۔ بیاض بعد کے زمانے کی ہے اور یہ نظم بھی شاید حافظے کی مدد سے اور غالباً عجلت میں وہاں لکھی گئی ہے کیونکہ تحریر میں کچھ غلطیاں محسوس ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ نظم یہاں بانگِ درا والی صورت میں

درج کی ہے۔

۱۷۔ یہاں نظم کا متن اقبال کی بیاض (علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977) سے لیا گیا ہے۔ اُس میں عنوان درج نہیں مگر ہائیڈل برگ، ستمبر ۱۹۰۷ء کی تاریخ درج ہے۔ اکبر حیدری (۲۰۰۱) کے مطابق یہ نظم پہلی بار ۱۹۲۲ء میں رسالہ ہمایوں میں شائع ہوئی جہاں اس کا نام خاموشی تھا اور وضاحت کی گئی تھی کہ اقبال نے یہ نظم دریائے نیکر کے کنارے چاندنی رات میں کہی تھی۔ بانگِ درا میں اس کا نام تبدیل ہوا: 'ایک شام ،دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے' اور بعض اصلاحات ہوئیں۔

۱۸۔ بانگِ درا میں شامل 'قطعہ' اسی کے جواب میں معلوم ہوتا ہے:

کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبی میں رو رو کے کہہ رہا تھا

تفصیل ۱۹۱۱ کے واقعات میں دیکھیے۔

۱۹۔ ایما ویگے ناست کے نام اقبال کے خطوط ۱۹۸۴ میں پاکستانی سائنسدان سعید اختر درانی کی اقبالیات میں دلچسپی کے ذریعے سامنے آئے۔ یہ ان کی کتاب اقبال یورپ میں (۱۹۸۵) میں شامل ہیں۔ ان سے پہلے ۱۹۵۹ء میں پاک جرمن فورم کے صدر ممتاز حسن اور معتمد امان اللہ ہوبوہم نے جرمنی میں موجود ایسے لوگوں کو تلاش کرنا شروع کیا جو اقبال سے مل چکے ہوں۔ عطیہ فیضی کی کتاب اقبال کی وجہ سے ان کی توجہ ایما ویگے ناست کی طرف گئی۔ ہوبوہم کا بیان ہے کہ وہ اور ممتاز حسن ایما سے ملاقات نہ کر سکے مگر ممتاز حسن کی ایما سے خط و کتابت ہوئی جس کے نتیجے میں ایما نے اپنے نام اقبال کے خطوط پاک جرمن فورم کے حوالے کر دیے اور درخواست کی کہ انہیں آرکائیوز میں رکھوا دیا جائے تا کہ اقبال پر تحقیق کرنے والے ان سے استفادہ کر سکیں۔ افسوس ہے کہ اُن کی یہ خواہش پوری نہ کی گئی۔ ۱۹۸۲ میں ہوبوہم نے ان خطوط کی نقل سعید اختر درانی کو فراہم کی مگر کہا کہ وہ خود اسے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سعید اختر درانی کے توسط سے پہلے ان خطوط کا ترجمہ کراچی کے ادبی ماہنامے

افکار میں شائع ہوا۔سعید اختر درانی کو خطوط کے اصل متن شائع کرنے میں تامل تھا کہ کہیں ہو بوہم صاحب کی دل شکنی نہ ہو مگر اس دوران ایما کی بھتیجی پروفیسر کرشہوف نے بتایا کہ ایما نے اصل خطوط کئی نادر تصویروں سمیت اُن کے سامنے دو افراد کے حوالے کیے تھے جو کسی ادارے کی نمائندگی کر رہے تھے۔ پروفیسر کرشہوف کو افسوس تھا کہ ایما کی اس خواہش کا احترام نہیں کیا گیا کہ یہ چیزیں اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دستیاب کی جائیں۔ جب اُنہیں سعید اختر درانی نے بتایا کہ کم سے کم خطوط کی نقل وہ ہو بوہم سے حاصل کر چکے ہیں تو پروفیسر کرشہوف نے خواہش ظاہر کی کہ ان کے متن بھی شائع ہونے چاہییں۔ سہیل عمر نے بھی، جو اُس وقت اقبال اکادمی کے نائب ناظم تھے، سعید اختر درانی کو یہی مشورہ دیا۔ یوں اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والے پہلی دفعہ ان خطوط کے مجموعے سے فیضیاب ہو سکے۔ اقبال یورپ میں کے پہلے اڈیشن کے بعد کسی وقت ہو بوہم نے سعید اختر درانی کو خطوط کے اصل عکس شائع کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ یہ دوسرے اڈیشن میں شامل ہوئے۔

۲۰۔ پہلی بیاض (اقبال میوزیم نمبر 219 .1977) میں یہ نظم موجود ہے۔

۲۱۔ پہلی بیاض (اقبال میوزیم نمبر 219 .1977) میں یہ نظم موجود ہے۔

۲۲۔ محمد حنیف شاہد (جون ۱۹۷۷)، ص ۱۰۔ اُن کا ماخذ ہے محمد انور امین کی تالیف کی ہوئی قیامِ پنجاب مسلم لیگ ' (۱۹۶۹) مطبوعہ نعمت پبلی کیشنز۔ لاہور۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) میں مرزا جلال الدین کی روایت ہے کہ فنانشل سیکرٹری محمد شریف تھے جو آنکھوں کے ڈاکٹر تھے۔

۲۳۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۴۳-۴۷

۲۴۔ پیر حیدر شاہ کی وفات ۶ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ کو ہوئی تھی۔ قطعہ چونکہ گیان چند (۱۹۸۷) میں بھی شامل نہیں ہے لہٰذا یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ہر کہ بر خاکِ مزارِ پیر حیدر شاہ رفت

تربتِ اُو را زمینِ جلوہ ہائے طُور گفت
ہاتف از گردُوں رسیدہ خاکِ اُو را بوسہ داد
گفتمش سالِ وفاتِ اُو، بگو ''مغفور گفت''

۲۵۔ کراچی کے اجلاس کا حال الطاف علی بریلوی و ایوب قادری (۱۹۷۰) اور عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۱۳۳-۱۳۲ سے ماخوذ ہے۔

۲۶۔ meliorism کی اصطلاح کا اولین استعمال انگریز ناول نگار خاتون جارج ایلٹ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اقبال نے اپریل ۱۹۰۹ء کے لیکچر میں بھی یہ اصطلاح استعمال کی اور ۱۹۲۹ء میں اپنے مشہور خطباتِ مدراس میں بھی۔

۲۷۔ اس خط کی تاریخ مشکوک ہے کیونکہ ۲۱ جنوری کی تاریخ کا ایک اور خط موجود ہے جس کے مضمون سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں خطوط کے درمیان کچھ عرصہ گزرا ہوگا۔

۲۸۔ خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ اقبال نے لندن میں چھ (۶) لیکچر اسلام پر دیے تھے۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۲۲

۲۹۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۵۹ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے کہ انہوں نے اقبال سے سنا۔

۳۰۔ 'Political Thought in Islam' یہ لیکچر Sherwani (1944/95) میں شامل ہے۔

۳۱۔ حسن اختر (۱۹۸۸ء) ص ۲۷، بحوالہ پنجاب گزٹ ۳۱ جنوری ۱۹۰۸ء

۳۲۔ حسن اختر (۱۹۸۸ء) ص ۷۶۔ اقبال کے استعفیٰ کا عکس موجود ہے۔

۳۳۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء)، ص ۴۱۳۔ کتاب پر تاریخِ کتابت ۲۸ مارچ ۱۹۰۸ء درج کی ہے۔

۳۴۔ Muhammad Siddique (1983)

۳۵۔ عبدالمجید سالک (۱۹۵۵)، ص ۵۷

۳۶۔ ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷) ص ۶۳ میں محمد حسین عرشی کی روایت۔

۳۷۔ یہ غزل کی طرز پر تھی جس میں ۸ اشعار تھے۔ *مخزن* میں اکتوبر ۱۹۰۸ء میں چھپی جب اقبال ہندوستان واپس پہنچ چکے تھے مگر ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لکھی گئی ہو گی۔ فروری ۱۹۰۶ء کی نظم 'پیغامِ راز' سے اس کا موازنہ کرنا چاہیے۔ دونوں قریب کی بحروں میں لکھی گئی ہیں اور پہلی نظم کا باعث یہ واقعہ ہوا تھا کہ کسی دوست کو عشق میں ناکامی ہوئی۔ دوسری نظم کے وقت اقبال خود ناکامی سے گزر رہے تھے۔ دونوں نظموں میں بعض ترکیبیں اور استعارے مشترک ہیں مگر اُن کے معانی میں کچھ فرق آیا ہے۔ واضح رہے کہ لفظ 'ملت' کو وہ جدید عربی معانی میں استعمال کرتے تھے جہاں یہ نیشن یعنی قوم کا مترادف تھی خواہ اُس قوم کا مذہب کچھ بھی ہو۔ اس کی وضاحت انہوں نے وفات سے پہلے اپنے آخری مضمون میں کی۔

۳۸۔ محمد رفیق افضل (۱۹۶۹) گفتارِ اقبال، ص ۲۵۰-۲۴۹

۳۹۔ *مخزن*، دسمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی مگر اقبال نے اس سے پہلے لکھی تھی اور بذریعہ خط عبدالقادر کو بھیجی تھی۔ اس میں ۱۶ اشعار تھے۔

۴۰۔ حسن اختر (۱۹۸۸ء) ص ۳۷ بحوالہ پنجاب گزٹ حصہ سوم ۲۹ اپریل ۱۹۱۰ء

۴۱۔ جون کو ایما کے نام خط میں انہوں نے ۳ جولائی کو روانگی کا ارادہ ظاہر کیا ہے مگر بعض دوسرے شواہد کی بنیاد پر سعید اختر درّانی (۱۹۸۵) نے روانگی کی تاریخ ۸ یا ۹ جولائی متعین کی ہے۔

۴۲۔ یہ نظم *مخزن* میں اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی مگر اس سے پہلے کی بھی ہو سکتی ہے۔ پہلی بیاض (علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977) میں قیامِ یورپ کی نظموں کے آس پاس درج ہے۔

باب ۷: صقلیہ

۱۔ ایما کے نام مکتوب ۲۷ جون ۱۹۰۸ء

۲۔ مخزن میں اس کے ساتھ عبدالقادر کا نوٹ شائع ہوا: ''ہمارے دوست فرماتے ہیں کہ وہ رات کے وقت جہاز میں اس جزیرہ کے پاس سے گزرے اور اس کی روشنیوں کو دیکھ کر بعض خیالات اور جذبات نے یکا یک ان کی طبیعت پر ہجوم کیا۔ یہ نالۂ موزوں ان ہی خیالات اور جذبات کا نتیجہ ہے۔''

۳۔ Jahan Ara Shahnawaz (1971), p. 29

باب ۸: شیطان کی خدائی

جولائی ۱۹۰۸ء سے مارچ ۱۹۱۱ء تک

۱۔ یہ نظم منشی غلام علی خان صاحب غلامی کی تھی۔ محمد الدین فوق نے کشمیری میگزین اگست ۱۹۰۸ء میں پوری نظم شائع کی جس میں نو اشعار تھے۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء) میں شامل ہے۔

۲۔ گفتارِ اقبال، ص ۲۴۹ الخ

۳۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۵۹ پر روایت محمد دین فوق۔ نیز عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۷۰ پر روایت پروفیسر محمد دین بھٹی۔

۴۔ سالک (۱۹۵۵)، ص ۶۳ اور جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۷۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲)، ص ۲۴۵ پر موہن روڈ والے دفتر کو کوٹھی لکھا ہے۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص ۴۰ پر لکھا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس مکان میں بٹ اسٹیشنری مارٹ کے نام سے اسٹیشنری کی دکان قائم ہوئی۔ موہن لال روڈ کو اب اردو بازار کہتے ہیں۔

۵۔ مکتوب بنام گوہر علی خان، ۲۲ اگست ۱۹۱۰ء

۶۔ کشمیری میگزین ماہ اگست ۱۹۰۸ء کے متعلقہ اندراجات رحیم بخش شاہین

(۱۹۷۵ء) میں شامل ہیں۔

۷۔عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) ص ۴۳

۸۔مکتوب بنام شاطر مدراسی۔۲۹ اگست ۱۹۰۸ء

۹۔دیباچہ بانگِ درا

۱۰۔صابر کلوروی (۲۰۰۴ء)۔اُن کا ماخذ بیاضِ اعجاز ہے۔پوری غزل میں تیرہ اشعار ہیں۔

۱۱۔مکتوب بنام ایما ۳ ستمبر ۱۹۰۸ء

۱۲۔مکتوب بنام حسن نظامی، ۱۲اکتوبر ۱۹۰۸ء

۱۳۔اعجاز احمد (۱۹۸۵) ص ۳۰

۱۴۔حسن اختر (۱۹۸۸ء) بحوالہ پنجاب گزٹ حصہ سوم ۶ نومبر ۱۹۰۸ء

۱۵۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۱۳۵ پر فوق کا بیان ہے۔

۱۶۔ Jahan Ara Shahnawaz (1971), p. 20-1

۱۷۔خواجہ کریم بخش کے بیٹے خواجہ عبدالوحید کی روایت۔میرا ماخذ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) ہے۔ للّی لاج تین بھائیوں، خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش کی ملکیت تھی۔نیز دیکھیے باب ۱۔

۱۸۔ایما کے نام مکتوب ۱۱جنوری ۱۹۰۹ء

۱۹۔ Jahan Ara Shahnawaz (1971), p.31

۲۰۔مکتوب بنام عطیہ فیضی

۲۱۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۲)

۲۲۔مکتوب بنام عطیہ فیضی

۲۳۔سالک (۱۹۵۵) ص ۶۴۔جاوید اقبال (۱۹۸۱) ص ۸-۷

۲۴۔رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) ص ۳۷۸-۳۷۷ میں ڈاکٹر شجاع ناموس کا بیان۔وہ

اقبال سے پہلی دفعہ ۱۹۱۶ء میں ملے مگر انارکلی بازار میں طوائفیں پہلے بھی رہا کرتی تھیں۔ کچھ برس بعد میونسپلٹی نے اُنہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

۲۵۔ ان میں سے بیشتر تفصیلات عطیہ فیضی کے نام مکتوب ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء سے ماخوذ ہیں اور کچھ اعجاز احمد (۱۹۸۵) سے لی گئی ہیں۔ معلوم نہیں اقبال نے نور محمد کو خط کب لکھا مگر ۱۹ اپریل سے پہلے ہی لکھا ہوگا کیونکہ عطیہ سے خط میں ذکر کیا ہے۔

۲۶۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۸-۱۰۷

۲۷۔ جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۱۴۱

۲۸۔ کلیات مکاتیب ص ۱۸۳

۲۹۔ علامہ اقبال میوزیم نمبر 219-1977۔ اس نوٹ بک کی تفصیل کے لیے دیکھیے، ضمیمہ

۳۰۔ کلیات مکاتیب، حاشیہ ص ۱۸۳

۳۱۔ Muhammad Siddiq (1983)۔ کتاب پر شیخ غلام محمد کے دستخط موجود ہیں۔

۳۲۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)

۳۳۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۲۹۱ پر خواجہ عبدالوحید کی روایت۔

۳۴۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید (۱۹۸۶)، ص ۵-۱۷۴

۳۵۔ مکتوب بنام شیخ عبدالعزیز ۲۷ جنوری ۱۹۰۹ء۔ خط انگریزی میں ہے اور منشی کا نام درج نہیں ہے مگر ہوسکتا ہے کہ یہ کاہن چند ہو جس کے بارے میں علی بخش کا بیان ہے کہ وہ منشیانے کے لیے جھگڑتا رہتا تھا اور سال ڈیڑھ سال بعد اُسے فارغ کردیا گیا۔ اگر علی بخش کو "سال ڈیڑھ سال" کا عرصہ بتانے میں غلطی لگی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اسی واقعے کے بعد اقبال نے اُسے نوکری سے نکالا ہو۔

۳۶۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)۔ علی بخش کا بیان ہے۔

۳۷۔ رزاقی (۱۹۷۰)

۳۸۔

۳۹۔

۴۰۔مکتوب بنام شیخ عطا اللہ، ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء

۴۱۔ نظم 'بزمِ انجم' کے تین بند بیاض میں درج ہیں۔ میں نے صرف تیسرا بند لیا ہے۔ یہ نقشِ اوّل ہے۔بانگِ درا میں اشاعت کے وقت اس کی اصلاح کرکے بندش زیادہ چُست بنادی گئی۔

۴۲۔سالک (۱۹۵۵) ص ۴-۹۳ میں غلام قادر فرخ کی کتاب سفینۂ حیات سے اقتباس۔

۴۳۔ابوالليث صدیقی (۱۹۷۷)، ص ۸۸-۸۷

۴۴۔بلادِ اسلامیہ کے اشعار کی تعداد

۴۵۔مکتوب بنام عطیہ فیضی

۴۶۔جسٹس شاہ دین ہمایوں کے بیٹے میاں بشیر احمد کی روایت جو ابوالليث صدیقی (۱۹۷۷ء)، ص ۴۵۔غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۲۳ پر خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال سے یہ روایت بھی کی ہے کہ اقبال اس نتیجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ ''ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو کچھ ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنا پڑتی ہیں۔''

۴۷۔حنیف شاہد (جون ۱۹۷۷)، ص ۱۱۔اُن کا ماخذ ہے پیسہ اخبار ۷ اپریل ۱۹۰۹ء

۴۸۔محمد دین فوق نے مشاہیرِ کشمیر کے ۱۹۳۲ کے اڈیشن میں اقبال کے حالاتِ زندگی میں یہ واقعہ لکھا۔ یہ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۸۹ میں درج ہے۔ واقعے کا زمانہ معلوم نہیں مگر فوق نے وضاحت کی ہے کہ یہ اقبال کے یورپ سے واپسی کے بعد کا واقعہ جب وہ کشمیری کانفرنس کے سیکرٹری تھے۔ ۱۹۴۱ء میں فوق نے اپنی

کتاب استادوں اور شاگردوں کے لطیفے میں یہی واقعہ مختصر بیان کر کے لکھا کہ اُس وقت اقبال کی عمر غالباً ۲۱ یا ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی (عبداللہ قریشی، ۱۹۸۸ص ۱۹۹)۔ فوق ۱۸۷۵ء کو اقبال کا سالِ پیدائش مانتے تھے مگر ۱۸۹۵ یا ۱۸۹۶ کے لگ بھگ اقبال کشمیر کانفرنس کے سیکرٹری نہ تھے۔ اگر واقعہ درست ہے تو پھر دوسرے بیان میں فوق کی یادداشت بھکی ہے۔

اپریل ۱۹۰۹ء میں اقبال نے جو لیکچر Islam As a Moral And Political Ideal انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پیش کیا اُس میں اسی قسم کی کچھ اور باتیں دکھائی دیتی ہیں جن کی مثال اقبال کے یہاں کسی اور زمانے میں موجود نہیں، مثلاً طاقتور شخص کمزور سے اس لیے بہتر ہے کیونکہ بوقتِ ضرورت وہ ڈاکہ ڈال کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، شیطان اس لیے تعریف کے لائق ہے کیونکہ اُس نے آدم کو سجدے سے انکار کر کے خودداری کا ثبوت دیا اور برطانوی سلطنت اپنی سیاسی روح کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے۔ یہ واقعہ اُسی زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔

۴۹۔ یہ لیکچر "Islam As a Moral And Political Ideal" Sherwani (1944/1995) میں شامل ہے۔

۵۰۔ عطیہ فیضی سے اقبال کی خط و کتابت ہمیشہ انگریزی میں ہوئی۔ میں نے ترجمہ شامل کیا ہے۔

۵۱۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص ۷۹-۸۰۔ انہوں نے جلسے کی تاریخ ۱۱ اپریل لکھی ہے جو درست نہیں۔

۵۲۔ مکتوب بنام عطیہ فیضی

۵۳۔ اقبال کی ملازمت اور وکالت سے متعلق دستاویزی معلومات میں نے عام طور پر حسن اختر (۱۹۸۸) سے اخذ کی ہیں۔

۵۴۔عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)،ص ۳۵۔سید ذکی نے اقبال کا قول جن الفاظ میں دہرایا ہے وہ اقبال کے الفاظ معلوم نہیں ہوتے اگرچہ مفہوم اقبال کے اُس زمانے کے خیالات سے بہت قریب ہے: ''ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کی نسلیں پشتوں تک اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتیں۔ ہمارے رسول کریمؐ ہی کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ تمام الزامات سے پاک ہوئے اور پیغمبروں میں اُنہیں اُونچا مرتبہ ملا۔خدا کی قسم! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہ فرمایا ہوتا تو حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر بھی نہ مانا جاتا۔''

۵۵۔ نظم 'عاشقِ ہرجائی' بیاض میں سے نقشِ اول۔

۵۶۔ عطیہ فیضی کے نام مکتوب اپریل ۱۹۱۰ء

۵۶۔جوگندر سنگھ کو 'جوگی' کہنے کا ذکر عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص ۵۰۳ پر درج ہے۔

۵۷۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، مرزا جلال الدین کی روایات۔

۵۸۔عبداللہ قریشی، ۱۹۸۷ء، ص ۵۶

۵۹۔حنیف شاہد (جون ۱۹۷۷)، ص ۱۱۔اُن کا ماخذ ہے پیسہ اخبار ۱۱ ستمبر ۱۹۰۹ء

۶۰۔ Muhammad Siddique (1983) کتاب میکملن لندن سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۶۱۔حسن اختر (۱۹۸۸ء)، ص ۹۷۔بی ایس سی کے طلبہ کو انگریزی پڑھانے کی تفصیلات افضل حسین کے مضمون "My Preceptor" سے لی گئی ہیں جو *Pakistan Times* میں ۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء کو شائع ہوا۔اس مضمون کے لیے میرا ماخذ Raheem Bakhsh Shaheen کی *Mementos of Iqbal* ہے۔ایف اے کے طلبہ کو انگریزی پڑھانے کی تفصیلات اور اقبال کے اندازِ تدریس کی دیگر بہت سی جزئیات اور میاں اسلم کے ساتھ ان کے روابط کی تمام تفصیلات میاں اسلم کی روایت سے لی گئی

ہیں جو رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) ص ۱۲۴ تا ۱۳۹ میں درج ہے (میاں اسلم بعد میں مشہور ناول نگار ہوئے)۔ مولوی محمد علی قصوری کی روایات عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) میں درج ہیں۔

۶۲۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۲۶۵

۶۳۔ مولوی محمد علی قصوری اور سید محمد علی جعفری کی روایات، عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) میں۔

۶۴۔ سالک (۱۹۵۵)، ص ۶۷

۶۵۔ عبداللہ قریشی (۱۹۶۷)، ص ۲۰۷-۲۰۶۔ محمد الدین فوق کی روایت ہے۔

۶۶۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۹۹ کے مطابق حالی کا قطعۂ تاریخ زمیندار ۱۶ فروری کے شمارے میں شائع ہوا۔

۶۷۔ Muhammad Siddique (1983)

۶۸۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۷۷ پر علی بخش کی روایت۔

۶۹۔ اقبال کے سفرِ حیدر آباد کے مقاصد جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۱۱ کے قیاس سے ماخوذ ہیں۔ عطیہ فیضی نے لکھا ہے کہ اقبال کے تعارفی خط کی درخواست پر انہوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی اکبر حیدری اور ان کی بیگم سے تعارف کروایا تھا۔ اس بیان پر جاوید اقبال کا اعتراض درست معلوم ہوتا ہے۔ عطیہ فیضی کی یادداشت نے ضرور دھوکہ کھایا ہے کیونکہ حیدر آباد سے واپسی پر اقبال نے اکبر حیدری کا ذکر کرتے ہوئے عطیہ کو لکھا، ''شاید آپ اُنہیں جانتی ہوں۔''

۷۰۔ ایس ایم اکرام (یادگارِ شبلی)۔ مضامین دراصل عبدالماجد دریا آبادی نے تحریر کیے تھے۔

۷۱۔ احمد سعید (۱۹۸۱)، ص ۳-۲

۷۲۔ عروج عبدالرؤف (۱۹۸۸)، ص ۴۸۶۔ جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۱۴۴

۷۳۔ Stray Reflections

۷۴۔ عطیہ فیضی کے نام مکتوب ۷ اپریل ۱۹۱۰ء میں ذکر کیا ہے۔

۷۵۔ بیاض 219 میں پہلے ہی صفحے پر 'میونک ۱۹۰۷ء' کی سرخی ڈال کر لکھا ہے:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے

باقی صفحہ خالی ہے۔ غالباً نظم یاد نہیں آئی ہوگی اور اس کے بعد ہی عطیہ فیضی سے نقل منگوائی ہوگی۔ تین چار نظموں کے بعد یہ نظم پوری درج ہے اور عنوان ہے 'میونک میں لکھی گئی'۔ عطیہ فیضی سے نقل ملنے کے بعد یہاں لکھی گئی ہوگی۔

۷۶۔ یہاں نظم میں جن ترامیم کی بات کی گئی ہے وہ سب بیاض میں موجود ہیں۔ کئی سال بعد بانگِ درا میں شامل کرتے ہوئے جو مزید ترامیم ہوئیں ان کا یہاں ذکر نہیں۔

۷۷۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) مرزا جلال الدین کی روایت ہے۔ اُنہوں نے شہزادی کی سہیلی کو آسٹرین بتایا ہے مگر مس گوٹسمین کا تعلق ہنگری سے تھا۔ اُن دنوں آسٹریا اور ہنگری سیاسی اتحاد کی وجہ سے ایک ہی ملک تھے۔

۷۸۔ مکتوب بنام عطیہ فیضی ۷ جولائی ۱۹۱۱ء میں اقبال نے لکھا کہ سردار امراؤ سنگھ نے مس گوٹسمین والے اشعار کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جو اقبال نے منگوایا ہے۔

۷۹۔ تمام اشعار بیاض نمبر 219 میں درج ہیں۔ اِس انتسابی نظم کے دو بند ہیں اور نظم کا آغاز ہے:

نغمۂ رنگیں سمجھ یا نالۂ پیہم سمجھ

۸۰۔ دیگر لوگوں کے نام یہ ہیں: میاں محمد شفیع، مولوی احمد دین، گلاب دین، مولوی محبوب عالم، چودھری فضل حسین، چوہدری نبی بخش۔ مولوی فضل الدین، میاں نظام الدین اور مولوی کریم بخش۔ حوالہ: سالک (۱۹۵۵) ص ۸۰-۷۹، ان کا ماخذ پیسہ اخبار کے شمارے ہیں۔ اور حنیف شاہد (۱۹۷۶ء) ص ۱-۵۰، اُن کا ماخذ

انجمن کی قلمی رودادیں ہیں۔

۸۱۔ *Stray Reflections*۔ اندراجات: (1) Art; (2) The Discovery; (3) Human Intellect; (14) Poetry and Logical Truth; (35) The Popularity of a Poem; (48) Goethe's *Faust*

۸۲۔ *Stray Reflections*۔ اندراج: (4) The Economics of Charity

۸۳۔ Stray Reflections۔ اندراجات: (5) Existence of God; (6) A Dialogue

۸۴۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸ء)،ص ۱۲۸

۸۵۔ *Stray Reflections*۔ اندراجات: (7) The Satisfaction of Vanity; (8) Cruel Psychology; (9) The Power of Belief

۸۶۔ جاوید اقبال (۱۹۸۱)،ص ۱۷۲تا ۱۷۳

۸۷۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)۔ مرزا جلال الدین کی روایت ہے۔

۸۸۔ *Stray Reflections*۔ اندراج: (10) The God of Islam; (11) Hegel's System of Philosophy (13) Forms of Government; (16) History; (24) Right and Might; (30) The Madness of Nietzsche; (79) The Gramophone of History

۸۹۔ *Stray Reflections*۔ اندراج: (12) 15th May 1910

۹۰۔ *Stray Reflections* اندراجات: 13) Forms of Government; (18) Fanaticism; (19)Patriotism; (22) The German

Nation; (44) The Spiritual Ideal of the German Nation

۹۱۔ بیاض

۹۲۔ *Stray Reflections* اندراج: (15) Personal Immortality (17) Metaphysics

۹۳۔ *Stray Reflections* اندراج: (20) Justice

۹۴۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۱۱۴

۹۵۔ *Stray Reflections* اندراج: (21) Muslim Solidarity; (43) Polygamy; (93) The Young Prophets and the Muslim Woman

۹۶۔ *Stray Reflections* اندراج: (23) Modern Hindu

۹۷۔ *Stray Reflections* اندراج: (25) The Future of Afghanistan

۹۸۔ *Stray Reflections* اندراج: (26) Life as Criticism of Poetry; (78)The Vague and the Obscure

۹۹۔ Stray Reflections اندراجات: (29) (97) Plato and Goethe Aristotle; (57) Wonder

۱۰۰۔ *Stray Reflections* اندراجات: (27) European Christianity; (28) Christ and Spinoza; (45) On Loving One's Enemy; (60) Equality; (72) Idolatry; (75) Suffering; (87) The Moral Value of Suffering;

۱۰۱۔ *Stray Reflections* اندراج: (31) Aurangzeb (34) Tutelage of Nations; (59) The Interpretation of History

۱۰۲۔ *Stray Reflections* اندراجات: (32) The Conquest of Persia; (73) The Wonderful History of the Muslim Community

۱۰۳۔ *Stray Reflections* اندراجات: (33) Ghalib; (36) Hegel, Goethe, Ghalib, Bedil and Wordsworth

۱۰۴۔ *Stray Reflections* اندراج: (37) Parables ۔منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کی روایت ہے کہ نظم 'شیکسپیئر' کالج کے چند طلبہ سے انگریزی اور فارسی کے شعرا پر گفتگو کرنے کے بعد لکھی گئی۔

۱۰۵۔ بانگِ درا میں شامل نظم میں ایک بند کا اضافہ ہے جو اس مشہور شعر پر ختم ہوتا ہے:

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سَودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

نظم ۱۹۱۶ء میں شیکسپیئر کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر شائع ہونے والی مشہور ضخیم کتاب *A Book of Homage to Shakespeare* میں شائع ہوئی اور افضل حسین کا بیان ہے کہ اُس کتاب کے مرتب نے فرمائش کر کے لکھوائی تھی۔ (*Mementos of Iqbal* by Raheem Bakhsh Shaheen, p. 36)۔ غالباً ۱۹۱۰ء کی یہ ادھوری نظم اُس وقت مکمل ہوئی ہوگی۔

۱۰۶۔ نظم کے چوتھے اور پانچویں بند خاص طور پر اقبال کے مضمون 'McTeggart's Philosophy' کی روشنی میں پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ میک ٹیگرٹ کے نزدیک ایک فرد کی دوسرے سے محبت ہی کائنات کی اصل تھی۔ اقبال نے بھی اِسی کو دلیل بنایا ہے۔ مگر میک ٹیگرٹ کے نزدیک یہ ممکن نہیں تھا کہ دو انائیں ایک میں سما جائیں اور اس لیے نہ صرف خدا کا وجود ممکن نہ تھا بلکہ کسی رُوحِ کل کا تصور بھی دشوار

تھا۔ اقبال نے اس کے جواب میں انسانیت کو ایک ایسی ندی سے تشبیہ دی جو دُنیا میں گرتے ہوئے من و تُو میں تقسیم ہوگئی ہے مگر موت کے بعد یہ بکھرے ہوئے قطرے پھر یکجا ہو جائیں گے۔

۱۰۷۔ میرا ماخذ بیاض ہے۔

۱۰۸۔ Stray Reflections اندراج: (38) The Jewish Contribution to Civilisation

۱۰۹۔ Stray Reflections اندراج: (39) Mazzini

۱۱۰۔ Stray Reflections اندراج: (40) The Dependence of Science on Metaphysics; (41) Modern Science and Democracy; (42) The Relationship of Ideas to Their Historical Context; (47) White Man's Burden; (51) Robber Nations

۱۱۱۔ Stray Reflections اندراج: (46) Ideas

۱۱۲۔ روایت اعجاز احمد کی ہے اور دو مختلف جگہوں پر تھوڑے سے فرق کے ساتھ درج کی گئی ہے۔ فقیر سیّد وحید الدین (۱۹۵۰، ۱۹۶۳)، ص ۱۱۶-۱۱۵ پر بنیادی فرق یہ ہے کہ پانچ سو آدمی تیار کرنے کی ہدایت کر کے وہ بزرگ اُس دروازے سے باہر نکلنے لگے جو گلی کی طرف کھلتا تھا اور جس طرف کوئی راستہ نہ تھا۔ اقبال نے لالٹین اُٹھا کر انہیں سیڑھیوں کی راہ دکھانی چاہی مگر وہ بزرگ اپنی تاکید دہراتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اقبال باہر نکلے مگر بزرگ کا کہیں نشان نہ تھا۔ رات کو گشت کرنے والے کانسٹیبل سے دریافت کیا تو اُس نے بھی اس حلیے کے کسی آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔

فقیر صاحب نے بھی یہ روایت اعجاز احمد سے سن کر ہی لکھی تھی مگر خود اعجاز احمد کی کتاب مظلوم اقبال (۱۹۸۵ء) میں روایت کی بعض تفصیلات موجود نہیں ہیں اور میں

نے اسی صورت کو اختیار کیا ہے۔ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ۱۹۱۰ء کا ہے اور اس کے چند دن بعد اقبال گرمیوں کی تعطیلات میں سیالکوٹ آئے جہاں اعجاز نے خود اُن کی زبان سے یہ واقعہ سنا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۱۳۔ Stray Reflections اندراج: (49) Milton

۱۱۴۔ Stray Reflections اندراج: (50) The Soul of Oscar Wilde

۱۱۵۔ Stray Reflections اندراج: (52) The Memory of Man

۱۱۶۔ فقیر وحید الدین (۱۹۶۳، ۱۹۵۰) اور اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۱۰۹۔

۱۱۷۔ Stray Reflections اندراج: (53) Amusements in Muslim Countries

۱۱۸۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۱۰۰۔ انہوں نے لکھا ہے کہ روزگارِ فقیر کے دوسرے اڈیشن میں اُن کی ایک روایت پڑھ کر اُن کی پھوپھی (اقبال کی چھوٹی بہن) کریم بی بی نے یہ واقعہ انہیں بتایا۔ خالد نظیر صوفی (۲۰۰۳) نے اعتراض کیا ہے کہ کریم بی بی ۱۹۵۸ میں فوت ہو گئی تھیں جبکہ روزگارِ فقیر کا دوسرا اڈیشن اس کے کئی سال بعد شائع ہوا۔

۱۱۹۔ خالد نظیر صوفی (۲۰۰۳)، ص ۱۳۹

۱۲۰۔ سالک (۱۹۵۵) ص ۸۰۔ ان کا ماخذ پیسہ اخبار کے شمارے ہیں۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶) ص ۵۱، اُن کا ماخذ انجمن کی قلمی روداد یں ہیں۔

۱۲۱۔ صہبا لکھنوی (۱۹۷۳/۲۰۰۰)

۱۲۲۔ Stray Reflections اندراجات: (54) The Power of Minorities; (60) Equality; (62) The End of Education

۱۲۳۔ Stray Reflections اندراج: (55) Scepticism and

Religion

۱۲۴۔ Stray Reflections اندراج: (56) Arab Poetry

۱۲۵۔ Stray Reflections اندراج: (58) The Critical Period for the Mussalmans of India

۱۲۶۔ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

۱۲۷۔ Stray Reflections اندراج: (61) The Worth of Things

۱۲۸۔ Stray Reflections اندراجات: (63) God is Power; (64) The Powerful Man

۱۲۹۔ افضل حسین کی روایت ہے۔ میرا ماخذ Raheem Bakhsh Shaheen کی Mementos of Iqbal ص ۳۶-۳۵ ہے۔

۱۳۰۔ Stray Reflections اندراج: (65) The Touch of Power; (66) The Thought of the Powerful Man; (67) Waiting for the Mehdi

۱۳۱۔ Stray Reflections اندراج: (68) The Idea of Nationality

۱۳۲۔ Stray Reflections اندراجات: (69) Kant's Categorical Imperative; (71) Self-control; (82) Contemplation Without Action; (83) Success in Life; (85) A Successful Man; (86) The Lazy Mind; (101) True Political Life

۱۳۳۔ Stray Reflections اندراجات: (70) To Revitalize the Dying Organism; (74) To Reconstruct This World;

۱۳۴۔ ایم اسلم کی روایت۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۳۱

۱۳۵۔ ایم اسلم کی روایت ۔رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص۱۳۲-۱۳۱

۱۳۶۔ *Stray Reflections* اندراجات: (76) Infinity; (77) The Poet and the World Spirit

۱۳۷۔ ایم اسلم کی روایت ۔رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص۱۳۲-۱۳۱

۱۳۸۔بیاض نمبر 219۔اقبال کی بیاض میں 'فلسفۂ غم' کے فوراً بعد یہ نظم درج ہے جو بعد میں ترمیم کے ساتھ 'رات اور شاعر' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

۱۳۹۔ *Stray Reflections* اندراجات: (84) To Become a Public Leader; (90) Democracy; (91) Democracy and Imperialism

۱۴۰۔ *Stray Reflections* اندراج: (88) The Big Library

۱۴۱۔ *Stray Reflections* اندراج: (89) Miracles

۱۴۲۔ *Stray Reflections* اندراجات: (80) Sin and Piety; (81) Virtuous People; (92) Moral Readers

۱۴۳۔غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص۶۱ میں پروفیسر عبدالحمید کی روایت ہے۔

۱۴۴۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص۳۱

۱۴۵۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص۲۰

۱۴۶۔ بیاض نمبر 219۔عنوان وہی ہے جو یہاں نقل کیا گیا ہے۔پوری نظم میں آٹھ اشعار ہیں جن میں سے یہ شعر کاٹ دیا گیا ہے:

مجھے قسم ہے نظامی مدینے والے کی
ہمیشہ ماتمِ ملّت میں اشکبار ہوں میں

چونکہ ۱۹۱۵ء میں یہ نظم بدایوں کے کسی نظامی صاحب کے رسالے میں شائع ہوئی تھی لہٰذا خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہ نظم ۱۹۱۵ء میں اُنہی کی فرمائش پر لکھی گئی ہوگی۔اگر یہ

بات ہے تو پھر اقبال نے بعد میں کسی وجہ سے اسے اپنی پرانی بیاض میں شامل کرلیا ہوگا ویسے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ نظم ۱۹۱۰ء ہی میں اور شاید حسن نظامی کی فرمائش پر لکھی گئی مگر ۱۹۱۵ء میں اقبال نے یا تو اسے بدایوں والے نظامی صاحب کی فرمائش پر دوبارہ اُنہیں ارسال کر دیا یا پھر اُنہوں نے خود ہی اپنے رسالے میں شائع کر لی۔

۱۴۷۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۱۳۸-۱۳۷میں محمد دین فوق کا بیان۔شادی کی خبر اخبار الحکم میں ۲۸ اگست کو شائع ہوئی تھی۔

۱۴۸۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۱۳۸میں محمد دین فوق کا بیان۔

۱۴۹۔سعید اختر درانی میں ایما کے نوادرات کے ذکر میں ایک اور زیور کا ذکر بھی ہے جو ہندوستانی ساخت کا ہے۔

۱۵۰۔حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۱

۱۵۱۔ *Stray Reflections* اندراجات: (94) Poets and Politicians; (95) A Prophet; (96) Philosophy and Poetry

۱۵۲۔ بیاض نمبر 219۔یہ نظم ترمیم کے بعد بانگِ درا میں شامل ہوئی۔

۱۵۳۔ *Stray Reflections* اندراج: (98) The Most Charming Thing On Earth

۱۵۴۔ سردار بیگم بعد میں اقبال کی تیسری بیوی بنیں (جیسا کہ اس باب میں آگے ذکر ہو گا)۔ان کے خاندانی پس منظر کی تفصیلات جاوید اقبال (۱۹۸۱) اور عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۱۷۶-۱۷۵ پر خواجہ عبدالغنی کے دوست شمس الدین کی روایت سے لی گئی ہیں۔

۱۵۵۔روایاتِ اقبال

۱۵۶۔

۱۵۷۔ *Stray Reflections* اندراج: (99) Conformity Without Dogma

۱۵۸۔ ایم اسلم کی روایت ۔رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۳۱

۱۵۹۔ ایم اسلم کی روایت ۔رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۳۱

۱۶۰۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۴۱

۱۶۱۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۶۵

۱۶۲۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۱۵۷، ۳۰۷۔ خالد نظیر صوفی (۲۰۰۳)، ص ۱۸۷

۱۶۳۔ *Stray Reflections* اندراج: (100) Sunset on the Banks of Ravi

۱۶۴۔ *Stray Reflections* اندراج: (102) The Importance of a True Marriage

۱۶۵۔ سردار بیگم کے انتخاب کے متعلق تین روایات پائی جاتی ہیں۔ مرزا جلال الدین کا بیان ہے کہ شیخ گلاب دین نے موچی دروازے میں کسی کشمیری لڑکی کا ذکر کیا جو وکٹوریہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھیں اور ایک غریب مگر نہایت شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ علی بخش کا بیان تھا کہ ایک مرتبہ امام بی اُنہیں لے کر کہیں رشتہ دیکھنے گئیں اور واپسی پر کسی نائن نے سردار بیگم کے گھر کا پتہ دیا۔ تیسری روایت منشی طاہر دین کے بیٹے شیخ بشیر احمد کی ہے جو انہوں نے سردار بیگم کے بیٹے جاوید اقبال کو بتائی۔ جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۳۴ نے تینوں روایات درج کی ہیں مگر وضاحت کی ہے کہ اُن کی والدہ اسکول کی پڑھی ہوئی ہرگز نہیں تھیں اور نکاح کے وقت اُن کی عمر انیس بیس برس کے قریب رہی ہوگی۔

۱۶۶۔ *Stray Reflections* اندراجات: (103) God and the Devil; (104) Think of the Devil

۱۶۷۔ واپورٹ (۱۹۸۴)، ص ۳۰

۱۶۸۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۲)، ص ۱۶۰-۱۵۹۔ محمد الدین فوق کی روایت ہے۔

۱۶۹۔ یہ لیکچر ۱۹۰۸ء میں لندن کے سوشیالوجیکل ریویو میں چھپ چکا تھا جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ Lateef Ahmed Sherwani (1944/1977), p. 138

۱۷۰۔ حنیف شاہد (۱۹۹۷)، ص ۱۵۹

۱۷۱۔ *Stray Reflections* اندراج: (105) Thanksgiving

۱۷۲۔ *Stray Reflections* اندراج: (107) The Instinct to Collect Testimonials

۱۷۳۔ احمدی عقاید سے اقبال کو کبھی دلچسپی نہیں تھی، جس کی تفصیل پچھلی کتاب میں آ چکی ہے۔ تحریک کے معاشرتی پہلو کے بارے میں بھی اُن کا خیال بعد میں تبدیل ہو گیا۔ شخصیت کی تین قسموں کا نظریہ اقبال نے Gidding سے منسوب کیا ہے مگر معلوم نہیں یہ گڈنگ کون ہے۔ اُس زمانے میں اس قسم کے نظریات عام تھے۔ یہ لیکچر ایک عرصے تک مولانا ظفر علی خاں کے ترجمے 'ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر' کی صورت میں پڑھا جاتا رہا۔ یہ ترجمہ بہت اچھا نہیں ہے۔ مکمل انگریزی متن رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کے کاغذات میں سے دریافت کیا اور پھر کئی کتابوں میں شامل ہوا مثلاً اُن کی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ اور Sherwani (1977)۔

۱۷۴۔ *Stray Reflections* اندراجات: (106) The Psychologist and the Poet; (108) The Anatomy of the Human Mind; (109) Man and Infinity; (112) Shakespeare and Goethe; (114) Experience and Knowledge; (119)

Hafiz; (123) Art Alone Is Boundless; (113) The Value of the Moment; (115) Commonplace Facts

۱۷۵۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۴۷

۱۷۶۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۸

۱۷۷۔ *Stray Reflections* اندراج: (110) The Poet As A Human Being; (111) The Effect of Philosophy and Poetry

۱۷۸۔ *Stray Reflections* اندراج: (116) Horace, Montaigne and Azad

۱۷۹۔ *Stray Reflections* اندراج: (117) Literary Criticism; (118) Goethe and Heine

۱۸۰۔ *Stray Reflections* اندراج: (120) Love Is a Playful Child

۱۸۱۔ Stray Reflections اندراجات: (121) Seeking Wisdom; (122) The Man With A Single Idea

۱۸۲۔ جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۷۰

۱۸۳۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اسرارِ خودی پہلے اردو میں لکھنا شروع کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہے اور جو حصہ لکھا گیا تھا بعد میں اُسے تلف کر دیا۔ دیکھیے جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۶۹

ﷺرسول اللہ کے بارے میں یہ خیال کہ ''سمایانہ جو وہم وادراک میں'' بہت عرصے بعد نظم 'ذوق وشوق' کے مشہور اشعار میں پھر ظاہر ہوا:

گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں

حباب

۱۸۴۔ بعد میں یہ کئی تبدیلیوں کے ساتھ نظم 'شمع اور شاعر' کا پہلا حصہ بنی۔ بیاض نمبر 219 میں اس کے نقشِ اول پر غزل کا عنوان درج ہے۔

۱۸۵۔ اقبال کی شاعری میں لالے کی علامت کے ارتقا پر شیما مجید (۱۹۹۰) میں شامل سید عابد علی عابد کا مضمون 'کلامِ اقبال میں لالے کی علامتی حیثیت' مفید ہے مگر حیرت ہے کہ عابد نے اس سلسلے میں سب سے اہم نظم یعنی پیامِ مشرق کی نظم 'لالہ' نظر انداز کر دی ہے جس میں اس علامت کی باقاعدہ وضاحت ہوئی ہے۔

۱۸۶۔ Stray Reflections اندراج: (124) Absolute Knowledge and Moral Growth

۱۸۷۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص۸۲ پر علی بخش کی روایت ہے۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص۷۲ پر درج ہے کہ اقبال نے ملازمت اِس وجہ سے ترک کی کہ جج صاحبان اس بات پر راضی نہیں ہو رہے تھے کہ اقبال کے مقدمات ہمیشہ کے لیے کالج کے لیکچروں کے بعد لیے جایا کریں۔ عبداللہ چغتائی نے اِس روایت کا ماخذ نہیں بتایا۔

۱۸۸۔ Stray Reflections اندراج: (125) Flattery

۱۸۹۔ Muhammad Siddique (1983)

۱۹۰۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص۳۲۔ عبداللہ چغتائی، جن کا اقبال کے یہاں آنا جانا کئی سال بعد شروع ہوا، اُن کا بیان ہے کہ اُنھوں نے اس کتاب کے نسخے اقبال کے یہاں دیکھے تھے۔ تعجب ہے کہ اقبال کی تصانیف میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس کتاب کی بنیاد اقبال کے کلاس لیکچرز ہوں جن پر اقبال سے بعد میں مزید گفتگو کر کے اُن کے کسی شاگرد نے اُن کی گفتگو کو قلم بند کر دیا ہو۔

۱۹۱۔ لیکچر "Islam As a Moral and Political Ideal"

۱۹۲۔ حنیف شاہد (۱۹۹۷)، ص ۱۵۸

۱۹۳۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۱۱۵ میں مرزا جلال الدین کی روایت۔

۱۹۴۔ اس قطعے کا متروک شعر تھا:

کبھی ایراں کے لیے ہو جو دعا کا جلسہ
عذر تیرا ہے کہ ہے تیری طبیعت ناساز

شیخ اعجاز احمد (۱۹۸۵) کا بیان ہے کہ یہ ایک واقعے کی طرف اشارہ تھا جو اُنہی دنوں پیش آیا تھا۔ لوگ اقبال سے کتنے ناراض تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اپریل میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں اپنی نظم 'شکوہ' سنانے سے پہلے اُنہوں نے شاید فضا ہموار کرنے کے لیے یہی قطعہ پڑھا۔ بعد میں یہ مخزن کے مئی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ شائع ہوا۔ وہاں اس کے سولہ اشعار چھپے مگر بیاض میں چھبیس درج ہیں۔

۱۹۵۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۷۵

۱۹۶۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۱۲۸

۱۹۷۔ حسن اختر (۱۹۸۸ء) ص ۹۳

۱۹۸۔ عبدالرؤف عروج (۱۹۸۸)

۱۹۹۔ حنیف شاہد (جون ۱۹۷۷)، ص ۱۲۔ ان کا ماخذ ہے پیسہ اخبار ۳ اپریل ۱۹۱۱ء، ص ۳

۲۰۰۔ شیخ عبدالقادر نے 'میر کی واسوخت اور اقبال کا شکوہ' میں جو روزنامہ امروز (لاہور) میں اُن کی وفات کے کئی سال بعد ۲۴ فروری ۱۹۵۷ء کو شائع ہوا 'شکوہ' کو اقبال کی واسوخت قرار دے کر میر تقی میر کی واسوخت سے اس کا موازنہ کیا ہے: ''مخاطب کے اختلاف کے علاوہ فنی لحاظ سے دونوں کا تال سُر یکساں ہے۔''

اُنہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اِس موضوع پر کبھی اقبال سے اُن کی گفتگو ہوئی یا نہیں۔مضمون کے لیے میرا ماخذ ہے حنیف شاہد (۱۹۷۲)،ص۱۶۰-۱۴۹

۲۰۱۔ ثیمامجید (۱۹۹۰)،ص ۹۰-۵۷ میں سید عابد علی عابد کا مضمون 'شکوہ، ایک سلسلۂ خیال کا تجزیہ' کچھ تنقیدی اشارے فراہم کرتا ہے۔سلیم احمد کی کتاب اقبال ایک شاعر میں مضمون 'موچی دروازے کی شاعری' بھی پڑھنے کے لائق ہے (اگر چہ انہوں نے فیض احمد فیض سے جو اعتراض منسوب کر کے جواب میں یہ مضمون لکھا ہے وہ اعتراض فیض صاحب نے شاید کبھی کیا ہی نہیں تھا جیسا کہ آفتاب احمد خاں نے رسالہ شب خون میں اپنے ایک مضمون میں وضاحت کی ہے)۔اس کے علاوہ رفیع الدین ہاشمی (۱۹۹۳)،ص۶۴-۴۹ میں 'شکوہ' کے مطالعے کے لیے اچھا مواد موجود ہے۔

۲۰۲۔عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)۔مرزا جلال الدین کی روایت۔

۲۰۳۔ بیاض میں نظم تاریخ اور مقام کے ساتھ درج ہے۔

۲۰۴۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)،ص۱۰۳

۲۰۵۔ شادی کی تفصیل کے لیے جہان آرا شاہنواز (۱۹۷۱ء)۔قطعۂ تاریخ صابر کلوروی (۲۰۰۴ء) میں موجود ہے۔اُنہوں نے اپنا ماخذ وطن اخبار ۲۶ فروری ۱۹۰۴ء بتایا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ سہو ہے۔

۲۰۶۔ یہ بیان میاں بشیر احمد کا ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ کون سی تقریب تھی اور کب ہوئی۔میاں بشیر کے پاس وہ کاغذ محفوظ تھا مگر اُنہوں نے اشعار شائع نہیں کروانے مناسب نہیں سمجھے۔ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷ء)،ص۴۴

۲۰۷۔حنیف شاہد (۱۹۹۷)،ص۲۱۰-۲۰۸

۲۰۸۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)،ص۲۴۴-۲۳۸ میں اس لیکچر کا خلاصہ محمد دین فوق کے کسی اخبار سے لے کر شامل کیا گیا ہے۔نامہ نگار نے اس لیکچر کا خلاصہ انجمن حمایت

اسلام کی روئداد سے نقل کیا ہے۔ عبداللہ قریشی نے اخبار کا نام اور تاریخ نہیں دی (اگرچہ باب کا عنوان 'اخبار کشمیری کے چند تراشے' ہے مگر اس میں فوق کے دوسرے رسالوں کے تراشے بھی شامل ہیں)۔ اُن دنوں فوق کشمیری ہی نکال رہے تھے لہٰذا اُسی اخبار کے کسی شمارے (بالخصوص اپریل ۱۹۱۱ء) کے کسی شمارے میں یہ خلاصہ شائع ہوا ہوگا۔

تعجب ہے کہ 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' پر اس قدر لکھا گیا ہے مگر اب تک کسی نے اپنی تشریحات پر اقبال کے اِس لیکچر کی روشنی ڈالنے کی زحمت نہیں کی جبکہ یہ لیکچر اُسی سالانہ جلسے میں دیا گیا جس میں 'شکوہ' پڑھی گئی اور یہ اُن فکری اصولوں کو بہت صفائی سے واضح کرتا ہے جو 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' کی تہ میں شاعر کے ذہن میں متحرک تھے۔

اس خلاصے کی اہمیت کی وجہ سے یہاں اِسے عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۲۳۸-۲۴۴ سے نقل کر رہا ہوں:

اصولِ تمدن

> شنبہ ۱۵ اپریل ۱۹۱۱ء کو ڈاکٹر اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں 'اصولِ تمدن' کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ تقریر پہلے سے لکھی ہوئی نہ تھی، اس لیے ان نوٹوں سے جو تقریر کے دوران میں لیے گئے، حسبِ ذیل خلاصہ روئیداد میں درج ہوا:

جناب صدر انجمن و معززین!

میرا مقصد اس لیکچر میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ صحیح اصول تمدن کیا ہے اور دنیا میں پہلے پہل ان اصولوں کی بنیاد کس نے رکھی؟ فطرتِ انسانی کے تین پہلو ہیں یعنی (۱) عقل و تدبیر، جس کے عمل سے نتائجِ علمیہ پیدا ہوتے ہیں۔ (۲) جذبات جو علم و ادب و دیگر فنونِ لطیفہ مثلاً شعر، مصوری اور تعمیرات وغیرہ کی صورت میں صفحۂ ظہور پر آتے ہیں۔ اور (۳) عمل جس کے اثر سے اقوامِ عالم کا نظامِ تمدن مرتب و منظم ہوتا ہے۔ چونکہ

تہذیب و تمدن انسان کی فطرت کے عمل کا ایک نتیجہ ہے، اس واسطے ہر تہذیب میں اگر اس کا تجزیہ کیا جائے، یہی تینوں پہلو فطرتِ انسانی میں عمل کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ پس ایسے اصولِ تمدن معلوم کرنے کے لیے جن پر کسی قوم کی تہذیب کا دارومدار ہو، اس تہذیب کا پورا پورا تجزیہ کرنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر قرونِ وسطیٰ میں مغربی تہذیب کو لیجیے۔ عقلی پہلو سے اس کو دیکھیے تو اس تہذیب میں آزادانہ تحقیقات کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔ جو لوگ جرأت کر کے نئی علمی راہیں پیدا کرتے ہیں، زندہ جلا دیے جاتے ہیں۔ فلسفہ موجود ہے۔ کلیسا کے مسلمات میں بگڑا ہوا [کذا: جکڑا ہوا (؟)] مشاہدہ ہے اور تجزیہ سے غافل محض نظریات کی بھول بھلیوں میں گمراہ۔ پس عقلی لحاظ سے قرونِ وسطیٰ کی مغربی تہذیب کا ابتدائی مسلّمہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح علم تجزیے اور مشاہدے سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ مسلماتِ کلیسا سے باہر کسی علم کا وجود ہی نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس تہذیب کو جذباتی اعتبار سے جانچیے تو یہاں بھی اسی مسلّمہ کا اثر محسوس ہوگا۔ علمِ ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کا مواد تجزیے اور مشاہدے سے پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ کلیسا کے قصے کہانیاں اس کا مسالہ ہیں۔ فنون کا مقصد ہے حسین اشیا کا پیدا کرنا۔ قرونِ وسطیٰ کے اہلِ فن اس اصول کے معتقد معلوم ہوتے ہیں کہ محض قدرت میں حسین اشیاء پیدا کرنے کا مسالہ موجود نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ ان کا ابتدائی مفروضہ یا مسلّمہ یہ اصول ہے کہ قدرت میں حسن نہیں ہے۔ جس طرح علمی یا عقلی اعتبار سے علمائے قرونِ وسطیٰ اس اصول پر کاربند معلوم ہوتے ہیں کہ نظامِ عالم کے قویٰ کا مشاہدہ کرنے سے کوئی مفید نتائج نہیں پیدا کر سکتا اسی طرح جذباتی اعتبار سے اس زمانے کے اہلِ فن نظامِ عالم میں وجودِ حسن کے قائل نہیں معلوم ہوتے یا کم از کم اس مفروضے کے نادانستہ کاربند معلوم ہوتے ہیں۔ عملی اعتبار سے قرونِ وسطیٰ کی تہذیب میں صرف حکومت کی صورت کو لیجیے۔ تمام یورپ کے ممالک میں مطلق العنان حکومتیں نظر آتی ہیں، جو اس مسلمہ پر مبنی ہیں کہ انسان آزادی کا حق نہیں رکھتا اور انفرادی حیثیت سے

حاکموں کا ایک غلام ہے۔ پس قرونِ وسطیٰ کی تہذیب کے تجزیے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیب کا دارومدار ان تین مسلماتِ ابتدائیہ پر ہے:

۱۔ عقلی اعتبار سے، تجربہ مشاہدہ سے صحیح علم نہیں پیدا ہوتا یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ انسان نظامِ عالم کی قویٰ کا مشاہدہ کر کے ان سے مفید نتائج نہیں پیدا کر سکتا اور اس طرح نظامِ عالم سے دکھ درد کے ان اسباب کو زائل نہیں کر سکتا جو ان قویٰ کے عمل سے جاہل ہونے کی وجہ سے اسے متاثر کرتے ہیں۔

۲۔ جذباتی اعتبار سے نظامِ عالم میں حسن موجود نہیں ہے۔

۳۔ عملی اعتبار سے انسان غلام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مغربی تہذیب کے مسلمات ہو بھی یہی سکتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب مسلمات نتیجہ ہیں مذہبِ عیسائی کے ایک اصول کا۔ یعنی یہ کہ انسان فطرتاً بد ہے اور وہ اس دنیا میں اپنے ابتدائی گناہ کے عوض بھیجا گیا ہے۔ اگر انسان فطرۃً بد ہے تو ظاہر ہے کہ عملی لحاظ سے اس پر ہر وقت پہرا قائم رہتا ہے۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی لحاظ سے انسان ایک مطلق العنان حکومت کے تابع رہے اور مذہبی لحاظ سے ایک معصوم عن الخطا امام یعنی پوپ کا مطیع و منقاد ہو، جو ہر حیثیت میں انسان کے عمل کو متیقن کر دے تاکہ وہ احکام کی زنجیروں میں جکڑا رہے اور اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ اس اصول سے یہ نتیجہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان نظامِ عالم کے قویٰ کے مشاہدے اور تجربے سے دنیا سے تکلیف کے اسباب کو زائل نہیں کر سکتا کیونکہ عیسائی مذہب کے اصول کے مطابق یہ دنیا دکھ درد کا گھر ہے جہاں انسان اپنے گناہ کے عوض بھیجا گیا ہے۔ جس قید خانے کی حالت انسانی کوشش سے اچھی ہو سکتی ہے وہ قید خانہ ہی کیا۔ پس یہ اصول کہ نظامِ عالم سے اسبابِ درد زائل نہیں ہو سکتے اور یہ کہ نظامِ عالم میں حسن نہیں ہے، مذہبِ عیسائی کے مسلمۂ اولیہ سے بطور ایک لازمی نتیجے کے پیدا ہوتے ہیں۔

زمانۂ حال کی مغربی تہذیب ان مسلمات پر مبنی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زمانۂ حال میں ان مسلمات سے، جن پر قرونِ وسطیٰ کی تہذیب مبنی تھی قطعی انکار کر دیا گیا ہے۔ یورپ میں پہلے پہل بیکن اور ڈیکارٹ نے اس بات کا اعلان کیا کہ صحیح علم تجربے اور مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنی کوشش سے دنیا کے دکھ درد کو زائل کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس عملیات میں مذہبی دائرے میں لوتھر نے انسان کی جبلی آزادی کا اعلان کیا اور اس کو پوپ کی زنجیروں سے آزاد کیا۔

سیاسی دائرے میں رُوسو نے وہی کام کیا جو لوتھر نے مذہبی دائرے میں کیا تھا یعنی سیاسی لحاظ سے اس نے انسان کی آزادی کا اعلان کیا اور بالآخر اُس کی تعلیم نے نپولین کو پیدا کیا جس نے زمانۂ حال میں مطلق العنان حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر کے جمہوریت کی بنیاد رکھی۔ ڈیکارٹ اور بیکن کی تعلیم کے اثر سے نہ صرف علمی اغراض کے لیے نظامِ عالم کا مشاہدہ شروع ہوا بلکہ فنونِ لطیفہ کے اغراض کے لیے بھی لوگوں نے نظامِ عالم کی طرف توجہ کی اور علمِ ادب اور فنونِ لطیفہ کی بنیاد مشاہدۂ فطرت پر قائم کی گئی۔ پس زمانۂ حال کی مغربی تہذیب اصولاً قرونِ وسطیٰ کی تہذیب سے مختلف ہے کیونکہ اس کی مسلماتِ اولیہ اُن مسلماتِ اولیہ سے متناقص ہے جن پر قرونِ وسطیٰ کی تہذیب مبنی تھی۔ حال کی مغربی تہذیب صحیح اصولِ تمدن پر مبنی ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ صحیح علم مشاہدے اور تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ نظامِ عالم میں حسن ہے۔

۳۔ انسان فطرتاً آزاد ہے۔

اِس اصولوں کو تہذیب کا رُوح و رواں قرار دینا اور قرونِ وسطیٰ کے اصول تہذیب کو ترک کر دینا حقیقت میں مذہبِ عیسائی کے اس اصول کو ترک کر دینا ہے کہ انسان فطرتاً بد ہے۔ چونکہ اس مذہبی انکار سے کفارے کا انکار بھی لازم آتا ہے اس واسطے زمانۂ حال کی تہذیب کے بانیوں کی سخت مخالفت کی گئی۔ لوتھر پر تو یہ الزام بھی لگایا گیا

کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے اور مذہبِ اسلام کے اصول کی ترویج کرتا ہے۔

اب میں یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ صحیح اصولِ تمدن پہلے پہل دنیا کو کس نے سکھلائے؟ میرا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام اصول جن کے عمل سے تہذیب کی اعلیٰ صورتیں پیدا ہوتی ہیں قرآن سے اخذ کیے گئے ہیں اور قرآن ہی نے ان تمام اصولوں کی اشاعت دنیا میں سب سے پہلے کی ہے۔ قرآن ہی نے دنیا کو پہلے پہل سکھلایا کہ انسان فطرتاً نیک ہے۔ اس کو کسی کفارے کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی کوشش سے اپنی نجات حاصل کرسکتا ہے۔ نہ مذہبی دائرے میں اسے محافظوں کی ضرورت ہے کہ سیاسی دائرے میں اسے ایک مطلق العنان حاکم چاہیے۔ یہ بالطبع آزاد ہے اور آزادی کا حق رکھتا ہے۔ پس اسلام نے اول اول رہبانیت کے خلاف جہاد کر کے مذہبی دائرے میں اُس جمہوریت کی بنیاد رکھی جو زمانۂ حال کی تہذیب وتمدن کی روح و رواں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن ہی نے پہلے پہل بنی نوعِ انسان کی توجہ تجربے اور مشاہدے کی طرف مبذول کی اور ان کو سکھلایا کہ تدبر کرنے والوں کے لیے اس نظامِ عالم میں آیات ہیں اور کہ اس نظام کے قویٰ انسان کے فائدے کے لیے تسخیر کیے گئے ہیں۔

شرک کو اسلام کیوں گناہِ کبیرہ قرار دیتا ہے؟ اس وجہ سے کہ جب تک کسی فطری قوت کو معبود تصور کیا جائے گا تب تک اُس کو معبود اور خدا تسلیم کرنے والا اس کی حقیقت پر غور نہیں کرسکتا، اس کو تجربے کا مطیع و منقاد نہیں کرسکتا۔ اس کو عام استعمال کی چیزوں کی طرف بوجہ اُس عزت وتکریم کے جو اس قوتِ فطری کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتا ہے، چھو نہیں سکتا۔ علوم کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی روک شرک تھی اور اسلام نے جس زور سے اس کا قلع قمع کیا ہے وہ تاریخی لحاظ سے حیرت ناک ہے اور میرے نزدیک علمی اعتبار سے دنیا پر سب سے بڑا احسان مذہبِ اسلام کا یہی ہے۔ اِس حقیقت سے متاثر ہو کر مذہبِ اسلام کے پیروؤں نے ملک اسپین میں ان

تمام علمی اصولوں کی تدوین کی جن کا تعلق تجربے اور مشاہدے سے ہے، بلکہ بعض ایسے علوم کی بنیاد بھی رکھ دی (مثلاً کیمسٹری) جن کی روح و رواں صرف مشاہدۂ فطرت ہے۔ اگر پوری تحقیق و تدقیق کی جائے تو ہر اعتبار سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یورپ میں تہذیب و تمدن کے صحیح اصول مسلمانوں کے اثر سے ہی مروج ہوئے۔ نتیجہ اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ تہذیب کی اعلیٰ صورتیں صرف انہی اصولوں کے عمل سے پیدا ہو سکتی ہیں جو اسلام نے سکھلائے ہیں اور اگر حال کے مسلمان یہ آرزو رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اسلاف کی طرح دنیا کی مہذب اقوام میں شمار ہوں تو اُن کو لازم ہے کہ وہ قرآن کو مضبوط پکڑیں اور ان اصولوں پر کاربند ہوں جو خدائے تعالیٰ نے انہیں سکھلائے ہیں۔ زندگی انہی اصولوں پر عمل کرنے سے ہے۔ ان کے مخالف عمل کرنا موت ہے۔ اس وقت جو اسلامی دنیا کی حالت افسوس ناک ہے اس کے اسباب پر بھی اگر غور کیا جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ مسلمان ان اصولوں سے غافل ہو گئے جو شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو سکھائے تھے۔

۲۰۹۔ مرزا جلال الدین کی روایت۔ ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷)، ص ۹۶۔ اس بیان کی روشنی میں امجد سلیم علوی (۱۹۸۸)، ص ۱۱۸ میں غلام رسول مہرؔ کی یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کہ نظم 'شکوہ' اجلاس میں پڑھی جانے سے پہلے ہی وہ اسلامیہ کالج میں اپنے ریاضی کے استاد خواجہ دل محمد سے نظم کا نام اور اس کا ایک شعر سن چکے تھے۔ اقبال کی رازداری مرزا جلال الدین کے بیان کے علاوہ اس سے بھی ثابت ہے کہ اقبال اس کی کاپیاں پہلے سے چھپوا کر اجلاس میں ساتھ نہیں لائے تھے جو بہت عجیب بات تھی۔ اگر اقبال نے دل محمد کو نظم کے اشعار سنائے بھی تھے تو دل محمد سے بعید ہے کہ جس نظم کے لیے اقبال اتنی پردہ داری کریں یہ اُسے کالج کے لڑکوں میں مشہور کر دیں۔ ممکن ہے اجلاس کے بعد کے دنوں میں دل محمد نے طلبہ کو اشعار سنائے ہوں اور مہرؔ کو غلطی سے اجلاس سے پہلے کے واقعے کے طور پر یاد آئے ہوں۔

۲۱۰۔جن لوگوں نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۱ء کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے اُن کے نام اور جن کتابوں میں اُن کا بیان شامل ہے اُن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

عبداللہ چغتائی: عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں) ص ۷۶-۷۵

اعجاز احمد: اعجاز احمد (۱۹۸۵)

شیخ عبدالقادر: حنیف شاہد (۱۹۷۲)، ص ۱۱۲

غلام رسول مہر: انہوں نے متعدد جگہوں پر لکھا ہے مگر امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) ص ۲۵-۵ غیر مطبوعہ مضمون 'علامہ سے تعارف' اور ص ۱۲۴-۱۱۸ 'شکوۂ اقبال اور جلسۂ انجمن' ان سب کا احاطہ کرتے ہیں۔

خواجہ فیروزالدین: عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) ص ۹۳، انہوں نے صرف اپنی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

حکیم محمد حسن قرشی: ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷)، ص ۲۷۷-۲۷۶

باب ۹: جنت الفردوس

اپریل ۱۹۱۱ء سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک

۱۔ بیاض نمبر 219 میں اس کے نو اشعار موجود ہیں جن میں سے دو کاٹ دیے گئے ہیں۔ اس کے زمانے کا صحیح تعین کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ اُن خالی صفحات میں درج ہے جنہیں طویل اردو نظم کے لیے چھوڑا گیا تھا مگر بعد میں مختلف کاغذوں پر لکھی ہوئی نظمیں بھی ان میں درج کر دی گئیں۔

۲۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۱۰۳ پر ظفر علی خاں کا اعتراض درج ہے۔ اُدت نرائن کے اشعار کا زمانہ معلوم نہیں مگر عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۶۷ میں منشی محمد دین فوق کے مضمون 'ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال' میں درج ہیں۔

۳۔

۴۔ للّی لاج میں ظفر علی خاں کا اعلان رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵) میں خواجہ عبدالوحید کی روایت ہے۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) ص ۹۷ پر علی بخش کی روایت ہے کہ ظفر علی خان کو اقبال نے مشورہ دیا تھا کہ وہ زمیندار کو کرم آباد کی بجائے سے نکالیں۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ چودھری شہاب الدین نے مشورہ دیا تھا۔ ظفر علی خاں کا بیان زمیندار کے یکم مئی ۱۹۱۱ء کے اداریے سے ماخوذ ہے جس کے لیے ہمارا ماخذ ہے نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵) ص ۱۰۰

۵۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء) ص ۱۹۶

۶۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء) ص ۱۹۶۔ اُن کے مطابق یہ واقعہ ۱۹۱۱ء کا ہے۔

۷۔ حامد علی خاں کی روایت۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء) ص ۳۵۴

۸۔ غلام رسول مہر کا غیر مطبوعہ مضمون 'علامہ سے تعارف' مشمولہ امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) ص ۱۰، ۱۱۔

۹۔ جعفر بلوچ (۱۹۹۵) ص ۲۴۔ ان کا ماخذ روزنامہ آفاق ۲ دسمبر ۱۹۵۶ میں حکیم محمد حسن قرشی کی روایت ہے۔

۱۰۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۵۴

۱۱۔ خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱) ص ۶۱ - ۶۰

۱۲۔ مکتوب بنام عطیہ فیضی، ۷ جولائی ۱۹۱۱ء

۱۳۔ یہ نتیجہ میں نے اس طرح نکالا ہے کہ بیاض نمبر 219 میں اُردو مثنوی کے ابتدائی حصے درج کرنے کے بعد (یعنی نورِ محمدی اور قربانیِ خلیل) کچھ عرصے تک اقبال نے اپنی کوئی تازہ نظم اس میں درج نہیں کی، مثلاً شکوہ اور اُس کے تمہیدی قطعے کا نقشِ اول موجود نہیں اور صرف صاف کیا ہوا متن نئی بیاض میں درج ہے۔ یہاں تک کہ اسرارِ خودی کے ابتدائی اشعار کے بارے میں بھی عطیہ فیضی کے نام خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے وہ اشعار اپنی بیاض میں نہیں بلکہ کسی علیحدہ کاغذ پر لکھے تھے۔ چنانچہ

قربانیٔ خلیل والی نظم کے بعد کے صفحے وہ اس خیال سے خالی رکھنا چاہتے ہوں گے کہ اُس میں اُردو نظم مکمل کرلیں (اس سے پہلے بھی بیاض میں بعض طویل نظموں کے لیے اس قسم کا اہتمام نظر آتا ہے)۔

بہرحال، اِن خالی صفحوں کو اُنہوں نے اُسی وقت استعمال کیا ہوگا جب اُردو میں طویل نظم لکھنے کا ارادہ ترک کیا ہوگا۔ چنانچہ قربانیٔ خلیل کے بعد جو سب سے پہلی نظم درج کی گئی ہے وہ اِس فیصلے کے بعد ہی درج کی گئی ہوگی۔ یہ نظم Frl Gottsman ہے (یعنی 'پھول کا تحفہ عطا ہونے پر') جس کے بارے میں اُنہوں نے ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کے خط میں عطیہ فیضی کو لکھا کہ وہ نظم اُن کے پاس موجود نہیں ہے اور اُنہوں نے اپنے دوست امراؤ سنگھ سے منگوائی ہے۔

چنانچہ ۷ جولائی ۱۹۱۱ء تک اقبال کا اردو میں طویل مثنوی لکھنے کا ارادہ برقرار تھا یا کم سے کم اِس مقصد کے لیے چھوڑے ہوئے صفحات بدستور خالی تھے۔ اس کے بعد کسی وقت امراؤ سنگھ یا کسی دوسرے ذریعے سے اُنہیں اپنی نظم کی کاپی ملی ہوگی (یہ نظم جنوری میں رسالہ ادیب میں شائع بھی ہو چکی تھی) اور پھر اقبال نے اِسے بیاض کے اُن خالی صفحات میں نقل کرلیا ہوگا جو اَب تک طویل اُردو نظم کے لیے خالی رکھے ہوئے تھے۔

(ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح کی مثنوی اقبال اُردو میں لکھنا چاہتے تھے وہ بیس بائیس سال بعد 'ساقی نامہ' کی صورت میں لکھی گئی جو بالِ جبریل میں شامل ہے۔)

۱۴۔ جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۲۰۲۔ ان کا حوالہ ہے گفتارِ اقبال، مرتبہ رفیق افضل۔

۱۵۔ یہ غزل بیاض نمبر 219 کے آخری صفحوں میں درج ہے جہاں اس کے زمانے کا تعین نہیں کیا جاسکتا مگر جولائی ۱۹۱۱ء کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ بیاض نمبر 195 میں

سب سے پہلے اسی کے چار اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ غالباً وہاں یادداشت سے نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پوری غزل یاد نہیں آسکی۔

۱۶۔اس نظم کے چار اشعار ترمیم کے ساتھ بانگِ درا میں 'قطعہ' کے عنوان سے درج ہیں۔ بشیر احمد ڈار (۱۹۶۷ء)، ص ۳۱۱-۳۱۰ میں نظم کی پہلی اشاعت کے حوالے سے دو متروک اشعار دیے گئے ہیں۔ اب تک کسی نے اس بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ یہ نظم اکبر الہ آبادی کی نظم کی پیروی میں کہی گئی اور مقطع میں لفظ 'اِن' کا اشارہ اکبر ہی کی طرف ہے:

سنے گا اقبال کون ان کو، وہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں بتا رہے ہیں

۱۷۔مزاحیہ قطعوں میں سے بیاض میں سب سے پہلے وہ درج ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک واعظ سے یہ سن کر کہ مشرک کے ہاتھ سے خریدی ہوئی چیز ناپاک ہوتی ہے ایک شرابی کو فکر ہوئی کہ کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت ایسے قانون کی پابند ہوئی تو شراب کیسے ملے گی۔

میں نے کہا کہ آپ کو مشکل نہیں کوئی
ہندوستاں میں ہیں کلمہ گو بھی مے فروش

یہ قطعہ بانگِ درا میں ظریفانہ حصے میں شامل ہے۔

۱۸۔ جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۱۰۹۔پوری نظم یوں ہے:

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں بساطِ کہنہ و نو ہے
اگر اس کی سلامی کے لیے نواب جھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لو ہے
کئی مسلک کیے ہیں 'لازمی تعلیم' نے پیدا

احد شہ کا کوئی پٹھو، کوئی آغا کا پیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ پچپیں الیکشن کی
بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ کو پڑی پو ہے
حصولِ جاہ و عزت جس وفاداری کا مقصد ہو
وہ جنسِ ناروا گندم نہیں گندم نما جو ہے
نہیں ہے بہرِ اظہارِ وفا لازم نمود اصلاً
کہ بحرِ شعر میں پانی نہیں مطلق مگر رَو ہے
ملے گی تشنہ عزت کو کب اعزاز کی قلفی
مہینا جون کا ہے اور یہ سرگرمِ تگ و دو ہے
مبارک ہے یہ جشنِ تاجپوشی جس کے صدقے میں
وہ مسجد تک چلا آیا، کلب گھر کا جو رہرو ہے
مسلمانوں کی جمعیت اگر کم ہے تو کیا پروا
عدد چھ سو چھیاسٹھ ہوں مگر مفہوم تو سو ہے
نہیں ہوتے ہیں لیڈر ان میں پیدا قابلیت سے
مسلمانوں میں یہ مخلوق مثلِ سبزہ، خودرَو ہے
خوشامد نے جلا ڈالا ہے خودداری کے خرمن کو
ذرا سی شمع ہے کم بخت اور کتنی بڑی لو ہے
ضرورت کچھ نہ کچھ دنیا میں ہے عصمت فروشوں کی
یہ روحانی قدمچہ ہے یہ اخلاقی بدرَو ہے
پرانی روشنی میں دیکھ لو ہے پختگی کیسی
کہ پہلے دن سے مہروماہ میں قائم وہی ضَو ہے

غلام رسول مہر نے سرودِ رفتہ میں لکھا ہے کہ شعر نمبر ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱ اور ۱۳ اظہار اقبال

کے نظر آتے ہیں، باقی ظفر علی خاں کے۔

۱۹۔ بیاض نمبر 195

۲۰۔ مکتوب بنام اکبر الہ آبادی ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱

۲۱۔ روزنامہ ہمدرد ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء میں محمد علی جوہر کا مضمون 'شاعرِ اسلام اقبال'۔ ابوسلمان شاہجہانپوری (۱۹۹۳) ص ۱۰۸-۱۰۷

۲۲۔ مکتوب بنام مولوی کرم الٰہی صوفی۔ یہ خط مخزن میں نومبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔

۲۳۔ نظم میں دو بند تھے جن میں انیس اشعار تھے۔

۲۴۔ عطیہ فیضی کی کتاب 'اقبال' کے آخری حصے میں اُن کی رائے

۲۵۔ بانگ درا میں اس کا عنوان 'حضور رسالت ماب میں' ہے۔ صرف ایک شعر منسوخ ہوا ہے۔

۲۶۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۵۶۔ حکیم محمد یوسف حسن کی روایت محمد طفیل نے نقوش افسانہ نمبر ۱۹۶۸ء میں شائع کی۔

۲۷۔ بزمِ اقبال کے رسالے اقبال، اپریل-جولائی ۱۹۷۷ میں رحیم بخش شاہین کا مضمون 'علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی'۔ اُن کا ماخذ ہے اکبر اِس دَور میں مرتبہ اختر انصاری

۲۸۔ مکتوب بنام اکبر الہ آبادی، ۹ نومبر ۱۹۱۱ء

۲۹۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۲

۳۰۔ مخزن، جنوری ۱۹۱۲ء میں غلام محمد طور بی اے لاہور کا مضمون 'دربارِ تاجپوشی'۔

۳۱۔ عطیہ فیضی کے نام مکتوب ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء میں یہ نظم موجود ہے۔

۳۲۔ عطیہ فیضی کی کتاب *Iqbal* میں یہ نظم اقبال کے ہاتھ سے لکھی ہوئی شامل ہے جس کے حاشیے پر اقبال نے لکھا ہے، "مسز نائیڈو صاحبہ کی خدمت میں سلام کہیے اور اُن کو یہ اشعار دکھائیے۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ مس عطیہ آپ کو دکھائیں گی۔" اُس

کتاب میں اِسے ۱۴ دسمبر والے خط کے بعد رکھا گیا ہے جو اس لحاظ سے غلط ہے کہ ۱۴ دسمبر والے خط میں تو اقبال عطیہ فیضی سے کہہ رہے ہیں کہ اگر اُن کے خیال میں سروجنی نائیڈو اُردو شاعری کا مذاق نہیں رکھتیں تو اشعار اُنہیں نہ دکھائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات عطیہ فیضی نے اِسی نظم کے حاشیے کے جواب میں لکھی ہوگی۔

۴۳۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) میں مرزا جلال الدین کی روایت ہے کہ اس نظم کی بنیاد اُن کے گھر موسیقی کی محفل میں پڑی تھی۔ عطیہ فیضی کو یہ نظم بھیجتے ہوئے اقبال نے اِس پر ۱۴ دسمبر کی تاریخ ڈالی ہے۔

۴۴۔ گیان چند (۱۹۸۷) کا یہ خیال درست نہیں کہ اقبال کا اشارہ 'نوائے غم' کی طرف تھا۔ یہ مغالطہ عطیہ فیضی کی کتاب *Iqbal* کی وجہ سے بہت لوگوں کو ہوا ہے جہاں عطیہ فیضی نے اس نظم کو ۱۴ دسمبر کے خط کے ساتھ رکھ دیا ہے جبکہ خط کے متن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم اُس سے پہلے ارسال کی جا چکی تھی۔ 'نوائے غم' کی بحر مثمن مخبون تھی جس میں اقبال نے بچے کی دعا، ابرِ گہر بار اور شکوہ جیسی مشہور نظمیں اس سے پہلے کہی ہوئی تھیں۔ 'نمودِ صبح' کی بحر رمل مثمن میں بھی ہمالہ، گورستانِ شاہی اور فلسفۂ غم سمیت کئی مشہور نظمیں کہہ چکے تھے۔ صرف 'دعا' کی بحر ایسی ہے جس میں اقبال نے اس سے پہلے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ ہزج مثمن اخرب سالم الآخر (مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن) ہے اور واقعی بہت مترنم ہے۔ اقبال کی نظموں کے اوزان معلوم کرنے کے لیے میں نے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (۱۹۸۳) پر انحصار کیا ہے۔

۴۵۔ ٹیگور کا 'جنا منا گنا' آزادی کے بعد ہندوستان کا قومی ترانہ بنا۔ آزادی سے پہلے ہی اس پر یہ اعتراض ہونے لگا تھا کہ اس میں جسے ہندوستان کی قسمت کا نگہبان کہا جا رہا ہے، کانگریس کے ۱۹۱۱ والے اجلاس کی مناسبت سے وہ انگلستان کا بادشاہ ہے۔ چنانچہ ٹیگور نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ اگرچہ اُن سے بادشاہ کی تعریف میں گیت لکھنے کو کہا گیا تھا مگر اُنہوں نے اپنے گیت میں بادشاہ کی بجائے تقدیر کے دیوتا کو

مخاطب کیا تھا۔

۳۶۔ جلسے کی تفصیلات جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۳-۱۲۱، بریلوی اور عروج سے ماخوذ ہیں۔ ملک الشعرا کے خطاب کا ذکر حنیف شاہد (۱۹۹۷)، ص ۲۱۵ میں موجود ہے۔

۳۷۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۳۷، ۶۶ اور خالد نظیر صوفی (۲۰۰۳)، ص ۱۸۶۔ اعجاز احمد نے لکھا ہے کہ پوری عمارت دوبارہ تعمیر ہوئی چنانچہ آثارِ قدیمہ کا ایک کمرے کو اقبال کی ولادت کا کمرہ قرار دینا غلط ہے۔ خالد نظیر صوفی لکھتے ہیں کہ حویلی کے حصے میں ردّوبدل بہت کم ہوا اور ولادت کا کمرہ اُسی میں شامل ہے۔

۳۸۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۶۶

۳۹۔ بیاض نمبر 219

۴۰۔ نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔ بیاض 219 کے آخری صفحات میں موجود ہے۔

۴۱۔ حسن اختر (۱۹۸۸ء)، ص ۱۲۹

۴۲۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)

۴۳۔ اِس نظم کی پہلی اشاعت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی یہ کسی بیاض میں درج ہے۔ بانگِ درا کی ترتیب کے حوالے سے اِسے اِس زمانے سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

۴۴۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص

۴۵۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید (۱۹۸۶)، ص ۱۷۳۔ خواجہ خورشید انور بعد میں بہت بڑے موسیقار ہوئے۔

۴۶۔ صابر کلوروی (۲۰۰۴ء) نے مخزن جنوری ۱۹۱۲ء کو اس نظم کا ماخذ بتایا ہے مگر مجھے مخزن میں یہ نظم نہیں ملی۔

۴۷۔ ایس ایم اکرام (۱۹۹۴)، ص ۳۵۳

۴۸۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۱۰۹

۴۹۔ Muhammad Siddique (1983)

۵۰۔ Lateef Ahmed Sherwani (1944/1977), p. 118۔ شیروانی نے لکھا ہے کہ اقتباسات صفحہ ۱۶۲ سے شروع ہوتے تھے۔ لیکچر "Muslim Community" تھا۔

۵۱۔ گفتارِ اقبال، ص ۱ تا ۳۔ اُس کا ماخذ ہے اخبار زمیندار ۳، ۴، ۶ فروری ۱۹۱۲ء

۵۲۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۱۰۹

۵۳۔ یہ متن بیاض کے مطابق ہے۔

۵۴۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۲

۵۵۔ گفتارِ اقبال، ص ۳

۵۶۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۲۵۵-۲۵۱ میں اخبار کشمیری کے تراشے کے حوالے سے تقریر کا مفہوم درج ہے۔ "تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایمان و اسلام کی حفاظت (محمڈن یونیورسٹی کی تائید ایک عجیب پیرائے میں) کے عنوان سے کسی غلام محمد امرتسری از لاہور کا فوق کے نام خط ہے جس میں اُنہوں نے اقبال کی تقریر کا مفہوم یادداشت کے حوالے سے درج کیا ہے۔ عبداللہ قریشی نے تراشے کی تاریخ اپریل ۱۹۱۱ درج کی ہے جو صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ ۲۵ فروری کا آغا خاں والا جلسہ جس کا ذکر امرتسری کے خط میں موجود ہے وہ ۱۹۱۲ میں ہوا تھا۔ یہ مراسلہ اپریل ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا ہوگا۔

۵۷۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۹۲

۵۸۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۹۶

۵۹۔ حنیف شاہد (۱۹۹۷)، ص ۱۵۹

۶۰۔ بزمِ اقبال کے رسالے اقبال (اپریل-جولائی ۱۹۷۷) میں رحیم بخش شاہین کا مضمون 'علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی'۔ ان کا ماخذ ہے 'ادبی دنیا' لاہور (اکتوبر

۱۹۶۷) میں محمد عبداللہ قریشی کا مضمون 'معاصر شعرا اقبال کی نظر میں'۔

۶۱۔ نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵)، ص ۲۳۸

۶۲۔ عبدالمجید سالک (۱۹۵۵)، ص ۸۲

۶۳۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۲۵۱

۶۴۔ مجلہ اقبال اپریل - جولائی ۱۹۷۷ میں رحیم بخش شاہین کا مضمون 'علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی'

۶۵۔ عبدالمجید سالک (۱۹۵۵)

۶۶۔ جھنڈے خاں والی روایت عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں) ص ۷۷ پر درج ہے۔ آئینہ ٹوٹنے والی روایت منصور نعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کے بانگِ درا کے نسخے پر غزل کے حاشیے میں لکھی ہوئی تحریر میں نقل ہوئی ہے۔

۶۷۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵-۸۴۔ دوسرے صاحب مولانا غلام رسول مہر تھے۔

۶۸۔ بزمِ اقبال کے رسالے اقبال (اپریل - جولائی ۱۹۷۷) میں رحیم بخش شاہین کا مضمون 'علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی'۔ ان کا ماخذ ہے ادبی دنیا لاہور (اپریل - مئی ۱۹۷۰)

۶۹۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۲

۷۰۔ حمید احمد خان (۱۹۷۴)، ص ۲۴-۲۳

۷۱۔ بیاض میں یہ فارسی کے اشعار اسی زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔

۷۲۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۶۴

۷۳۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵)، ص ۱۱۵-۱۱۴۔ شراب سے اجتناب والی روایت اعجاز احمد کی زبانی جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۴۵

۷۴۔ ابوالکلام آزاد کے حالات زیادہ تر Ian Henderson Douglas (1988) سے لیے گئے ہیں۔

۷۵۔ ۹ اکتوبر کے الہلال کے حوالے سے غلام رسول مہر نے لکھا ہے۔ امجد سلیم علوی (۱۹۸۸)، ص ۱۰۱

۷۶۔ بیاض 210۔ وہاں دس اشعار درج ہیں۔

۷۷۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۴۳۔۷۷، ۴۹

۷۸۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۲۵۸-۲۵۶ میں اخبار کشمیری لاہور ۱۴ جنوری سے لے کر یہ تحریر شامل کی گئی۔ تحریر کے نیچے ابوظفر لکھا ہے جو مضمون نگار کا نام ہوگا۔ تمہید میں ہے کہ اقبال نے گفتگو کے دوران جو معلومات ظاہر کیں ''اُن کا جس قدر حصہ قوتِ حافظہ یاد رکھ سکی وہ دماغ کے خزانے میں آج تک محفوظ چلا آتا ہے،'' جس میں لفظ ''آج تک'' سے لگتا ہے کہ گفتگو کافی مدت پہلے ہوئی ہوگی۔ بشیر احمد ڈار (۱۹۶۷ء)، ص ۲۷۸ میں اخبار کشمیری کے اسی پرچے سے اسے فوق کی تحریر بتا کر تمہید حذف کر کے شامل کیا گیا ہے لیکن اگر ابوظفر فوق ہی کا قلمی نام نہیں ہے تو پھر یہ فوق کی تحریر نہیں ہو سکتی۔

۷۹۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۷۵

۸۰۔ امجد سلیم علی (۱۹۸۸) ص ۱۰۱

۸۱۔ منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں ہے کہ اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان نے اپنے بانگِ درا کے نسخے میں 'جوابِ شکوہ' کے مندرجہ ذیل مصرعے کے حاشیے پر یہ روایت تحریر کی کہ یہ مصرع ''لاہور کے ایک حقیقی واقعہ کی طرف اشارہ ہے'':

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے

۸۲۔ اقبال کی بیاض (219) میں نظم درج ہے۔ بانگِ درا میں ترمیم کے بعد شامل کی گئی۔

۸۳۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں) ص ۹۴۔ طالب علم کا نام قاضی محمد حسین بتایا گیا ہے۔

۸۴۔ رفیع الدین ہاشمی (۱۹۹۴) ص ۶۴-۴۹ میں 'جوابِ شکوہ' کے مطالعے کے لیے اچھا مواد موجود ہے۔

۸۵۔ 'جوابِ شکوہ' بھی اقبال کی دوسری بیاض میں موجود ہے مگر ضروری نہیں کہ یہ نقشِ اول ہو۔ ممکن ہے نظم کا ایک حصہ پہلے کسی دوسرے کاغذ پر لکھا ہو اور وہاں سے اس میں نقل کیا ہو۔ میں نے یہاں بیاض والا متن ہی دیا ہے۔ اس میں "کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں" کے بعد اگلے بند کے چار مصرعے لکھ کر کاٹے گئے ہیں:

یادِ ایامِ سلف فخرِ اب و جد بیکار
مثل تابانیٔ شمعِ سرِ مرقد بیکار
ایک اگر کام ہے تم میں تو یک صد بیکار
دہر کی فرد میں تم ہو صفتِ بد بیکار

۸۶۔ جوابِ شکوہ کے بارے میں نجانے کیوں مشہور ہے کہ ۱۹۱۳ء میں پڑھی گئی۔ میرا ماخذ جعفر بلوچ (۱۹۹۵) ص ۱۷ ہے، جس میں زمیندار کے ۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے سے اس جلسے کی خبر بھی نقل کی گئی ہے۔ حکیم محمد حسن قرشی نے بھی جوابِ شکوہ والے جلسے کا حال لکھا ہے (ابواللیث صدیقی ۱۹۷۷ء ص ۲۷۸) مگر کم عمر تھے۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں) نے ص ۶۷ پر لکھا ہے کہ 'جوابِ شکوہ' کا 'زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں' والا شعر پڑھتے ہوئے اقبال نے معنی خیز نظروں سے حبشیوں جیسی رنگت والے چوہدری شہاب الدین کی طرف دیکھا اور اس کے بعد یہ شعر پڑھا:

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مگر بلالِ حبشیؓ والا شعر تو اس نظم میں نہیں بلکہ 'شکوہ' میں ہے۔ عبداللہ چغتائی کو غلطی لگی ہے سوائے اِس کے کہ اقبال نے 'جوابِ شکوہ' کے دوران 'شکوہ' کے کچھ اشعار پڑھ کر 'جوابِ شکوہ' میں سے اُن کے جوابات سنائے ہوں گے اگرچہ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ شاعر نے اِس طرح نظم کا تسلسل توڑنا گوارا کیا ہوگا۔
دیگر لوگ جو جلسے میں موجود تھے اور اس کا حال بیان کیا ہے اُن میں میاں عطاالرحمٰن شامل ہیں جن کا تذکرہ حنیف شاہد (۱۹۷۷) میں 'اقبالیات کا تنقیدی جائزہ' ص ۲۱-۲۰ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں اُس وقت کم سن تھے۔ انہوں نے اُنہی دنوں کے ایک جلسے کا ذکر کیا ہے جس میں ظفر علی خان بار بار اقبال کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اسٹیج پر لانے کی کوشش کر رہے تھے اور اقبال کو تامل تھا مگر اُن کی ''ہر جنبش کی قیمت کے طور پر جنگِ بلقان کے لیے اچھا خاصا چندہ جمع ہو گیا تھا۔'' حمید احمد خاں کو نظم یاد نہیں رہی مگر اُن کا اندازہ تھا کہ 'جوابِ شکوہ' رہی ہوگی (حمید احمد خان ۱۹۷۴ ص ۲۵-۲۴)۔ منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کی روایت دی گئی ہے۔

۸۷۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص ۹۴۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ جلسہ 'جوابِ شکوہ' کے زمانے میں ہوا۔

۸۸۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۵۴

۸۹۔ ایس ایم اکرام (۱۹۹۴)، ص ۴۰۶ سے ۴۰۸

۹۰۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۲، عبدالروف عروج (۱۹۸۸)

۹۱۔ عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) میں فوق کی تحریر جس سے اقبال نے خود یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ واقعے کا زمانہ معلوم نہیں۔

۹۲۔ ابواللیث صدیقی (۱۹۷۷)، ص ۱۱۹-۱۱۸

۹۳۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۳۸-۳۷ میں ڈاکٹر عاشق بٹالوی کی روایت ہے

کہ اقبال سے سنا۔

۹۴۔تصویر اور بھنگ والی روایات منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں مصنف نے اپنے والد نعیم الرحمان کے حوالے سے بیان کی ہیں۔

۹۵۔اِس ملاقات کے بارے میں مرزا سلطان احمد کے نام ۲۷ جنوری ۱۹۱۳ء کے خط میں اکبرالہ آبادی کے یہی جملے معلوم ہیں۔''ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔صرف چند گھنٹوں کے لیے مجھے ملنے کو الہ آباد تشریف لائے۔''(مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد،ص ۲۹)۔میرا ماخذ مجلّہ اقبال اپریل-جولائی ۱۹۷۷میں رحیم بخش شاہین کا مضمون ہے۔

۹۶۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۷)۔کوئی عبدالحق بی اے ایل ایل بی نومبر ۱۹۰۷ء میں پنجاب مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے تھے اور اقبال نے اپریل ۱۹۰۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کی جس نشست میں لیکچر دیا اُس کے صدر کا نام بھی شیخ عبدالحق تھا جو میونسپل کمیٹی ملتان کے نائب صدر تھے۔تحقیق کی جا سکتی ہے کہ یہ تاریخِ وفات اِن دونوں میں سے کسی کی تو نہیں ہے۔

۹۷۔رفیع الدین ہاشمی نے بازیافت جنوری ۲۰۰۲ میں اپنے مضمون 'علامہ اقبال سے منسوب تاریخِ ہند: چند تصریحات' میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔اُن کی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ میں بھی کتاب پر اعتراض کی تفصیل موجود تھی مگر اُس وقت تک کتاب کا دوسرا نسخہ نہیں دستیاب نہیں ہوا تھا۔

۹۸۔Muhammad Siddiq (1983)

۹۹۔ تحسین فراقی (۱۹۹۷)،ص ۲۰۳-۲۰۲

۱۰۰۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)،ص ۵۳

۱۰۱۔ اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔بانگِ درا کی ترتیب کے لحاظ سے یہاں رکھی گئی

ہے۔

۱۰۲۔ اکبر حیدری (۲۰۰۰) نے لکھا ہے کہ یہ نظم زمیندار میں مارچ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اگر واقعی اگر ایسا ہے تو حکیم یوسف حسن کی وہ روایت محض افسانہ ہے جس کے مطابق ظفر علی خاں گھبرائے ہوئے آئے کہ انگریز دواخانہ کھولنے کے بہانے حجاز پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور اقبال نے بڑے وثوق سے کہا کہ وہ شام تک ایک ایسی نظم لکھ دیں گے جس کے بعد انگریزوں کے منصوبے ناکام ہو جائیں گے۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں ظفر علی خاں ملک میں تھے ہی نہیں۔

۱۰۳۔ صابر کلوروی (۲۰۰۴ء)۔ اُن کا ماخذ تیسری بیاض (214) ہے۔

۱۰۴۔ حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۷۵

۱۰۵۔ جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۱۹۔ ان کا ماخذ ۱۹۵۳ کے زمیندار (جوبلی نمبر) میں عبدالحمید مرزا کا کوئی مضمون ہے۔ عبدالحمید مرزا نے ظفر علی خاں کی جون ۱۹۱۳ کی کسی پھٹے کاغذ والی تحریر سے معلومات لیتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ ظفر علی خاں نے 'فاطمہ بنت عبداللہ' کو نشان کر کے بانگِ درا پیش کی۔ یہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ بانگِ درا ۱۹۲۴ میں شائع ہوئی۔

۱۰۶۔ جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۲۰

۱۰۷۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)۔ مرزا جلال الدین کی روایت ہے۔ نظم 'موٹر' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہے اور پہلا شعر بہت مشہور ہے:

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی

موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کی کیا خموش

منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کی روایت ہے کہ سر ذوالفقار علی خاں کے ڈرائیور کا نام جگندر تھا اور نظم کے پہلے شعر میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۰۸۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال) میں مرزا جلال الدین کی روایت ہے۔

۱۰۹۔ عبداللہ چغتائی (اقبال کی صحبت میں)، ص ۳۰۶۔ بعد میں یہ محمد یعقوب ایک انگریز کے اسٹینو ہوئے اور اقبال کے مشہور لیکچرز *Reconstructions of Religiou Thought in Islam* کے اوّلین مسودوں کو ٹائپ کرنے میں اقبال کی مدد بھی کی۔ اُس وقت مختار بیگم کی وفات کو چار پانچ برس گزر چکے تھے۔ عبداللہ چغتائی نے لکھا ہے کہ اقبال یہ بات نہیں جانتے تھے کہ یہ کبھی مختار بیگم سے منسوب رہ چکے تھے۔

۱۱۰۔ عبداللہ قریشی (۱۹۶۷)، ص ۳۹ پر اقبال کے ایک نوجوان ملاقاتی کرنل صلاح الدین گوہر حزیں کی روایت ہے کہ انہوں نے یہ بات ۱۹۳۵ء میں اقبال سے سنی۔

۱۱۱۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۱۰۱

۱۱۲۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۲

۱۱۳۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۲

۱۱۴۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۲

۱۱۵۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)، ص ۱۱۳، ۱۱۴۔ ظفر علی خاں کا سی آئی ڈی کی نظروں میں آنا نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵) سے ماخوذ ہے۔

۱۱۶۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)، ص ۱۰۶، ۱۰۴، ۱۰۱

۱۱۷۔ حسن نظامی، ہفت روزہ توحید یکم اگست ۱۹۱۳ء۔ میرا ماخذ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء) ص ۱۵ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ خواب کب دیکھا؟ میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۳ء کے موسمِ سرما بلکہ شاید جولائی میں دیکھا ہوگا۔ دو سال پہلے جولائی ۱۹۱۱ء میں مثنوی کے جو اشعار وارد ہوئے تھے اور جو عطیہ فیضی کو لکھ کر بھیجے تھے (نالہ را اندازِ نو ایجاد کن)، وہ اِس خواب سے پہلے کی کوشش ہے جسے ڈیڑھ برس تک اقبال نے ادھورا چھوڑ دیا۔ اگر ۱۹۱۱ء میں ایسا خواب دیکھا ہوتا تو قوی امکان تھا کہ عطیہ سے

خط میں ذکر کردیتے۔

منشی سراج الدین کے نام ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں بھی اقبال نے لکھا کہ مثنوی اسرارِ خودی گزشتہ دو برسوں میں لکھی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی کی باقاعدہ ابتدا ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ باقاعدہ ابتدا خواب ہی سے ہوئی اور اُس رات مثنوی کے جو اشعار وارد ہوئے وہ لکھ کر حسن نظامی کو بھجوا دیے جسے حسن نظامی نے یکم اگست کو 'مثنوی اسرارِ خودی' کے عنوان سے اپنے تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع کردیا اور لکھا کہ یہ پہلی قسط ہے۔

یہ اشعار دو حصوں میں منقسم تھے۔ پہلے حصے کے اشعار بعد میں اسرارِ خودی کے عشقِ رسول والے باب میں شامل ہوئے۔ دوسرے حصے کا عنوان 'خودی' تھا اور اس کے اشعار بعد میں پوری مثنوی میں پھیل گئے۔ بعض اشعار کے مضامین پر علیحدہ ابواب لکھے گئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سینتالیس اشعار اس ترتیب میں اقبال کی کسی بھی بیاض میں درج نہیں ہیں۔ شاید کسی الگ کاغذ پر لکھے گئے ہوں۔ یہاں رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء) سے نقل کیے جاتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبح خندانیم ما
ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
بندۂ سلطان اُو ادنیٰ ستیم
قم باذنی گفت و ما برخاستیم

سرّ مکنونِ دلِ او ما بدیم
نعرهٔ بیباکانه زد افشا شدیم

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او این خس و خاشاک سوخت

چوں گلِ صدبرگ ما را بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

سر شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ قیصر زیرِ پائے امتش

از کلید دیں درِ دُنیا کشاد
ہم چو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد

سینهٔ مسلم تجلّی گاهِ او
طور ہا بالا زگردِ راهِ او

شورِ عشقش در نےِ خاموشِ من
مے تپد صد نغمه در آغوشِ من

پیکرم را آفرید آئینه اش
صبحِ من از آفتابِ سینه اش

من چه گویم از تولائش که چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

در تپیدِ متصل آرامِ من
گرم تر از صبحِ محشر شامِ من

Iqbal Cyber Library.Net All rights reserved. ©2002-2006

ابر آزار است و من بُستانِ اُو
تاکِ من نمناک از بارانِ اُو
چشم در کشتِ محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم

خودی

گر فنا خواہی زخود آزاد شو
گر بقا خواہی بخود آباد شو
از خودی مگذر بقا انجام باش
قطرۂ میباش و بحر آشام باش
چیست مُردن از خودی غافل شدن
تو چہ پنداری فراقِ جان و تن
ہستی و از نیستی ترسیدۂ
اے سرت گردم غلط فہمیدۂ
ہر کہ آقائی نداند چاکری است
مردمی از چاکری بالاترست
الحذر از نانِ چاکر الحذر
رزقِ خویش از دستِ دیگر الحذر
خود فرود آ از شتر مثلِ عمر
الحذر از منتِ غیر الحذر
فطرتِ گو بر فلک بندد نظر
پست میگردد زاحسانِ دِگر
خود زرسمِ داد آزاد آمدی

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

پیشِ قاضی طالبِ داد آمدی
اے گدائے ریزۂ اخوانِ غیر
جنسِ خود میجوئی از دکانِ غیر
غافل از آدابِ فاروقی شدی
زیں سبب منت کشِ قاضی شدی
ایں قدر از خویشتن غافل مشو
بے خبر فاروق تو سائل مشو
ذوقِ استحکام اصلِ زندگیست
یعنی از خودرفتگی بیچارگیست
ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں
میشود فرماں پذیر از دیگراں
چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است
پس زمیں زنجیریِ ایں نیّر است
خویش را دریاب از ایجابِ خویش
سیم شو از بستنِ سیمابِ خویش
چوں خبر دارم زسازِ زندگی
با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورتِ گوہر زدن
پس زخلوت گاہِ خود سر بر زدن
زیرِ خاکستر شرار اندوختن
شعلہ گردیدن نظر ہا سوختن
تا بہ کہ مانندِ گل باشی خموش

همچو بلبل نالہ را ارزاں فروش
فاش گو اسرارِ پیرِ مے فروش

موجِ مے شو کستِ مینا بپوش
در گرہ ہنگامہ داری چو سپند

محملِ خود بر سرِ آتش بند
خندہ را سر منزلِ صد نالہ ساز

اشکِ خونی را جگر پرکالہ ساز
نالہ را اندازِ نَو ایجاد کن

بزم را از ہاؤ ہو آباد کن
آتش استی بزمِ عالم بر فروز

دیگراں را ہم زسوزِ خود بسوز
اے کہ مضرابِ انا داری بدست

ایں چنیں غافل نمی باشد نشست
نسخۂ پیدا کن از تارِ حیات

آشکارا ساز اسرارِ حیات
سوزِ مضموں دفترِ منصور سوخت

جلوہ رقصید و مطاعِ طور سوخت
رفت از تن روحِ گردوں تازِ اُو

از اجل بیگانہ ماند آوازِ اُو
نعرہ اش در لب چو گویائی ندید

سربروں از قطرۂ خونش کشید

۱۱۸۔ یہ یکم اگست ۱۹۱۳ء کو ہفت روزہ توحید میں چھپنے والے اشعار کے نعتیہ حصے کا

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

خلاصہ ہے۔اشعار پچھلے حاشیے میں دیکھیے۔

۱۱۹۔ یہ یکم اگست ۱۹۱۳ء کو ہفت روزہ توحید میں شائع ہونے والے اشعار کے خودی والے حصے کا خلاصہ ہے۔اصل اشعار اوپر نوٹ میں درج ہیں۔

۱۲۰۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی آمد کا ذکر حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۲ سے ماخوذ ہے۔اجلاس کا حال اور اقبال کی تقریر اخبار کشمیری لاہور ۲۸ جولائی ۱۹۱۳ سے عبداللہ قریشی (۱۹۸۸) ص ۲۶۰-۲۵۹ میں شامل ہے۔

۱۲۱۔رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)، ص ۱۲

۱۲۲۔مہاراجہ کشن پرشاد کی آمد کا ذکر حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۵۲ سے ماخوذ ہے۔نیز جاوید اقبال (۱۹۸۱)، ص ۲۳۶ جن کا ماخذ صحیفہ اقبال نمبر (حصہ اول) ہے۔

۱۲۳۔عبداللہ قریشی (۱۹۸۸)، ص ۲۶۰-۲۵۹

۱۲۴۔ اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔بانگِ درا میں قریباً اسی زمانے کی نظموں میں شامل ہے۔

۱۲۵۔نظیر حسنین زیدی (۱۹۸۵) سے ماخوذ ہے۔واقعے کی تاریخ یا مہینہ نہیں لکھا۔

۱۲۶۔سردار بیگم کے بھائی خواجہ عبدالغنی کے دوست شمس الدین کا بیان ہے کہ نبی بخش وکیل خود سردار بیگم سے شادی کرنا چاہتا تھا جبکہ دوسری روایات میں ہے کہ وہ سردار بیگم سے اپنے بیٹے کا رشتہ کرنا چاہتا تھا۔

۱۲۷۔ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)، ص ۱۲۵، ۱۲۶

۱۲۸۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء)، ص ۱۶-۱۵

۱۲۹۔ یہ پوری روایت فقیر وحیدالدین (۱۹۵۳ء)، ص ۱۷۱-۱۶۹ میں درج ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔اگر عبداللہ نے اشعار یاد رکھنے میں غلطی نہیں کی تو پھر یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ بعد میں اقبال نے آخری شعر رسول اللہ کی شان میں منتقل کر دیا اور اس سے پہلے کے اشعار تلف کر کے حضرت علیؓ کے نام

کے اسرار میں ایک الگ باب لکھا۔

۱۳۰۔ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)،ص۱۶۲۔مرزا جلال الدین کی روایت ہے۔ اقبال کا انگریزی فقرہ انہوں نے یوں بتایا ہے: "I am perfectly satisfied. I am in heaven."

۱۳۱۔خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱)ص ۶۹-۶۷

۱۳۲۔اقبال کی چھوٹی بہن کریم بی بی کی زندہ دلی کی تعریف ڈورس احمد نے بھی کی ہے جو آخری زمانے میں اقبال کے بچوں کی گورنس تھیں۔ان کے مطابق کریم بی بی اپنی چھوٹی بہن زینب بی بی کو اُن کے مذہبی رجحانات کی وجہ سے ''مولوی صاحب'' کہتی تھیں۔خالد نظیر صوفی (۲۰۰۳) نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد لڑکیوں کے کسی اسکول میں یومِ اقبال پر کریم بی بی کو بلایا گیا اور وہ وہاں وقت پر پہنچ گئیں تو پرنسپل صاحبہ جنہوں نے اُن کے باقاعدہ استقبال کا پروگرام بنایا ہوا تھا، برا مان کر کہنے لگیں کہ ایسی تقریبات میں سب دیر سے پہنچتے ہیں۔کریم بی بی نے جواب دیا، آپ لوگ میرے بھائی کے نقشِ قدم پر خوب چل رہی ہیں مگر وہ تو اقبال تھے اس لیے ہمیشہ دیر سے آتے تھے آپ کیوں دیر سے آتی ہیں؟

۱۳۳۔ عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷)ص ۱۲۵، ۱۲۶

۱۳۴۔ اعجاز احمد (۱۹۸۵ء)۔یہ معلوم نہیں کہ تکلیف کا آغاز کب ہوا مگر ۱۹۱۴ء میں اسی بیماری سے معراج بیگم فوت ہوئیں۔

۱۳۵۔ حجام والی روایت سالک (۱۹۵۵)ص ۸۴-۸۳ سے لی گئی ہے۔یہ عبداللہ چغتائی (روایاتِ اقبال)،ص ۱۴۱ میں مرزا جلال الدین سے ذرا مختلف بیان ہوئی ہے کہ ذوالفقار علی خاں نے چٹھی لکھ کر دی اور ایک ہزار روپے تنخواہ ٹھہری۔اقبال دہلی سے آگے ایک ڈاک بنگلے میں اُترے، وہیں منشی طاہر دین کی حجام سے گفتگو ہوئی اور جب منشی نے اقبال کو بتایا تو یہ وہیں سے واپس پلٹ کر چوتھے دن لاہور پہنچ گئے۔ہجو شیخ

اعجاز احمد کی بیاض سے فقیر وحید الدین (۱۹۵۰، ۱۹۶۳) میں نقل ہوئی ہے:

گر فلک در الور اندازد ترا
اے کہ می داری تمیزِ خوب و زشت
گوئمت در مصرعۂ برجستۂ
آنکہ بر قرطاسِ دل باید نوشت
آدمیت در زمینِ او مجو
آسماں ایں دانہ در الور نکشت
کشت اگر ز آب و ہوا خر رستہ است
زانکہ خاکش را خرے آمد سرشت

۱۳۶۔ تیسری بیاض (214) میں اس نظم کے سترہ اشعار درج ہیں جن میں سے بعض کاٹے گئے ہیں اور اکثر مصرعے دوبارہ لکھے گئے ہیں یا ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ عنوان کی بجائے جلی قلم سے "۱۹۱۳ء" لکھا ہے چنانچہ منصور زعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) میں اقبال کے شاگرد نعیم الرحمان کی یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کہ یہ نظم 'شمع اور شاعر' والے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ وہ جلسہ ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا۔ نعیم الرحمان کی روایت یہ ہے: "یہ نظم 'شمع اور شاعر' والی نظم کے دوسرے روز سہ پہر کے جلسے میں سنائی تھی۔ آخری دو شعر شاعر نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔ آخر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آخری شعر پڑھتے پڑھتے آواز بگڑ گئی اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے اور آخری دو لفظ ادا کرتے کرتے بالکل بیہوش ہو کر کرسی میں گر گئے۔ سر ذوالفقار علی خان صدرِ مجلس تھے۔ اُنہوں نے سنبھالا اور ہوش میں لا کر اپنی موٹر کار میں بٹھا کر مکان لے گئے۔ جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ کم از کم ایک صد آدمی چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ جلسہ بھر کا حال تباہ تر تھا۔"

۱۳۷۔ شعر صابر کلوروی (۲۰۰۴ء) سے لیا گیا ہے۔ ان کا ماخذ بیاضِ اعجاز ہے۔

پورے قطعے میں سات اشعار ہیں۔

۱۳۸۔ مکتوب بنام کشن پرشاد یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء۔نیز رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵)۔

۱۳۹۔ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۵ء)، ص ۲۳

۱۴۰۔یہ خیالات اسرارِ خودی سے ماخوذ ہیں۔

۱۴۱۔ صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول، اکتوبر ۱۹۷۳، ص ۱۹۸-۱۹۷

۱۴۲۔ حسن اختر (۱۹۸۸ء) ص ۹۴۔

۱۴۳۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۴)، ص ۵۴، پروفیسر عبدالحمید کی روایت۔

۱۴۴۔Stanley Wolpert, p. 35-6

۱۴۵۔یہ خطوط پھر کبھی دستیاب نہ ہو سکے البتہ ان کی نقل ۱۹۸۴ء میں سعید اختر درّانی کی کوشش سے سامنے آئی۔

کتابیں

کتبِ اقبال

The Development of Metaphysics in Persia (1908).

Bazm-i-Iqbal (1964) Lahore.

اقبال کی وہ تحریریں جو دوسروں نے مرتب کیں

اکبر حیدری، ڈاکٹر۔۲۰۰۱۔ کلامِ اقبال (نادر و نایاب رسالوں کے آئینے میں)۔جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز سری نگر

عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی۔۱۹۶۳۔مقالاتِ اقبال۔آئینۂ ادب (۱۹۸۸)۔ لاہور

گیان چند، ڈاکٹر۔۱۹۸۸۔ ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال۔ شائستہ پبلشنگ ہاؤس۔کراچی

مظفر حسین برنی۔۱۹۹۲۔ کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)۔اُردو اکادمی۔ دہلی

محمد عبداللہ قریشی۔۱۹۸۷۔حیاتِ جاوداں۔بزمِ اقبال۔لاہور

محمد رفیق افضل۔۱۹۶۹ء۔ گفتارِ اقبال۔ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب (۱۹۸۶ء)۔لاہور۔

B. A. Dar, 1967. *Letters And Writings Of Iqbal*. Iqbal Academy Pakistan Lahore

Latif Ahmed Sherwani, 1944/1995. *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*. Iqbal Academy

Pakistan, Lahore (1995)

دیگر کتابیں

ابوسلمان شاہجہان پوری ۔۱۹۹۳۔ علامہ اقبال اور مولانا محمد علی ۔ مکتبہ شاہد۔ کراچی

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی ۔۱۹۸۳۔ اوزانِ اقبال ۔شیخ غلام علی اینڈ سنز ۔لاہور

ابو اللیث صدیقی ۔۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال ۔اقبال اکادمی پاکستان ۔لاہور

احمد سعید۔۱۹۸۱ء۔ قائداعظم مسلم پریس کی نظر میں ۔قائداعظم اکادمی، کراچی۔

اعجاز احمد۔۱۹۸۵۔ مظلوم اقبال ۔اعجاز احمد۔ کراچی

الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)، سیّد اور پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے (مرتبین) ۔۱۹۷۰۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۔ کراچی

امجد سلیم علوی (مرتب)۔۱۹۸۸۔ اقبالیات از غلام رسول مہر۔

ایس ایم اکرام۔ یادگارِ شبلی ۔ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (۱۹۹۴)۔لاہور

بشیر احمد ڈار۔۱۹۶۷ء۔ انوارِ اقبال ۔اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور (۱۹۷۷ء)۔

تحسین فراقی ۔۱۹۹۲۔ نقدِ اقبال حیاتِ اقبال میں ۔بزمِ اقبال ۔لاہور

تحسین فراقی ۔۱۹۹۷۔ اقبال، چند نئے مباحث ۔اقبال اکادمی پاکستان (۲۰۰۳)۔لاہور

حسن اختر، ڈاکٹر ملک ۔۱۹۸۸۔ اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ ۔یونیورسل بکس ۔لاہور

حمید احمد خاں، پروفیسر ۔۱۹۷۴۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری ۔بزمِ اقبال (۱۹۸۳ء)۔لاہور

حنیف شاہد، محمد ۔۱۹۷۶۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام ۔ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام ۔ لاہور

حنیف شاہد، محمد ۔ جون ۱۹۷۷۔ اقبال اور پنجاب کونسل ۔ مکتبۂ زریں ۔ لاہور

حنیف شاہد، محمد ۔ ۱۹۹۷۔ مفکرِ پاکستان ۔ سنگ میل ۔ لاہور

رحیم بخش شاہین ۔ ۱۹۷۵۔ اوراقِ گم گشتہ ۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ ۔ لاہور

رفیع الدین ہاشمی ۔ ۱۹۹۳۔ اقبال کی طویل نظمیں ۔ سنگِ میل پبلی کیشنز ۔ لاہور

رفیع الدین ہاشمی ۔ ۱۹۸۲۔ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ۔ اقبال اکادمی پاکستان (۲۰۰۱) ۔ لاہور

خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱)۔ اقبال درونِ خانہ ۔ بزمِ اقبال (۱۹۸۳) ۔ لاہور

خالد نظیر صوفی (۲۰۰۳)۔ اقبال درونِ خانہ (جلد دوم) ۔ اقبال اکادمی پاکستان ۔ لاہور

سعید اختر درّانی ۔ ۱۹۸۵۔ اقبال یورپ میں ۔ اقبال اکادمی ۔ لاہور

سعید اختر درّانی ۔ ۱۹۹۵۔ نوادرِ اقبال یورپ میں ۔ اقبال اکادمی ۔ لاہور

محمود حسین، ڈاکٹر سید ۔ ۱۹۸۲ء۔ اقبال کی ابتدائی زندگی ۔ اقبال اکادمی پاکستان ۔ لاہور

منصور نعیم الرحمان (غیر مطبوعہ) ۔ پروفیسر محمد نعیم الرحمان کی سوانح حیات ۔ (اقبال کے متعلق حصے اقبال اکادمی پاکستان نے مراسلہ ایف ۱-۶/۲۰۰۵/۹۰۸ کے ذریعے فراہم کیے)

شاہد حسین رزاقی ۔ ۱۹۰۷۔ سید امیر علی ۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

ثیما مجید ۔ ۱۹۹۰۔ نفائسِ اقبال از سید عابد علی عابد ۔ اقبال اکادمی

پاکستان۔لاہور

صہبا لکھنوی۔۱۹۷۳۔ اقبال اور بھوپال ۔اقبال اکادمی پاکستان (۲۰۰۰)۔
لاہور

عبدالروف عروج۔۱۹۸۸۔رجالِ اقبال۔نفیس اکیڈمی۔کراچی

عبدالقادر، شیخ۔۱۹۲۴۔'دیباچہ' بانگِ درا ۔شیخ غلام علی اینڈ سنز (۱۹۷۳)۔
لاہور

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد۔۱۹۷۷۔ روایاتِ اقبال ۔اقبال اکادمی
پاکستان (۱۹۸۹)۔لاہور

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر محمد۔۱۹۷۷۔ اقبال کی صحبت میں ۔اقبال اکادمی
پاکستان۔لاہور

عبداللہ قریشی۔۱۹۸۲۔حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں ۔بزمِ اقبال۔
لاہور

عبداللہ قریشی (مرتب)۔۱۹۸۸۔ تذکارِ اقبال از منشی محمد الدین
فوق۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالمجید سالک۔۱۹۵۵۔ذکرِ اقبال۔بزمِ اقبال۔لاہور

عبدالمجید سالک۔۱۹۵۴۔سرگزشت ۔الفیصل ناشران وتاجرانِ
کتب (۱۹۹۳)۔لاہور

عطیہ فیضی (۱۹۴۷)اقبال ۔مترجم ضیاالدین برنی۔اقبال اکادمی پاکستان
(۱۹۸۱)۔لاہور

غلام دستگیر رشید۔۱۹۴۴۔ آثارِ اقبال۔ادارۂ اشاعتِ اردو، حیدرآباد دکن۔

فقیر سیّد وحید الدین۔۱۹۵۰،۱۹۶۳۔ روزگارِ فقیر (جلد اوّل)۔آتش
فشاں پبلی کیشنز (۱۹۸۸)۔لاہور

فقیر سید وحید الدین۔ روزگارِ فقیر (جلد دوم)۔آتش فشاں پبلی کیشنز (۱۹۸۸)۔لاہور

محمد حنیف شاہد۔۱۹۷۲۔نذرِ اقبال، سر عبدالقادر کے مضامین، مقالات، مقدمات اور مکاتیب کا مجموعہ۔بزمِ اقبال۔لاہور

نذیر نیازی، سیّد۔۱۹۷۹۔دانائے راز۔اقبال اکادمی پاکستان (۱۹۸۸)۔لاہور

نذیر نیازی، سیّد۔۱۹۷۱۔اقبال کے حضور۔اقبال اکادمی (۲۰۰۰)۔کراچی

نظیر حسنین زیدی۔۱۹۸۵۔مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی۔مکتبۂ اسلوب۔کراچی۔

Muhammad Siddique: *Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library*. Iqbal Academy, Lahore

Raheem Bakhsh Shaheen. *Mementos of Iqbal*. All-Pakistan Islamic Education Congress

Jahan Ara Shahnawaz (1971). *Father And Daughter: A Political Biography*. Oxford University Press (2002), Karachi

جرائد

اقبال (بزمِ اقبال لاہور) اکتوبر ۱۹۵۷: غلام بھیک نیرنگ۔اقبال کے بعض حالات

صحیفہ (اقبال نمبر حصہ اول)، اکتوبر ۱۹۷۳

بازیافت (شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور)، جنوری ۲۰۰۲

Dawn: April 21, 1952 (Attiya Faizi: When soft music confused Iqbal)

Dawn: April 30, 1967 (Attiya Faizi: Iqbal, a reflection)

The End------------------------اختتام